# معاشیات ہند

انٹرمیڈیٹ

کیلئے

سلسلہ نصابات علمیہ جامعہ عثمانیہ

# معاشیات ہند

(پرمتھ ناتھ بنرجی صاحب کی کتاب انڈین اکنامکس کا اردو ترجمہ)

انٹرمیڈیٹ کے لئے

مترجمہ

مولوی محمد الیاس صاحب بی ایم۔اے۔ال۔ال۔بی (علیگ)

(سابق پروفیسر اکنامکس علیگڈھ کالج)

رکن سر رشتہ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ



سنہ ۱۳۴۲ھ م سنہ ۱۳۳۳ف م سنہ ۱۹۲۴ع

طبع ثانی

دار الطبع جامعہ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

# تمہید منجانب مترجم

مسٹر پرمتھناتھ بنرجی نے اپنی اس مختصر کتاب میں بہت سی ضروری اور کار آمد معلومات جمع کر دی ہیں۔ نفس مضمون میں صحت کا خاص لحاظ رکھا ہے۔ افراط تفریط سے احتراز کیا ہے۔ بیان بھی سلیس اور سادہ ہے۔ اور مباحث کی ترتیب سے کتاب میں ایک علمی رنگ جھلکتا ہے۔ اس مضمون کی دوسری مروجہ کتابوں میں یہ خوبیاں کم نظر آتی ہیں۔ ہندوستانی معاشیات کی ابتدائی کتاب کا یہ بہت اچھا نمونہ ہے۔

بعض دیگر علوم کی طرح معاشیات کے بھی دو شعبے ہیں۔ اصول اور عمل۔ اول معاشی قوانین اور مسائل ذہن نشین کر لینا بعدہٗ اُن کے ذریعے سے معاشی حالات واقعات کی تشریح و توجیہ کرنا۔ خصوصاً بعض مباحث مثلاً زر۔ بنک۔ مالیات دمبادلات خارجہ وغیرہ اس قدر تخصیص طلب اور اصطلاح آمیز ہیں کہ اوّلاً جداگانہ طور پر اصول سمجھے بغیر اُن کی عملی بحث سمجھنا دشوار بلکہ محال ہے۔ چنانچہ اس کتاب میں بھی یہی کیفیت نظر آتی ہے۔ بیشتر حصہ تو بہت صاف اور عام فہم ہے لیکن جہاں جہاں یہ مباحث آ گئے ہیں۔ مضمون عجیب اور عبارت النو کھی معلوم ہوتی ہے۔ خصوصاً جہاں کسی مسئلے کے لب لباب پر اکتفا کیا ہے وہ ایک معما بن کے رہ گیا ہے۔ البتہ جو لوگ اصول سمجھے ہوئے ہیں اُن کے واسطے اسقدر اشارہ کنایہ کافی ہے۔

علاوہ بریں اس کتاب میں کچھ باتیں ایسی بھی آ گئی ہیں جو مبتدیوں کی سمجھ سے باہر ہیں۔ بالخصوص بعض طویل اور پیچیدہ مباحث کے خلاصے

جن کی عبارت بھی لامحالہ ٹھیٹ اصطلاحی ہے۔ یہ مقامات مبتدیوں اور عام ناظرین کے واسطے مقصود نہیں معلوم ہوتے۔ جو لوگ باقاعدہ معاشی اصول مطالعہ کرتے ہوں وہی بجا طور پر اُن کے مخاطب ہو سکتے ہیں۔

جہاں تک ہو سکا کتاب کا ترجمہ صاف اور سلیس رکھا۔ تاہم بوجوہات معلومہ بعض مقامات عام فہم نہیں۔ اور یہ ایک ایسی دقت ہے کہ کم از کم ترجمے میں اس کا رفع کرنا دشوار ہے۔ بہرحال اس کتاب میں ہندوستان کے معاشی حالات کا ایک خاکہ پیش نظر ہو جاتا ہے۔ اسکے مطالعے سے ملک میں معاشی حالات دریافت کرنے کا شوق پیدا ہوا تو اور اچھی اچھی جامع اور مستند کتابیں شائع ہونگی۔ انشاء اللہ تعالےٰ۔

جامعۂ عثمانیہ۔
حیدرآباد دکن

**الیاس برنی**

# فہرست مضامین

## پہلا باب

### مقدمہ



## دوسرا باب

### قدرتی نواح



## تیسرا باب

### نظم معاشرت



## چوتھا باب

### نظم معاشرت

## پانچواں باب

### پیدائش دولت



## چھٹا باب

### زراعت



## ساتواں باب

### معدنیات



## آٹھواں باب

### مصنوعات

## نواں باب

### تقسیم دولت



## دسواں باب

### مبادلۂ دولت



## گیارھواں باب

### زر



## بارھواں باب

### صرفِ دولت

## تیرھواں باب

### مالیات



## چودھواں باب

### حکومت و معاشیات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# پہلا باب

## مقدمہ

ہندوستان کے معاشیات پڑھنے میں متعلم کو طرح طرح کی دقتیں پیش آتی ہیں۔ بہتر ہے کہ پہلے ان کو مختصراً بیان کردیں۔

سب سے پہلی اور بڑی دقت تو عام معاشیات کے اصولوں کو ہندوستان کے معاشیات پر منطبق کرنے میں پیش آتی ہے کسی زمانے میں معاشیات کے اصولوں کا انطباق عام مانا جاتا تھا۔ اور معاشی حقائق کو حقائق طبعیات کی طرح اعم و مطلق سمجھتے تھے۔ لیکن بعض معاشئین نے پہلے ہی اس علم کا محدود ہونا محسوس کرلیا۔ بجٹ صاحب نے تو یہاں تک کہدیا کہ انگریزی معاشیات کے اصول و مسائل انگلستان سے باہر کچھ تعلق نہیں رکھتے یعنی دوسرے ملکوں پر منطبق نہیں ہوسکتے۔ انگریزی معاشیات کی بابت ان کا قول تھا اور بالکل بجا تھا۔ کہ یہ علم ایسے کاروبار سے بحث کرتا ہے۔ جو بڑی بڑی تجارت پیشہ اور کمائو قوموں میں جاری ہے۔

مغرب میں جس معاشیات کی تعلیم جاری ہے وہ درحقیقت چند دانستہ یا نادانستہ مفروضات پر مبنی ہے۔ جب ہم نے ان مفروضات کو جانچا تو معلوم ہوا کہ ان میں سے بہت سے وہ ہیں جو ہندوستان پر بہت کم منطبق ہوتے ہیں چنانچہ جسٹس راناڈے آنجہانی نے اپنی کتاب موسومہ "مضامین معاشیات ہند" میں عام معاشی مفروضات کے لحاظ سے ہندوستان کی حالت کا یوں خاکہ

کھینچا ہے۔ فرماتے ہیں کہ "ہمارے ہاں عام لوگ خیالات و عادات کے لحاظ سے معاشی انسان کے بہت کچھ برعکس نظر آتے ہیں۔ افراد کی حیثیت اور رتبے پر انکی ذاتی کوشش اور قابلیت کا اتنا اثر نہیں پڑتا جتنا ان کے خاندان اور ذات پات کا حصول دولت کی شکل میں ذاتی منفعت کی خواہش ضرور رہتی ہے لیکن لوگوں کے واسطے یہ کوئی بہت خاص اور نرالی محرک خواہش نہیں۔ دولت سمیٹنا ہی تو انسان کا مقصد نہیں ہوتا۔ بلکہ اور خواہشیں بھی اس کو بہت کچھ عزیز ہوتی ہیں اور ان کا بہت کچھ اثر پڑتا ہے۔ آزاد اور غیر محدود مسابقت کی نہ تو کچھ خواہش ہے نہ سلیقہ۔ البتہ پہلے سے قدیم زمانہ کے بنے بنائے چھوٹے چھوٹے فرقوں اور جماعتوں میں کچھ یوں ہی سی مسابقت جاری رہتی ہے رسم و رواج اور قوانین سلطنت کا بمقابل مسابقت کہیں زیادہ اثر پھیلا ہوا ہے اور خاندانی حیثیت ذاتی معاہدے پر غالب رہتی ہے نہ تو اصل اور نہ محنت ہی اس قدر اولو العزمی اور تیز فہمی رکھتی ہے کہ جہاں موقع دیکھے وہیں جا رہے اجرت اور منافع مقرر سا رہتا ہے۔ حالات بدلنے سے ان پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ اس میں کچھ گھٹ بڑھ نہیں ہوتی۔ آبادی کا وہی قانون ہے کہ امراض اور قحطوں سے اس میں تخفیف ہوتی رہتی ہے۔ پیداوار محدود ہے۔ ایک سال فصل اچھی ہوئی تو اس سے دوسرے سال بُری فصل کی تلافی ہو گئی۔ اچھے اور بُرے موسموں کا ایک دور بندھا رہتا ہے جب سوسائٹی کی یہ حالت ہو تو جو رجحانات بالکل حقیقی تسلیم کئے جاتے ہیں نہ صرف بے کار ہیں بلکہ اپنے راستے سے ہٹے ہوئے نظر آتے ہیں ایسے معاشی رجحانات کو ہندوستان میں کارگر سمجھنا تو اسی قدر صحیح ہے جیسے کوئی پہاڑ کے ڈھل ڈھل کر سمندر میں بہنے یا گھاٹیوں کے بھرنے یا سورج کے سرد ہونے کے رجحان کو اس طرح بیان کرے کہ گویا ہمارے کاروبار زندگی پر ان کا اثر پڑ رہا ہے" راناڈے صاحب نے یہ جو کچھ لکھا اگرچہ اس کو ایک چوتھائی صدی گزر گئی۔ اور اکثر حالات میں بہت کچھ تغیر و تبدل ہوا۔ لیکن پھر بھی انھوں نے جو حالت بیان کی ہے اب تک ایک حد تک موجود ہے۔ جب ملک کی حالت اس قدر مختلف ہو تو پھر مغرب کے معاشی خیالات کو جوں کا توں قبول کرنا اور ضروری ترمیم اور اصلاح کے بغیر

ان کو ہندوستان کے معاملات پر منطبق کرنا کہاں تک درست اور جائز ہو سکتا ہے
لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ گو عام معاشیات کے نتائج ہندوستان کے تمام حالات پر منطبق نہ ہو سکیں تاہم معاشی رجحانات فی نفسہ حقیقی ہیں۔ اور کم و بیش ہر جگہ عمل پیرا ہیں۔ انسانی فطرت خاص خاص لحاظ سے دنیا بھر میں یکساں ہے۔ وہی اسباب خاص حالات کے تحت میں ہر جگہ یکساں اثر پیدا کرتے ہیں۔ چونکہ ہندوستان کی حالت بیشتر مغرب کی سی ہوتی جاتی ہے۔ مغربی معاشی اصول و مسائل بھی ہندوستان کے معاملات پر زیادہ زیادہ منطبق ہونے لگے ہیں۔ علاوہ بریں آج کل کی دنیا کے معاملات اس طرح آپس میں جکڑے ہوئے ہیں کہ ممکن نہیں کسی ایک ملک کے معاملات دوسرے ملکوں کے حالات سے جدا کرکے تنہا مطالعہ کر سکیں۔ پس اس سے کچھ فائدہ نہیں کہ عام معاشیات کے اصول و مسائل کو ہم محض بیکار سمجھ کر نظر انداز کر دیں۔ بلکہ ضرورت یہ ہے، کہ انھیں اصول و مسائل کو بمقتضائے فرق حالات ترمیم کرکے ہندوستان کے معاملات پر منطبق کریں ہندوستان کے معاشی معاملات کو جداگانہ طور پر مطالعہ کرنا ضرور ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی غور کرنا چاہیئے کہ بیرونی معاشی معاملات سے ان کا کیا کیا تعلق ہے اور کہاں تک ان پر دارومدار ہے۔

ہندوستان کے معاشی مظاہر کی پیچیدگی۔

دوسری دقت کا باعث یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان کی معاشی حالت میں انقلاب ہو رہا ہے قدیم عادتوں اور رواجوں پر مغربی خیالات کا رنگ چڑھ رہا ہے نئے نئے حالات پیدا ہو کر لوگوں کی معاشرت اور معاشی زندگی میں تغیر و تبدل کر رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت ہر طرف قدیم و جدید تہذیب کی باہمی کشمکش نظر آتی ہے۔ مغربی تہذیب کا اثر تمام ملک پر یکساں نہیں پھیلا۔ چنانچہ کہیں ہندوستان صنعتی بن گیا ہے تو کہیں اب تک زراعتی ہی چلا جاتا ہے یوں تو ہر جگہ معاشی معاملات پیچ در پیچ ہوتے ہیں لیکن اس انقلاب نے ہندوستان کے حل طلب معاشی معاملات میں اور بھی پیچیدگی بڑھا رکھی ہے۔

مستند معلومات کی قلت۔

متعلم کو ایک دقت یہ بھی پیش آتی ہے کہ مستند معلومات نایاب ہے۔

باب ۱

معاشی معاملات کی تدوین و تنقیح کا کوئی اپنا انتظام نہیں جو کچھ سرکاری محکموں کی نیلی کتابوں اور کیفیتوں میں درج ہوتا ہے بس وہی ہمارا ماخذ معلومات ہے حالانکہ ایسی معلومات ہرگز معتبر نہیں ہو سکتیں وجہ یہ ہے کہ اول تو سرکار جن ذرائع سے اعداد و شمار حاصل کرتی ہے وہ قابل اعتماد نہیں، دوسرے جس طریق سے وہ پیش کیے جاتے ہیں وہ بھی اکثر قابل اطمینان نہیں ہوتا۔ اعداد و شمار جو سرکار کی طرف سے شائع ہوں انکے سمجھنے اور برتنے میں بہت احتیاط درکار ہے ورنہ سخت اندیشہ ہے کہ متعلم غلط و بے بنیاد تعمیموں اور نتائج کے جال میں پھنس جائے گا۔

ذاتی خیالات

اس مضمون کے صحیح مطالعہ میں کبھی کبھی ذاتی خیالات بھی سد راہ بنجاتے ہیں مطالعہ سے پورا فائدہ اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جبکہ معاشی معاملات کی تحقیقات میں پسند و ناپسند کو قطعاً نظر انداز کرکے اصل حقیقت دریافت کرنے کی کوشش کیجائے بدقسمتی سے ہندوستان کی کچھ ایسی حالت ہو رہی ہے کہ معاشی معاملات سے جو کوئی بحث کرتا ہے ذاتی خیالات و جذبات کے زور میں آکر کسی ایک نہ ایک فریق کا طرفدار بن جاتا ہے اس لیئے پوری حقیقت سمجھنی اور ماننی دشوار ہو جاتی ہے۔

یہی وجوہات ہیں جن کی بدولت ہندوستان میں اب تک معاشیات پر بہت کم توجہ کی گئی۔ نتیجہ یہ ہے کہ اگرچہ بہت سے قابل لوگوں نے ہندوستان کے معاشی معاملات کی تفصیلیں پیش کی ہیں لیکن ایسے بہت کم ہیں جنھوں نے معاشی اصول سمجھے ہوں یا اصول و قوانین کی رو سے ہندوستان کے معاشی معاملات کی توجیہ کی ہو کیسے افسوس کی بات ہے کہ ایسے اہم اور ضروری مضمون کو اب تک علمی ذوق شوق کے ساتھ مطالعہ نہیں کیا جسٹس رانا ڈے آنجہانی نے اپنی فہم و ذکاوت وسیع معلومات اور عمیق نظر سے کام لے کر اس مضمون کا مطالعہ کیا اور ان کی تحقیقات کا نتیجہ مطبوعہ مضامین اور تقریرات کی شکل میں اب تک عوام کے سامنے موجود ہے لیکن سچ پوچھیئے تو آں جہانی سے جسقدر امیدیں اور توقعات تھیں انکے مقابل یہ معاشی تحقیقات ایک نمونے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ افسوس کہ بیوقت موت نے ملک کو ایک نہایت قابل اور کارگزار فرزند کی خدمات سے محروم کر دیا۔

اس کتاب میں مضمون معاشیات سے باقاعدہ طور پر بحث کرنا مقصود ہے

یوں تو مروجہ طریق و ترتیب کی پیروی کی ہے لیکن ہندوستان کی معاشرت اور معاشی تنظیم کی جو خصوصیات ہیں ان کے لحاظ سے ضروری ترمیم بھی جابجا عمل میں آئی ہے اصل مقصد یہ ہے کہ عام معاشیات کے اصول و مسائل کو ہندوستان کے حالات کی روشنی میں دیکھا جائے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایسی مختصر کتاب میں ہندوستانی معاشیات کے مسائل کافی اور وافی طور پر بیان ہوں صرف اس قدر مقصود ہے کہ ناظرین ہندوستان کے عام معاشی حالات سے واقف ہو جائیں۔ تاکہ آیندہ اس اہم مضمون کے مختلف شعبوں کو تفصیل کے ساتھ مطالعہ کرنے میں مدد ملے۔

# دوسرا باب

## قدرتی نواح

زندگی کے ہر شعبے میں انسان بالآخر قدرت کا محتاج ہے اور خاص کر اس کی معاشی زندگی کا تو قدرتی حالات سے بہت ہی قریبی تعلق ہے۔ تمام معاشی جدوجہد مادی نواح کی بناء پر جاری ہے پس ہر ملک کی طرح ہندوستان کے معاشی حالات مطالعہ کرنے میں قدرتی اور طبعی حالات سے ابتدا ہونی چاہیئے۔ ایسے حالات پانچ شعبوں میں ترتیب پا سکتے ہیں۔ جغرافی موقع محل۔ ساخت ارضی آب وہوا۔ نباتات و حیوانات۔ اور ذرائع آمدورفت۔

## ۱۔ جغرافی موقع محل

وسعت

ہندوستان جنوب اور شمال میں عرض البلد ۹ سے لے کر ۳۸ تک اور مغرب و مشرق میں طول البلد ۶۶ سے لے کر ۱۰۰ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کا کل رقبہ ۱۸۰۲۶۵۷ مربع میل ہے۔ جو صوبے برطانوی حکومت میں داخل ہیں ان کا رقبہ ۱۰۹۴۳۰۷ مربع میل ہے گویا مجموعی رقبہ کا ۶۰ء۶۱ فی صدی برطانوی ہندوستان میں داخل ہے اور باقی دیسی ریاستوں میں تقسیم ہے۔ سلطنت ہند باستثنائے روس کل یورپ کے برابر ہے۔ برما وسعت میں آسٹریا ہنگری کے برابر ہے۔ بمبئی۔ اسپین کے برابر۔ مدراس، پنجاب، بلوچستان، صوبۂ متوسط و برار اور راجپوتانے میں سے ہر ایک صوبہ جزائر برطانیہ سے بڑا ہے صوبۂ متحدہ اور بہار و اوڑیسہ میں سے ہر ایک کی وسعت اٹلی سے زیادہ ہے۔ حیدرآباد اور کشمیر میں سے ہر ایک ریاست بلحاظ وسعت برطانیہ عظمیٰ کے برابر ہے۔

حدود

اس وسیع ملک کی شمالی سرحد تو ہمالیہ پہاڑ ہے جس کی برف پوش چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی ہیں شمال مغرب اور شمال مشرق میں بھی اونچے اونچے کوہستانی سلسلے پھیلے ہوئے ہیں۔ جن میں چند نہایت ہی تنگ دروں کے سوا

کوئی ذریعۂ آمد و رفت نہیں باقی اطراف میں سمندر ہی سمندر ہے۔

قدرتی تقسیم

ہندوستان ایسے موقع محل پر واقع ہوا ہے کہ ایک جداگانہ ملک بن گیا ہے۔ قدرت ہی نے اس کو باقی دنیا سے الگ کر کے رکھا ہے اور خود ہندوستان کے اندر اندر قدرتی شکل و ہیئت میں اس کثرت سے نمایاں فرق موجود ہیں کہ اس کو ایک ملک کے بجائے برّاعظم کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔

ہندوستان کے جغرافیے میں جو چیز سب سے زیادہ عجیب نظر آتی ہے وہ ہمالیہ پہاڑ ہے جس کے بہت سے سلسلے پہلو بہ پہلو ہندوستان کی مسطح زمینوں کے شمال میں تقریباً ڈیڑھ ہزار میل تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اول تو اس سے موسموں کی تقسیم ہوتی ہے۔ دوسرے وہ تمام دریا جو شمالی ہندوستان کی گرم سیر زمینوں کو سیراب کرتے اور زرخیز بناتے ہیں، اسی پہاڑ سے نکلتے ہیں۔ پس ہمالیہ کا نہ صرف ملک کی طبعی حالت بلکہ اخلاقی اور معاشی زندگی پر بھی بہت کچھ اثر پڑتا ہے اس سلسلے کے دامن میں بہت گھنے جنگل واقع ہیں اور وہاں کی آب و ہوا بہت تکلیف دہ ہے اس کے بعد شمالی ہندوستان کا وسیع میدان پھیلا ہوا ہے۔ جس کو ہمالیہ پہاڑ کے تین دریا سیراب کرتے ہیں یعنے اٹک گنگا اور برہمپتر۔ فی الجملہ اس میدان کا نصف مغربی حصّہ تو خشک اور ریتیلا ہے۔ اور نصف مشرقی تر بلکہ کچھار۔ پہلی قسم کی خصوصیات تو سندھ اور مغربی ریگستان میں بہت زیادہ اور دوسری خصوصیات مشرقی بنگال میں بہت نمایاں نظر آتی ہیں۔ جنوب میں جزیرہ نمائے ہند واقع ہے۔ اس کا بڑا حصہ ایک ناہموار سطح مرتفع ہے جس کے شمال میں وندھیا پہاڑ حد فاصل بنا ہوا ہے۔ مغربی گھاٹ کی اونچی اونچی پہاڑیاں گویا اس کا مغربی پہلو ہیں۔ اور مشرقی گھاٹ کی پہاڑیاں جو خلیج بنگالہ تک ڈھلواں چلی گئی ہیں۔ اس کا مغربی پہلو شمار ہوتی ہیں۔ اس سطح مرتفع کی اوسط بلندی ڈیڑھ ہزار فیٹ ہے۔ اس میں چند گہری وادیاں واقع ہیں دکن کے ساتوں بڑے بڑے دریا انھیں وادیوں سے گزرتے ہوئے بحر عرب اور خلیج بنگال میں داخل ہوتے ہیں۔

———

## ۲- ساخت ارضی

ارضیات ہند

علمائے علم الارض کی رائے ہے کہ قدیم ہندوستان کی حالت موجودہ حالت سے بہت مختلف ہوگی سب سے قدیم زمانے میں ہندوستان محض جنوبی جزیرہ نما پر مشتمل ہوگا اور یہاں سے لے کر افریقہ تک زمین پھیلی ہوئی تھی۔ جس خطہ میں اب پنجاب اور راجپوتانہ واقع ہے وہاں سمندر لہریں مارتا تھا مگر زیادہ گہرا نہ تھا اس کے بعد زمین سے آتش فشانی شروع ہوئی اور نہایت شدید زلزلوں کا سلسلہ بندھا جنکے کہ ملک کی قدرتی ہیئت بالکل متغیر ہو گئی۔ آخر ہزار ہا سال کے تدریجی ارتقاء ارضی سے ہندوستان کی وہ شکل بن گئی۔ اور اس میں وہ خصوصیات پیدا ہو گئیں جو اب موجود ہیں۔ یکے بعد دیگرے زمین کی ساخت میں جو تبدیلیاں واقع ہوئیں ان کی علامتیں اب بھی ملک کی ہیئت طبعی میں موجود ہیں۔ زمین کی چھ قسمیں قرار پائی ہیں۔ ان کا جداگانہ بیان تو کچھ ہمارے مفید مطلب نہیں۔ ہم صرف اُن مختلف زمینوں اور ان کی معدنیات کی عام حالت بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

زمینیں

دریائی زمین کی ملک میں سب سے زیادہ کثرت ہے اور زراعت کے واسطے بھی یہی سب سے زیادہ موزوں اور کارآمد ہے۔ سندھ۔ گجرات، راجپوتانہ، پنجاب، صوبۂ متحدہ، بنگال، آسام، اور برما کے بیشتر حصے میں اس قسم کی زمین پائی جاتی ہے۔ مدراس میں گوداوری۔ کرشنا اور تنجور کے گرد و نواح میں بھی یہی زمین ملتی ہے۔ اور جزیرہ نمائے ہند کے مشرقی و مغربی ساحل سے لگی لگی اور ملک کے دوسرے حصوں میں دریاؤں کے کنارے یہی زمین پھیلی ہوئی ہے۔

ملک کے مختلف حصوں میں دریائی زمین کی حالت طبعی اور کیمیائی خواص کے لحاظ سے مختلف نظر آتی ہے بالعموم شمال مغربی ہندوستان میں زمین مسام دار خشک اور کہیں کہیں ریتلی ہے۔ بنگال کی زمین زیادہ بستہ۔ کم سخت اور خوب تر ہوتی ہے جزیرہ نمائے ہند میں دریائی دہانوں کے قرب و جوار کی زمین سیاہ چکنی مٹی ہے۔ جن میں مسام نہیں ہوتے۔ نرم اور ہلکی مٹی میں بھ

فائدہ ہے کہ زمین جوتنے میں سہولت ہوتی ہے اور اس میں پانی آسانی سے بیٹھ جاتا ہے - جہاں آب وہوا مرطوب ہوتی ہے وہاں اس قسم کی زمین بہت زرخیز بنی رہتی ہے اس میں ایک نقص البتہ بہت بڑا ہے وہ یہ کہ اس کی سطح سے پانی بہت نیچے چلا جاتا ہے اور جن پودوں کی جڑوں کو بہت زیادہ تری کی ضرورت ہے وہ اچھی طرح پر سرسبز نہیں ہو سکتے اور جہاں جلد جلد بارش نہ ہو وہاں ایسی زمین کمتر زرخیز ہوتی ہے - بحیثیت مجموعی دریائی زمینوں میں کیمیائی خواص بہت عمدہ پائے جاتے ہیں - تیزاب - گندک - پٹاس، چونہ، اور مگنیشیا، یہ سب اجزا بہ کثرت موجود ہیں - البتہ شورہ اکثر جگہ کم ہے - لیکن کہیں کہیں سطح میں مگنیشیا اور سوڈا نمک بہ کثرت جمع ہو جانے سے یہی زمین بنجر ہو جاتی ہے، ربیع اور خریف میں طرح طرح کی فصلیں دریائی زمین پر کاشت ہوتی ہیں -

سنگریزہ زمین

دوسرا لمبر سنگریزہ زمین کا ہے جو تمام دکن بالخصوص صوبۂ متوسط حیدرآباد اور کاٹھیاواڑ میں پھیلی ہوئی ہے - بلندیوں اور ڈھالوں پر مٹی مسام دار اور ہلکی ہوتی ہے - اسی لئے زمین بھی زرخیز نہیں ہوتی ان حصوں میں جوار، باجرا اور سینا کاشت ہوتا ہے - پست مقامات کی زمین پر البتہ سیاہ رنگ مٹی کی خوب موٹی تہ ہوتی ہے - وہ اس درجہ زرخیز ہے کہ اس میں کپاس اور گیہوں بھی کاشت ہوتا ہے -

سیاہ زمین

دکن میں کہیں کہیں ریگڑ زمین بھی پائی جاتی ہے اس کا رنگ سیاہ ہوتا ہے اور کپاس کی کاشت کے واسطے ازحد موزوں ہے - اس کی زرخیزی کی کوئی انتہا نہیں - آتش فشاں پہاڑوں سے جو پگھلا ہوا مادّہ بہا ہوگا جس کو لاوا بھی کہتے ہیں اس نے تحلیل ہو ہو کر ایسی زمین کی شکل اختیار کرلی ہے اس کا رنگ گہرا سیاہ ہے اور مٹی خوب بستہ اور مضبوط ہے اس میں تری خوب قائم رہتی ہے اور کیمیائی خواص بھی اعلیٰ درجہ کے موجود ہیں - اس کے واسطے ربیع کی فصلیں بہت موزوں ہیں - گو اکثر خریف کی فصلیں بھی کاشت کر لیتے ہیں - کپاس، گیہوں، السی، اور جوار، باجرا یہاں کی خاص فصلیں ہیں - بمبئی کے بعض اضلاع میں دریائی وادیوں کے قریب اور مدراس کے بعض حصوں

ہیں بھی دکن کی سی سیاہ ریگڑ زمین پائی جاتی ہے۔

زمین کی خاص خاص قسمیں تو اوپر بیان ہوئیں۔ ہندوستان کی باقی زمین کو ترخیلی زمین کا خطہ قرار دے سکتے ہیں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اس باقی ماندہ زمین کی حالت طبعی و کیمیائی خواص کے لحاظ سے اس قدر مختلف ہے کہ سب کو ایک قسم شمار کرنا مشکل ہے۔ بالعموم بلندیوں پر تو یہ زمین بنجر ہوتی ہے۔ لیکن نیستی میں بھوری بھوری چکنی مٹی کے قطعے زرخیز ملتے ہیں۔ اس قسم کی عمدہ زمینوں میں بہت سی فصلیں کاشت ہو سکتی ہیں۔ لیکن چانول سب سے زیادہ موزوں ہے۔ بمبئی کے بعض اضلاع کی کنکریلی زمین از حد مسام دار اور خشک ہونے کی وجہ سے بیشتر او سر ہے۔ ترخیلی زمینوں میں بالعموم شورہ اور تیزاب گندک کم ہوتا ہے گرچہ زمینوں میں طرح طرح کے فرق موجود ہیں۔ تاہم ایک خصوصیت سب میں عام طور پر پائی جاتی ہے وہ یہ کہ نسبتاً خشکی زیادہ ہے۔ زمینوں میں تری نہ ہونے کی وجہ سے ہندوستان میں آبپاشی ناگزیر ہے۔ انگلستان کی حالت بالکل برعکس ہے۔ وہاں تری اس قدر بڑھی ہوئی ہے۔ کہ زراعت کے واسطے پانی کا بہاؤ ضروری ہے۔

ہندوستان کی سطح زمین کی یہ حالت ہے جو اوپر بیان ہوئی۔ شاید یہ جتانے کی ضرورت نہیں کہ ہندوستانیوں کے اسباب معیشت میں زمین کو سب سے اہم رتبہ حاصل ہے کیونکہ ان کی مادی اور اخلاقی ہر قسم کی ترقی اسی سے وابستہ ہے لیکن جو چیزیں زیر سطح مخفی ہیں وہ بھی کچھ کم اہم نہیں۔ آج کل تو ہر قوم کی دولت بیشتر کار آمد معدنیات کے حساب سے شمار ہوتی ہے۔

اب تک ہندوستان کی معدنی دولت کا صحیح اندازہ نہ ہو سکا لیکن اس کی موجودہ معدنی پیداوار اس کی کانیں اور آئندہ کے امکانات جو تحقیقات سے منکشف ہوتے ہیں ان سب پر نظر کر کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں معدنی ذرائع بہت وافر موجود ہیں بال صاحب نے اپنی کتاب معاشی ارضیات ہند کے مقدمہ میں چندر گپت کے دربار کے یونانی سفیر میگھستینز کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ہندوستان میں زمین کے اندر ہر قسم کی معدنیات کی بیشمار نہیں۔ لگی

ترخیلی زمین

معدنی ذرائع

ہوئی ہیں۔ اور بال صاحب اس کو بالکل صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ اگر ہندوستان باقی دنیا سے بالکل الگ تھلگ رہتا یا اس کی معدنی پیداوار مسابقت کی زد سے محفوظ رہتی تو ذرا بھی شک نہیں کہ وہ اپنے ہی حدود کے اندر اندر اعلیٰ سے اعلیٰ مہذب اور ترقی یافتہ قوم کی معدنی ضروریات خود ہی مہیا کر دیتا۔ معدنی ذرائع تقریباً تمام ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ خاص خاص معدنیات کا مختصر بیان خالی از منفعت نہ ہوگا۔

کوئلہ اور لوہا

ہندوستان کی معدنیات میں کوئلہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس کی مقدار بھی زیادہ ہے۔ اور قسم بھی عمدہ ہے۔ بنگال، بہار، آسام، اور صوبہ متوسط میں اس کی خاص طور پر کثرت ہے اور یوں تھوڑا تھوڑا تو برما وسط ہند پنجاب کشمیر اور بلوچستان میں بھی ملتا ہے۔ عمدہ قسم کا آہن خام بھی ہندوستان کے مختلف اضلاع میں بہ کثرت موجود ہے۔ واضح ہو کہ ہر ملک کی معاشی ترقی میں کوئلہ اور لوہے کو بہت دخل ہے۔ انگلستان کو جو صنعتی میدان میں غلبہ حاصل ہے اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ وہاں ان دونوں معدنوں کی کثرت ہے۔ کوئلہ نہ صرف معمولی ایندھن کا کام دیتا ہے بلکہ بڑے بڑے صنعتی کارخانے بھی اسی سے چلتے ہیں۔ لوہے کے خاص خاص مرکز یہ ہیں۔ بنگال میں براکر چیبسا اور رانوری صوبہ متوسط کے شمالی اور مشرقی اضلاع۔ متوسط ہند کا نصف مشرقی حصہ بمبئی میں مہابلیشور اور مالوہ۔ اور نیز ریاست میسور۔ تھوڑا بہت لوہا پنجاب، صوبہ متحدہ کشمیر اور راجپوتانہ میں بھی نکلتا ہے آج کل تو بنگال میں براکر کے سوا کہیں لوہا نکالنے کا معقول انتظام نہیں۔ لیکن امید ہے کہ عنقریب لوہے کی پیداوار اور آہنی مصنوعات میں بہت ترقی ہوگی۔

مٹی کا تیل نمک اور جپسم

مٹی کا تیل آسام اور بلوچستان میں خاص طور پر پایا جاتا ہے۔ شمال مغربی سرحدی صوبے کے بعض اضلاع میں بھی ادنیٰ قسم تیل کی ملتی ہے۔ ہندوستان میں اس تیل کے دو مخزن ہیں یعنی ہمالیہ کی مشرقی اور مغربی چٹانیں جو تہہ بہ تہہ جمی ہوئی ہیں۔ پنجاب کی کان نمک تو مشہور ہے۔ جس میں سے بہت کچھ نمک نکلتا ہے۔ کچھ معدنی نمک ضلع کوہاٹ میں بھی پایا جاتا ہے۔ جپسم صرف جنوبی

برما اور بنگال کے ضلع ہزاری باغ میں نکلتا ہے مگر بہت زیادہ نہیں۔

سامان صنعت

زراعت اور کیمیائی مصنوعات میں شورہ سب سے زیادہ کارآمد ہے۔ شورہ بیشتر بہار میں ملتا ہے اور اس کی پیدائش کے واسطے وہاں قدرتی حالات بھی بہت موافق ہیں۔ تاہم پیداوار گھٹ رہی ہے۔ ہندوستان میں سوڈا نمک کی بہت قلت ہے۔ اگر کچھ ہے تو بس مدراس کے ضلع ترچناپلی میں اس کا ذخیرہ ہے۔ کیسے افسوس کی بات ہے کہ ہڈیاں جن میں یہ بہ کثرت موجود ہے ملک سے باہر بھیجدی جاتی ہیں۔ پٹاس کے نمک بھی بہت نایاب ہیں کھریا مٹی پھٹکری اور گندک البتہ مختلف حصوں میں ملتی ہے سہاگہ کشمیر اور تبت سے آتا ہے سوڈا نمک بھی ملک کے بعض حصوں میں موجود ہے۔

سونا

کسی زمانے میں ہندوستان کے قیمتی فلز بہت مشہور تھے آج کل یہاں قیمتی دھاتیں نکلتی تو ہیں مگر بہت زیادہ نہیں سب سے اول نمبر تو سونا ہے۔ اس کی ایک معتدبہ مقدار ہر سال میسور میں کولار کی مشہور طلائی معدنوں سے نکلتی ہے کچھ حیدرآباد کی کانوں اور دوسرے مقامات میں بھی ملتا ہے چھوٹے ناگپور کے ضلع دھالبوم میں بھی دو جگہ حال میں سونا ملا ہے۔ ہندوستان کے اکثر صوبوں میں قدیم طریق کے مطابق دریا کی ریت دھو دھو کر بھی تھوڑا بہت سونا نکال لیتے ہیں

تانبا سیسہ چاندی اور جست

تانبا اور سیسہ تو ہندوستان میں ہر طرف پھیلا ہوا ہے بنگال میں تانبا خاص طور پر ملتا ہے لیکن صوبہ متوسط راجپوتانہ، جنوبی ہند اور ہمالیہ میں بھی جگہ جگہ پایا جاتا ہے۔ سیسہ بنگال، صوبۂ متوسط، راجپوتانہ مدراس کے ضلع کرنال اور بمبئی کے بعض اضلاع میں ملتا ہے کہیں کہیں سیسہ کے ساتھ چاندی اور جست بھی نکلتا ہے۔

المونیم

حال میں دریافت ہوا کہ برما اور جزیرہ نمائے ہند میں المونیم کی بہت کثرت ہے چنانچہ خیال ہے کہ اس صنعت کا مستقبل بہت امید افزا ہے۔

مینگنیز

صوبۂ متوسط میں منگنیز کی اس درجہ بہتات ہے کہ اس کی پیداوار کے لحاظ سے ہندوستان کا دنیا بھر میں دوسرا نمبر ہے۔ بمبئی، مدراس، حیدرآباد، برما اور چھوٹے ناگپور کے بعض حصوں میں بھی ملتا ہے۔

باب ۲

ابرک — معدنیات میں ابرک کا رتبہ بہت اعلیٰ ہے تمام دنیا کی مجموعی پیداوار کا نصف سے زیادہ ابرک ہندوستان میں نکلتا ہے۔ بنگال میں ضلع "گیا" اور ہزاری باغ اس کے خاص مخزن ہیں۔ مدراس کے ضلع نیلور میں بھی نکلتا ہے۔

کوبلٹ اور نکل — کوبلٹ راجپوتانہ میں ملتا ہے اور نکل کولار کی طلائی معدنوں سے نکلتا ہے۔

قیمتی پتھر — ہندوستان کے مختلف حصوں میں بہت سے قیمتی جواہر ملتے ہیں۔ انہیں ہیرا۔ لعل۔ اور نیلم خاص ہیں۔ ہیرا مدراس، صوبہ متوسط اور پنّا کے قریب متوسط ہند میں خاص طور پر ملتا ہے۔ شمالی برما میں کانوں سے لعل نکالنے کا بہت کاروبار جاری ہے۔ نیلم کا مخزن کشمیر ہے لیکن کہتے ہیں کہ وہ اب خالی ہو چلا۔

متفرق معدنیات — ان کے علاوہ اور بھی بہت سی معدنیات ہیں۔ معمولی پتھر اور سنگ مرمر خاص طور پر قابل لحاظ ہیں کیونکہ وہ عمدہ عمدہ عمارتوں اور آرایش میں کام آتے ہیں۔

معدنی چشمے — ہندوستان کے مختلف مقاموں میں بے شمار گرم چشمے ملتے ہیں۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ کوئی بھی ان پر توجہ نہیں کرتا۔ مثلاً کولو میں بہ مقام مانی کیرن گرم چشمے موجود ہیں۔ ضلع کیرا میں بہ مقام لسندرا اور ضلع تھانہ میں بہ مقام وجرابائی۔ گندک آمیز چشمے ابلتے ہیں۔ کچھ اور چشمے ہمالیہ کی تلہٹی سے بھی جاری ہیں ان سے اصلاح اور تقویتِ صحت میں بہت مدد مل سکتی ہے۔

## ۳۔ آب و ہوا

آب و ہوا کے اختلافات — ہر جگہ کی آب و ہوا پر بہت سے حالات اثر ڈالتے ہیں۔ خاص کر یہ کہ وہ مقام کس عرض البلد پر واقع ہے کس قدر بلند ہے۔ سمندر سے کتنے فاصلے پر ہے اور جو تیز ہوائیں چلتی ہیں ان کا رخ کیا ہے۔ ہندوستان اس قدر وسیع ملک ہے کہ اس کے مختلف حصوں میں مذکورۂ بالا حالات مختلف ہیں یہی وجہ ہے کہ یہاں کی آب و ہوا میں بڑے بڑے اختلاف پائے جاتے ہیں۔

ملک کے تین حصے ہیں۔ اول تو خود ہمالیہ جو کہ ایشیا ء متوسط کی سرد ہواؤں کو ہندوستان میں آنے سے روکتا ہے۔ گویا آب و ہوا کی حدّ فاصل بنا ہوا ہے۔ اور علاوہ بریں جنوبی مغربی باد برشگال جو بخارات سے لدی پھندی آتی ہے۔

اس کو ہندوستان میں گھیر گھیر کر رکھتا ہے۔ تبت کی طرف نہیں گزرنے دیتا۔
ساخت یا لوجی کے لحاظ سے باقی ملک کے دو حصے قرار پائے ہیں۔ جزیرہ نمائے ہند اور شمالی ہندوستان

جزیرہ نمائے ہند — تمام جزیرہ نما منطقہ حارہ میں واقع ہے آب و ہوا گرم ہے گرمی اور جاڑے کے زمانہ میں حرارت میں زیادہ فرق نہیں پڑتا ساحل کے قریب حرارت میں کمی بیشی کی گنجائش اور بھی کم ہے۔ اکثر گھٹا رہتی ہے ہوا کے رخ والے ساحل پر یہ حالت خاص طور سے نظر آتی ہے اور جوں جوں سمندر سے فاصلہ بڑھتا ہے فرق بڑھتا جاتا ہے۔

شمالی ہندوستان — تقریباً کل شمالی ہندوستان خط سرطان سے اوپر واقع ہے لیکن یہاں آب و ہوا کی حالت بہت گوناگون ہے اصطلاحی زبان میں یہاں کی آب و ہوا کو براعظم کی آب و ہوا کہہ سکتے ہیں۔ گرمی اور سردی کی شدت اور ہوا کی رطوبت مختلف صوبوں اور مختلف زمانوں میں مختلف رہتی ہے۔ پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں سردی سخت پڑتی ہے اور گرمی کا بھی یہی حال ہے۔ جوں جوں مشرق کی طرف بڑھئے گرمی اور سردی گھٹتی جاتی ہے حتیٰ کہ بنگال اور آسام میں سردی بھی ہلکی پڑتی ہے اور گرمی بھی اعتدال سے نہیں بڑھتی علیٰ ہذا سندھ پنجاب اور راجپوتانہ تو از حد خشک ہے۔ اور بنگال و آسام کی آب و ہوا ہمیشہ مرطوب رہتی ہے جو مقامات نیچے کے عرض البلد پر واقع ہیں۔ یعنی منطقہ حارہ کے قریب ہیں بلندی ان کے موسم کی اصلاح کر دیتی ہے۔ وسط گرما میں پہاڑوں پر موسم نہایت خنک اور فرحت بخش رہتا ہے۔ لیکن کچھ بلندی کے بعد سردی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ وہاں انسانی آبادی ممکن نہیں۔

یہ ہے ہندوستان کی آب و ہوا کی عام حالت جو اوپر بیان ہوئی باد برشگال جس کا ہم ابھی ذکر چھیڑیں گے۔ البتہ ان حالات میں بہت کچھ تغیر کرتی رہتی ہے

موسم — ہندوستانی سال یوں تو چھ موسموں میں تقسیم ہے۔ لیکن معاشیات کے لحاظ سے اس کے صرف دو موسم قرار پا سکتے ہیں۔ یعنی جاڑا اور گرمی۔ آخر والے موسم کے بھی دو حصے ہیں۔ اپریل۔ مئی۔ جون میں خشک گرمی۔ اور

جولائی اگست ستمبر میں تر گرمی - ہندوستان کی معاشیات میں موسموں کا بہت اثر پھیلا ہوا ہے - موسم کے ساتھ ساتھ پیتھریالاجیکل حالات میں بھی ایسے تغیر و تبدل ہو جاتے ہیں جن سے بہت اہم نتائج پیدا ہوتے ہیں - جاڑے میں ہندوستان کے بیشتر حصہ پر خشک بری ہوائیں چلتی ہیں اور گرمی میں بحری ہواؤں کا زور ہوتا ہے - جو بوجہ مرطوب ہونے کے بہت کچھ ابر لاتی ہیں اور خوب مینہ برساتی ہیں اس تبدیلی کا باعث کچھ تو حرارت کا فرق ہوتا ہے اور کچھ ہوا کے اس دباؤ کا فرق جو مختلف خطوں میں کم و بیش پڑتا ہے -

باد برشگال — تمام ہندوستان شمالی تجارتی ہواؤں کے خط مرور میں واقع ہے پس معمولی حالت میں تو تمام سال یہاں شمالی مشرقی ہوا چلتی رہنی چاہیئے - لیکن واقعہ یہ ہے کہ شمالی مشرقی ہوا چھ مہینے تک چلتی ہے باقی چھ مہینے ہوا کا رُخ بدلا رہتا ہے - اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ برِاعظم ایشیا خط استوا تک پھیلا ہوا ہے - ہوا کے رُخ بدلنے کا ایک دوسرا سبب یہ بھی ہے کہ زمین اور پانی مختلف طور پر حرارت کو جذب اور خارج کرتے ہیں - چنانچہ اپریل مئی میں شمالی ہندوستان کی زمین بحرِ ہند کے مقابل کہیں زیادہ گرم ہو جاتی ہے حالانکہ وہ خط استوا کے قریب واقع ہے - پس خط استوا کے مقابل ان زمینوں میں بوجہ زیادتی حرارت ہوا کا دباؤ بہت کم رہ جاتا ہے - ہوتا یہ ہے کہ میدانوں کی گرم ہوا تو اوپر کو چڑھتی ہے - اور خط استوا کی خنک ہوا دوڑ کر اس کی جگہ پہنچتی ہے - اس طرح کرۂ ہوا کے نیچے کے حصہ میں جنوب سے شمال کی طرف ہوا کا دھارا بندھ جاتا ہے - اسی زمانہ میں خط استوا کے جنوب میں ایک ہوا چلتی ہے - جس کو جنوبی مشرقی تجارتی ہوا کہنا چاہیئے - جوں ہی یہ ہوا خطِ استوا پہنچی معلوم ہوا کہ وہاں پر ہوا کا دباؤ شمالی ہندوستان کے مقابل زیادہ ہے - پس وہ وہیں گھوم کر جنوب مغربی ہوا کا رخ اختیار کر لیتی ہے اور جو ہوا پہلے ہی خط استوا سے ہندوستان کی طرف جاری ہے - اس کی رو اور بھی تیز ہو جاتی ہے - اس ہوا کا نام جنوبی مغربی برشگالی ہوا ہے - چونکہ سمندر پر چلتی ہوئی آتی ہے - خوب مرطوب ہوتی ہے اور جوں جوں بادل چڑھ چڑھ کر ہندوستان پر آتے

ہیں یہاں کے تپتے ہوئے میدانوں کو بارش سے سیراب کر دیتے ہیں۔ یہ بادِ برشگال شروع جون تک بمبئی اور بنگال جا پہنچتی ہے اور مہینہ ختم ہوتے ہوتے تمام ملک پر پھیل جاتی ہے۔

بادِ برشگال کے ہندوستان میں دو دھارے آتے ہیں۔ بحر عرب کا دھارا اور خلیج بنگال کا دھارا۔ پہلا دھارا تو بمبئی پنجاب اور صوبہ متوسط کے ایک حصے میں بارش لاتا ہے اور دوسرا باقی ہندوستان اور برما میں مینہ برساتا ہے۔ ہندوستان میں تقریباً نوے فی صدی بارش اسی بادِ برشگال سے ہوتی ہے وہ اکثر ستمبر تک ہوتی رہتی ہے۔

شمال مشرقی بادِ برشگال

اکتوبر اور نومبر میں ہندوستان کی زمین پر حرارت اتنی نہیں رہتی جتنی کہ خط استوا کے قریب سمندر پر۔ پس یہاں ہوا کا دباؤ بھی بڑھ جاتا ہے اور لا محالہ ہوا خط استوا کی طرف چلنے لگتی ہے۔ اس کو اکثر شمالی مشرقی ہوا سے تعبیر کرتے ہیں لیکن یہ درحقیقت شمال مشرق کی تجارتی ہوا ہوتی ہے۔ چونکہ زمین کی طرف سے آتی ہے اسمیں زیادہ رطوبت نہیں ہوتی اس لئے اس کو خشک بادِ برشگال کہتے ہیں تاکہ شمال مغرب کی مرطوب بادِ برشگال سے تمیز ہو جائے۔ اس میں جو کچھ تھوڑی بہت رطوبت ہوتی بھی ہے تو وہ درحقیقت جنوبی مغربی بادِ برشگال کی بچی کچھی ہوتی ہے جس کو ہمالیہ پہاڑ ہندوستان سے باہر نہیں نکلنے دیتا۔ لیکن شمال مشرق کی تجارتی ہوا کچھ رطوبت راستہ میں خلیج بنگال سے بھی اٹھا لیتی ہے جس کی بدولت مدراس کے جنوب مشرق کے اضلاع میں بارش ہوتی ہے۔ پس یہ شمالی مشرقی ہوا معاشیات کے لحاظ سے مدراس کے واسطے بہت اہم ہے ورنہ بحیثیت مجموعی ہندوستان میں اس سے بارش کچھ زیادہ نہیں ہوتی جاڑے کے موسم میں کچھ بارش پنجاب میں بھی ہوتی ہے۔ جس کا سبب غالباً مقامی آندھیاں ہوتی ہیں۔

فرق بارش کے اسباب

ہندوستان میں ہر سال بارش کی مقدار مختلف رہتی ہے اول تو اس کا دار و مدار بہت کچھ ہوائی رو کے رُخ اور قوت پر ہے۔ ملک کے کسی حصہ میں جس قدر بارش ہوتی ہے وہ کئی باتوں پر منحصر ہے۔ اول تو سطح زمین کا اُبھار دوسرے ہواؤں کے رُخ کے لحاظ سے اس کا موقع محل اور علاوہ بریں

دوسرے مقامی حالات جن سے ہوا کی حرارت میں کمی آئے۔ مثلاً جزیرہ نمائے ہند کے مغربی ساحل پر تو خوب بارش ہوتی ہے۔ اور دکن کی سطح مرتفع اس باد برشگال کی بارش سے محروم رہ جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مغربی گھاٹ کی پہاڑیاں بخارات سے لدی ٹھنڈی ہواؤں کا راستہ روک لیتی ہیں اور ان کو آگے بڑھنے نہیں دیتیں حالانکہ جب باد برشگال کی رو کو ایسی مزاحمت پیش نہیں آتی تو بادل ملک کے اندر دور دور پہنچتے ہیں مدراس کے مشرقی ساحل پر جنوبی مغربی باد برشگال سے بہت ہی کم بارش ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ہواؤں کے رُخ پر واقع نہیں ہوا۔ ہوائیں شمال مشرق کے رخ کو چلتی ہیں علیٰ ہذا اگر کسی سبب سے ہوا کی رو کو سردی پہنچی تو بخارات مجتمع ہو کر بارش ہونے لگتی ہے پہاڑوں پر اور جنگلوں میں تو خوب مینھ برستا ہے۔ اور ریگستان میں بارش کم ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہوا گرم ہونے کی وجہ سے بہت کچھ بخارات سنبھالے رہتی ہے۔ چنانچہ چیرا پونجی میں تو بارش کا معمول ۱۶۰ درجہ رہتا ہے اور سندھ اور جنوبی مغربی پنجاب میں گھٹکر ۷ درجہ تک نوبت آجاتی ہے۔

بارش کی اہمیت

فصل کی سرسبزی یا تباہی خاص کر تین باتوں پر منحصر ہے موسمی بارش کی مقدار۔ اس کی تقسیم اور اس کا وقت یورپ کے ممالک میں تو بارش سے صرف فصل کی پیداوار میں کمی بیشی ہو جاتی ہے۔ لیکن ہندوستان میں اس سے کہیں بڑے بڑے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ کسی سال تو اس قدر بارش ہوگی کہ فصلیں خوب سرسبز ہونگی اور اس کے بعد ایسی خشک سالی آئے گی کہ سخت قحط پھیلے گا اور ہزاروں جانیں فاقے کی نذر ہو جائیں گی اور نہ صرف زراعت کا موسمی بارش پر مدار ہے۔ بلکہ صنعت اور تجارت بھی اسی کے ہاتھ ہے۔ چنانچہ حال کے ایک وزیر مال نے حکومت ہند کے سالانہ موازنے کی تیاری کو بارش کے سٹّے سے تعبیر دی ہے۔ اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ملک کی مرفہ الحالی سراسر بارش پر منحصر ہے۔ ملک کے کسی حصّے کو لو۔ آبادی کی گنجانی اور تہذیب کی حالت آبرسانی کے قدرتی ذرائع کے مطابق نظر آئے گی۔

آب و ہوا کا جسمانی حالت اور عادت پر اثر

ملک کی آب و ہوا نہ صرف زمین کی پیداوار پر اثر ڈالتی ہے بلکہ لوگوں کے

حالات و عادات پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے۔ اگر ہوا گرم اور مرطوب ہو تو تھوڑی سی محنت سے تکان محسوس ہونے لگتی ہے اور ایک ناگفتہ بہ کمزوری عام ہو جاتی ہے۔ ایسی جگہ کے لوگ دشوار کام سے بچتے ہیں منطقۂ حارہ میں بہت سے امراض خاص طور پر پھیلتے ہیں۔ جن سے جسم بہت ضعیف ہو جاتا اور عمر بھی گھٹتی ہے ان سب خرابیوں کا مل ملا کر یہ اثر ہوتا ہے کہ لوگوں میں وہ چستی اور طاقت باقی نہیں رہتی کہ خود اعلیٰ ترقی کریں اور ملک کے ذرائع سے پورا فائدہ اُٹھائیں۔

## ۴۔ نباتات و حیوانات

نباتات

ملک کے جغرافی موقع محل آب و ہوا۔ اور حالت ارضی کا نباتات اور حیوانات پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ ہندوستان کا رقبہ کس قدر وسیع ہے۔ ملک کی قدرتی ہیئت اور یہاں کی آب و ہوا میں کس قدر اختلافات موجود ہیں اور سب پر طرہ یہ کہ زمین بھی قدرتاً زرخیز ہے پس تقریباً ہر قسم کی نباتات یہاں پیدا ہوتی ہیں واقعہ ہے کہ اگر دنیا میں نہیں تو کم از کم ایشیا میں کسی اور اتنے ہی وسیع رقبے کے اندر نباتات کی اتنی قسمیں نہیں مل سکتیں منطقۂ حارہ ماحول منطقۂ حارہ۔ اور منطقۂ معتدلہ ان تینوں منطقوں کی نباتات یہاں پیدا ہوتی ہیں منطقۂ حارہ کی خاص خاص پیداوار یہ ہیں۔ چاول، قہوہ، جوار، باجرا، نیشکر، کنین۔ جوٹ، مسالے، ربڑ اور گٹاپرچا پھل بھی خوب پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً اناناس اور کیلہ وغیرہ ماحول منطقۂ حارہ کی خاص پیداوار یہ ہیں۔ کپاس، تمباکو، افیون، اور چائے منطقۂ معتدلہ میں یہ چیزیں خاص طور پر پیدا ہوتی ہیں۔ گیہوں، مٹر، جو، مسینا، آلو، سن، اور طرح طرح کے پھل۔ علاوہ بریں اور مختلف قسم کی چیزیں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً بہت سے روغندار تخم، گوند، چوبینہ اور نیل۔

حیوانات

زراعت اور باربرداری میں چوپائے بہت کارآمد ہیں کسی زمانے میں ہندوستان میں عمدہ مویشیوں کی بہت کثرت تھی۔ لیکن کچھ روز سے ان کی حالت خراب ہو گئی ہے اور تعداد بھی گھٹ رہی ہے اوّل تو پیٹ بھر کھانے کو نہیں ملتا۔ دوسرے

وہ نہایت غلیظ سائبان میں بندھے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ طرح طرح کے مرض پھیلتے ہیں۔ اور یوں بھی مویشیوں کی پرورش پر لوگ بہت کم توجہ کرتے ہیں سرکار ہند کے زراعتی مشیر کی رائے ہے کہ ہندوستان کے مویشیوں میں مرض وبائی بن گئے ہیں اور یہ بھی ایک خاص وجہ ہے کہ کاشتکاروں کی حالت اصلاح پر نہیں آتی عمدہ مویشیوں کی قلت سے ترقی زراعت میں بہت دقت پیش آرہی ہے۔ جہاں بارش کی کثرت ہے وہاں مویشی کی پرورش دشوار ہے۔ کیونکہ مویشی کی صحت کے واسطے زمین میں جو اجزا ہونے ضروری ہیں وہ مینھ کے پانی سے دھلکر بہ جاتے ہیں۔ وہاں کے مویشی پورے جسیم اور طاقتور نہیں ہوتے چنانچہ اسی وجہ سے جنوبی بنگال کرناٹک، ساحل کارومنڈل اور جنوبی برما میں گھوڑے کمیاب ہیں۔ حالانکہ خشک طبقوں میں مثلاً بلوچستان۔ پنجاب۔ راجپوتانہ اور کاٹھیاواڑ میں اچھے گھوڑے ملتے ہیں۔ ہندوستان کے چوپایوں میں بیل سب سے زیادہ مفید اور کارآمد ہیں۔ تقریباً ہر جگہ کھیت جوتتے ہیں پانی کھینچتے ہیں بوجھ ڈھوتے ہیں۔ بہت سی جگہ بھینسے بھی یہ کام کرتے ہیں دودھ اور گھی یہاں کے لوگوں کی خاص غذا ہے۔ اس لحاظ سے گائے اور بھینس بھی بہت مفید ہے۔ بھیڑ بکریاں ہر صوبے میں موجود ہیں۔ گدھا بھی بار برداری کا بہت کام دیتا ہے خصوصاً شمالی ہندوستان میں ریگستانی زمینوں میں اونٹ بھی ملتا ہے اور حمل و نقل میں بہت کام آتا ہے۔ پنجاب۔ کشمیر۔ راجپوتانہ اور کاٹھیاواڑ میں خاص طور پر عمدہ مویشی پیدا ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں بارش کی کثرت نہیں ہے

دودھ کے علاوہ اور بھی کارآمد اور ضروری چیزیں حیوانات سے ملتی ہیں مثلاً اون، موم۔ شہد۔ اور ہاتھی دانت۔

دریائی پیداوار میں مچھلی سب سے زیادہ کارآمد ہے لیکن معاشیات کے لحاظ سے بحر ہند کے موتی اور سیپ بھی بہت اہم ہیں۔

ریل، سڑک دریا۔

شمالی ہندوستان کے ہموار میدانوں میں ذرائع آمد و رفت بہت سہل ہیں یہاں پر ریل اور سڑکیں بغیر دشواری نکل سکتی ہیں۔ گنگا اور اس کے بیشمار معاونوں کے ذریعے سے بھی ہزاروں میل تک آمد و رفت ہو سکتی ہے فن معاشیات

کے لحاظ سے یہ دریائی راستے بہت کچھ اہم ہیں۔ برہمپتر کے نیچے والے حصے میں بھی نقل وحمل جاری رہتی ہے۔ اٹک اور اس کے معاونوں میں بھی چھوٹی چھوٹی کشتیاں چلتی ہیں بلکہ سال میں کبھی کبھی اس میں دخانی کشتیوں کی گنجائش نکل آتی ہے۔ لیکن جنوبی ہندوستان میں سطح اس قدر ناہموار ہے کہ آمدورفت میں سخت دقت پیش آتی ہے۔ سڑکیں بنانا تو بہت مشکل ہے البتہ ریلیں کہیں کہیں نکل گئی ہیں۔ لیکن وہ بھی بہت کچھ فن انجینیری کا کمال صرف کرنے پر دریا بھی آمدورفت کا کام نہیں دے سکتے۔ سیلاب کے زمانے میں تو حد اختیار سے باہر ہو جاتے ہیں اور باقی سال یوں ہی پایاب پڑے رہتے ہیں۔

سمندر

جو مقامات ہندوستان کے طولانی ساحل پر واقع ہیں وہاں سمندر کے ذریعے سے آمدورفت رہتی ہے۔ البتہ قدرتی بندرگاہ کم ہیں۔ اور باد برشگال کے زمانے میں بحر ہند میں ازحد تلاطم رہتا ہے تاہم باوجود ان دقتوں کے اب ہندوستان اور دوسرے ممالک کے درمیان سمندر ہی قدرتی راستہ بنا ہوا ہے۔

قدرتی سہولتیں اور دقتیں

ہندوستان کے قدرتی نواح کا حال اور معاشیات سے ان کا جو کچھ تعلق ہے مختصراً اوپر بیان ہوا۔ معلوم ہوا کہ ملک کو بہت سی قدرتی سہولتیں اور آسانیاں حاصل ہیں۔ اور ساتھ ہی کچھ دقتیں اور دشواریاں بھی لگی ہوئی ہیں۔ یہ تو سب کو تسلیم ہے کہ انسان بہت کچھ قدرت کا محتاج ہے۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں کہ وہ سراسر قدرت کے ہاتھ میں بے بس ہے بلکہ بعض حالتوں میں انسان قدرتی نواح کی بھی ترمیم اور اصلاح کر ڈالتا ہے۔ اگر ہندوستان کے لوگ کوشش کریں تو وہ اپنی ذہانت اور معلومات سے قدرتی طاقتوں کو بہت کچھ قابو میں لا سکتے ہیں۔ اس نکتے کی تشریح ضروری معلوم ہوتی ہے۔

انسانی ترمیم

زمین کی پیداوار اس کی زرخیزی پر منحصر ہے۔ لیکن انسان کی کوشش سے قدرتی زرخیزی میں ترقی ہو سکتی ہے۔ اور بے توجہی سے وہ بہت کچھ گھٹ جاتی ہے۔ اگر بری طرح کاشت کیجائے تو اچھی سے اچھی زمین خراب ہو جائے گی۔ اس کے برعکس عمدہ کھاد لگانے اور باقاعدہ طور پر کاشت کرنے سے نہایت ادنی زمین۔ بہ درجۂ اعلی زرخیز بن سکتی ہے۔ کان کو لیجئے۔ وسعت معلومات اور

جدت تجربیات سے ایسی مفید اور نئی نئی دھاتیں مصنوعی طور پر تیار ہو سکتی ہیں جو مروجہ دھاتوں کا ساتھ دیں۔ بلکہ ان کے سامنے مروجہ دھاتوں کو کوئی ہاتھ بھی نہ لگائے۔ البتہ آب و ہوا اور موسم اٹل ہیں پھر بھی ان میں تھوڑی بہت ترمیم ممکن ہے جہاں بارش کی کمی ہو وہاں جنگل لگانے سے بارش بڑھ سکتی ہے مزید براں ذرائع آبپاشی مثلاً نہر نالے دور دور تک پانی پہنچا سکتے ہیں۔ بڑے بڑے نالے بنانے دلدلوں اور کیچڑوں کو خشک و صاف کرنے اور دریا کی تہہ کی جمی ہوئی مٹی نکالنے سے ملک کی آب و ہوا بہت کچھ درست ہو سکتی ہے اور صحت بخش ہو کر لوگوں کی صحت درست ہو سکتی ہے۔ اور زمین کی ترائی میں فرق پڑنا ممکن ہے۔ شدید گرمی اور سردی کے اثرات میں بھی مختلف تدبیروں سے تخفیف ہو سکتی ہے۔ اگر جسم اور دماغ پر آب و ہوا کا مضر اثر پڑے تو باقاعدہ احتیاط کرنے اور طریق سائنس کے بموجب رہنے سہنے سے اس کا بھی دفعیہ ممکن ہے۔

نباتات اور حیوانات کا کچھ تو قدرتی حالات پر دارومدار ہے اور کچھ انسان کی مرضی پر سائنس کی تحقیقات سے مدد لے کر موجودہ ترکاریوں اور پھلوں کو بہت ترقی دے سکتے ہیں بلکہ نئی نئی قسمیں پیدا کرنا بھی ممکن ہے۔ اسی طرح چوپایوں کی نسل بھی عمدہ طریق پرورش سے بہت کچھ ترقی کر سکتی ہے۔

ذرائع آمد و رفت میں قدرت نے جو دقتیں حائل کر رکھی تھیں۔ ان کو تو سائنس نے بہت کچھ رفع کر دیا۔ ایسی ایسی جگہ ریلیں جا پہنچی ہیں کہ جہاں ان کے بغیر شاید کبھی کسی کا گزر نہ ہوتا۔ اور آمد و رفت میں فاصلہ تو اب کوئی بات ہی نہیں رہا۔ یہی خوفناک سمندر سب سے سہل اور سستا ذریعۂ نقل و حمل بنا ہوا ہے۔

———— ۰ ————

# تیسرا باب

## نظم معاشرت

قدرت اور انسان دونوں ملکر دولت پیدا کرتے ہیں۔ گذشتہ باب میں واضح ہوا کہ ہندوستان کی معاشی زندگی میں قدرت کو کس قدر دخل ہے اس باب میں یہ دکھانا مقصود ہے۔ کہ انسان اس کام میں کس حد تک دخل رکھتا ہے۔

آبادی

ہندوستان کی مجموعی آبادی ساڑھے اکتیس کروڑ سے کچھ زیادہ ہے۔ اس میں ۷۷٫۵ فی صدی تو انگریزی علاقوں میں آباد ہے اور باقی ۲۲٫۵ فی صدی دیسی ریاستوں میں۔ واضح ہو کہ ہندوستان کی آبادی ریاستہائے متحدہ امریکہ کی آبادی کے سہ چند سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ صوبۂ متحدہ اور بنگال میں سے ہر ایک میں مع ان کی ملحقہ ریاستوں کے اتنے ہی لوگ آباد ہیں۔ جتنے کہ جزائر برطانیہ میں۔ بہار اور اڑیسہ کی آبادی فرانس کے برابر ہے۔ بمبئی کی آسٹریا کے برابر اور پنجاب کی آبادی اسپین اور پرتگال کی مجموعی آبادی کے ہم پلہ ہے کل سلطنت ہند میں آبادی کا اوسط ۱۷۵ نفوس فی مربع میل پڑتا ہے باستثنائے روس باقی کل یورپ کا مجموعی اوسط بھی یہی نکلتا ہے۔ برطانوی صوبوں میں مجموعی اوسط ۲۲۳ فی مربع میل ہے اور دیسی ریاستوں میں ۱۰۰۔ یہاں پر بغرض مقابلہ دوسرے ملکوں کی آبادی کا اوسط بیان کرنا خالی از منفعت نہ ہوگا

| ملک | اوسط آبادی فی مربع میل |
|---|---|
| مصر (نواح دریائے نیل) | ۹۳۹ |
| بلجیم | ۵۸۹ |
| ہالینڈ | ۴۰۰ |
| سلطنت متحدہ برطانیہ عظمیٰ و آئرلینڈ | ۳۷۹ |
| جرمنی | ۲۹۰ |
| فرانس | ۱۹۰ |

| | |
|---|---|
| یوروپی روس | ۵۰ |
| ریاستہائے متحدۂ امریکہ | ۲۱ |
| ایشیائی روس | ۳٫۵ |
| کناڈا | ۱٫۵ |
| آسٹریلیا | ۱٫۲ |

ہندوستان میں آبادی کی تقسیم یکساں نہیں - آبادی کی گنجانی کے کئی سبب ہوتے ہیں - ان میں سے زیادہ بڑے اسباب یہ ہیں - بارش آب و ہوا موسم، زمین کی پیداوار، سطح زمین کا ابھار اور تہذیب کی حالت بالعموم آبادی وہیں زیادہ گنجان ہوتی ہے جہاں آبرسانی کے قدرتی یا مصنوعی ذریعے اچھے ہوں بالفاظ دیگر جہاں پانی اور دیگر ناگزیر ضروریات زندگانی بہ کثرت و بہ آسانی دستیاب ہو سکیں - لیکن کہیں کہیں گنجانی اس قاعدے سے مستثنیٰ بھی نظر آتی ہے بہرحال بنگال میں آبادی کی گنجانی سب جگہ سے بڑھی ہوئی ہے وہاں کا اوسط ۵۵۱ نفوس فی مربع میل ہے - اس کے بعد صوبۂ متحدہ میں گنگا کی وادی میں جہاں اوسط ۴۲۷ پڑتا ہے آبادی کی گنجانی شمالی برما شمال مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان میں سب جگہ سے کم ہے ہر صوبے کا جداگانہ اوسط حسب ذیل ہے -

| | |
|---|---|
| بنگال | ۵۵۱ |
| صوبۂ متحدہ | ۴۲۷ |
| بہار و اڑیسہ | ۳۴۴ |
| مدراس | ۲۹۱ |
| پنجاب | ۱۷۷ |
| بمبئی | ۱۴۵ |
| آسام | ۱۱۰ |
| شمال مغربی سرحدی صوبہ | ۶۴ |
| برما | ۵۲ |
| صوبۂ متوسط و برار | ۳۳ |

بلوچستان ۶

دیہاتی اور قصباتی آبادی

لوگ زیادہ تر دیہات میں رہتے ہیں پانچ ہزار سے زیادہ آبادی کے قصبات میں کل صرف ۹٫۵ فی صدی لوگ آباد ہیں۔ حالانکہ انگلستان میں ایسی آبادی کا اوسط ۷۸٫۱ اور جرمنی میں ۵۴٫۶ فی صدی ہے۔ قصباتی آبادی بمبئی میں سب سے زیادہ ہے یعنی ۱۸ فی صدی اور آسام میں صرف ۳ فی صدی ہر صوبے کی مجموعی آبادی کے مقابل وہاں کی قصباتی آبادی کا اوسط حسب ذیل ہے۔

| ملک | فی صدی |
|---|---|
| بڑودہ | ۲۰ |
| بمبئی | ۱۸ |
| شمال مغربی سرحدی صوبہ | ۱۳ |
| راجپوتانہ | ۱۳ |
| کوچین | ۱۲ |
| مدراس | ۱۱٫۷ |
| میسور | ۱۱ |
| پنجاب | ۱۰٫۶ |
| صوبۂ متحدہ | ۱۰٫۲ |
| برما | ۹٫۳ |
| حیدرآباد | ۹ |
| کشمیر | ۹ |
| صوبۂ متوسط | ۸ |
| ٹراونکور | ۶٫۲ |
| بنگال | ۶ |
| آسام | ۳ |

صرف تیس شہر ایسے ہیں جن کی آبادی ایک لاکھ یا اس سے زیادہ ہے۔
جن قصبات کی آبادی پانچ ہزار سے لیکر نو لاکھ نوے ہزار تک ہے۔ ان کی مجموعی

تعداد ۲۲۲۴ ہے لیکن دیہات سات لاکھ تیس ہزار سے کم نہیں۔ کثرت دیہات کی خاص وجہ یہ ہے کہ آج کل یہاں کا عام پیشہ زراعت ہی زراعت ہے اس میں شک نہیں کہ دیہاتیوں کے خیالات و عادات قصباتیوں کے مقابل کم ترقی پذیر ہوتے ہیں لیکن دیہاتی اور قصباتی طرز زندگی میں کوئی خاص فرق نہیں۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جبکہ یہاں قصباتی آبادی بہت زیادہ تھی اور قصبات کو معاشرت میں بڑا دخل تھا۔ صنعت وحرفت کے تباہ ہونے سے قصبات پر بھی زوال آگیا اور لوگ زراعت کی خاطر دیہات میں جا بسے۔ اب کچھ روز سے البتہ رجحان بدلا ہوا نظر آتا ہے قصبات پھر خیالات تہذیب اور صنعتوں کے مرکز بنتے جارہے ہیں اور قومی زندگی کچھ کچھ وہیں پیدا ہورہی ہے۔

ذکور و اناث

آبادی کی جنسوار تقسیم معاشی لحاظ سے بہت ضروری ہے کیونکہ مستورات کی بہت بڑی جماعت ایسی ہے کہ دولت کی پیدائش میں وہ بہت کم ہاتھ بٹاتی ہے۔ معاشرتی رسم و رواج کی پابندی کی وجہ سے اعلیٰ اور متوسط طبقوں کی مستورات کاروبار میں براہ راست شریک نہیں ہوسکتیں۔ بحیثیت مجموعی مردوں کی تعداد عورتوں سے کسی قدر زیادہ ہے لیکن اعلیٰ طبقوں میں مستورات کی تعداد بڑھی نظر آتی ہے۔

عمروار تقسیم

آبادی کی عمروار تقسیم بھی بہت کچھ قابل لحاظ ہے۔ بوڑھے اور بچے دولت صرف تو کرتے ہیں لیکن خود پیدا نہیں کرسکتے۔ فی الجملہ کام کرنے اور کمانے کی عمر ۱۵ اور ۶۰ سال کے مابین شمار ہونی چاہیئے ۱۵ سے ۶۰ سال تک کی۔ عمر والے گروہ میں کوئی سترہ کروڑ آدمی یعنی ۵۳ فی صدی آبادی داخل ہے۔ اب اگر اس میں سے ضعیف اور بیمار لوگ اور ان مستورات کی بڑی جماعت منہا کردی جائے جو پردے وغیرہ معاشرتی رسم و رواج کی پابندی سے ملک کے معاملات معیشت میں شریک نہیں ہوسکتیں تب ان لوگوں کی تعداد معلوم ہوجائے گی جو توانا تندرست ہیں اور پیدائش دولت کا کام انجام دے سکتے ہیں اور جو علمی زبان میں اجیر سے تعبیر پاتے ہیں۔ (یہ خیال کرتے ہوئے کہ ہندوستان میں زیادہ تر بیکاری کا دور دورہ ہے دولت پیدا کرنے والوں کی تعداد نسبتاً بہت تھوڑی رہ جاتی ہے اور یہی عام خستہ حالی کا خاص سبب ہے۔ مترجم)

باب ۳
صحت

دولت کی پیدائش میں انسان کی کارگزاری دیکھنی ہو تو سب سے اول صحت کا مسئلہ غور طلب ہے ملک کے اکثر حصوں میں لوگوں کی صحت خراب ہے ایک طرح کمزوری عام ہو رہی ہے۔ مزدوروں کی کارکردگی کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ اس خرابی کے کئی سبب ہیں۔ آب و ہوا اور موسموں کی خرابی۔ ناکافی غذا۔ صاف پانی کی قلت۔ گندہ اور غلیظ نواح مصنوعی طریق ماند و بود۔ اور مخرب صحت رسم و رواج ان چند در چند اسباب سے جسم روز بہ روز ضعیف ہو کر آخر مدافعت مرض سے معذور ہوتا جاتا ہے۔ مزید براں گاہے گاہے وبائیں پھیلتی ہیں جو دور دور تک آبادی کا صفایا کر دیتی ہیں۔ اور پھر جسمانی کمزوری۔ اور متعدی امراض موروثی ہو کر نسلاً بعد نسلٍ قوموں کو زیادہ ضعیف اور ناکارہ بناتے چلے جاتے ہیں۔

پیشہ وار تقسیم

لوگوں کی معاشی حالت کا بہت کچھ دارومدار ذرائع معاش پر ہے پس جو جو پیشے جس قدر رائج ہوں وہ بھی توجہ طلب ہیں۔ کیسی انوکھی بات ہے کہ کچھ نہیں تو ۷۲ فی صدی آبادی کا ذریعۂ معاش زراعت ہی زراعت ہے صنعت و حرفت میں صرف ۲ء۱۱ فی صدی لوگ مصروف ہیں۔ تجارت میں ۶ء۵ اور نقل و حمل میں صرف ۶ء۱ فی صدی باقی لوگوں کے ذرائع معاش حسب ذیل ہیں۔ پیشے اور شریف فن ۷ء۱ گھریلو خدمات ۵ء۱ سرکاری حکومت ۸ء۰۔ سرکاری جمعیت مثل فوج و پولیس ۷ء۰۔ کان کنی ۷ء۱۔ غیر مشرح پیشے ۹ء۲۔ غیر پیدا وار کام ۱ء۱ گھر کی آمدنی ۷ء۱۔

آبادی کے متعلق جو کچھ اوپر بیان ہوا وہ مجموعی طور پر سکونیات آبادی کہلاتا ہے لیکن متحرکات آبادی کے مسائل بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتے۔ آبادی گھٹنے بڑھنے کے تین سبب ہوتے ہیں۔ پیدائش اموات اور توطن یعنی ایک جگہ سے دوسری جگہ جا کر آباد ہونا۔ ذیل میں ان تینوں اسباب کا حال مختصر بیان کرتے ہیں

شادی اور تولد

پیدائش کا دارومدار شادی بیاہ اور قوت تولید پر ہے ہندوستان میں شادی تو بالکل عام ہے فی الجملہ کیا مذاہب اور کیا رسم و رواج سب اس کے موافق اور حامی ہیں کہ سن بلوغ سے پہلے ہی ہر شخص کی شادی ہو جائے۔ پس یہ قول ہندوستان پہ صادق نہیں آتا کہ مرفہ الحالی سے شادیوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

اور افلاس سے تخفیف بلکہ اعلیٰ طبقوں کے مقابل ادنیٰ طبقوں میں بے سروسامانی کی شادیوں کی بہت کثرت ہے مجردوں کی نسبت یورپ و امریکہ کے مقابل ہندوستان میں بہت کم ہے۔ ساتھ ہی اس کے ہندوؤں میں بیواؤں کی دوبارہ شادی نہیں ہوتی اور چونکہ خاوند اور بیوی کی عمروں میں یہاں بہت کچھ فرق ہو سکتا ہے۔ یورپ امریکہ کے مقابل یہاں بیواؤں کی نسبت بھی بہت زیادہ ہے۔ بیزنوں کی نسبت اور بھی بڑھی ہوئی ہے اعلےٰ اور متوسط طبقوں کے مقابل ادنیٰ طبقوں میں قوت تولید بہت پائی جاتی ہے اور مسلمانوں کی قوتِ تولید ہندوؤں سے بڑھی ہوئی ہے۔ اس فرق کا غالباً یہ سبب ہے کہ ہندو جماعت کے پس ماندہ طبقے غیر محتاط رہتے ہیں گزشتہ دس سال میں یہاں خام شرح پیدائش کا اوسط ۳۴٫۹ فی ہزار رہا ہے لیکن خالص شرح پیدائش کے معتبر اعداد و شمار نہیں ملتے۔ یعنی یہ کہ قابل تولید عمر والی مستورات کے حساب فی صدی سے کتنے بچے پیدا ہوئے۔ یہ البتہ معلوم ہے کہ کم عمری میں اولاد شروع ہو جاتی ہے اور عمر کچھ زیادہ نہیں ہونے پاتی کہ اولاد کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔

شرح اموات

آبادی کی کمی بیشی کا دارومدار نہ صرف شرح پیدائش بلکہ شرح اموات پر بھی ہے دوسرے مہذب ملکوں کے مقابل ہندوستان میں شرح اموات حد سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ جتنے بچے پیدا ہوتے ہیں ان میں سے ایک چوتھائی تو عمر کے پہلے ہی سال میں ختم ہو جاتے ہیں۔ سنہ ۱۹۰۱-۱۱ء میں شرح اموات تقریباً ۳۸٫۵ فی ہزار رہی۔ حالانکہ آج کل مہذب قوموں میں شرح اموات ۱۳ اور ۲۱ فی ہزار کے درمیان رہتی ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۱۲ء میں انگلستان کی شرح پیدائش تو ۲۳٫۸ اور شرح اموات ۱۲٫۹ فی ہزار تھی۔ ہندوستان میں کثرتِ اموات کے بہت سے اسباب ہیں، قحط، وبائیں، اچھی غذا اور صاف پانی کی قلت، گندگی مکانات کی نوعیت اور کمسنی کی شادی سے کمزوری۔ خراب موسموں میں آبادی گھٹ جاتی ہے، اور اچھے موسموں میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ نہیں کہ تعداد پیدائش بڑھ جاتی ہے۔ بلکہ تعداد اموات میں کچھ تخفیف ہو جاتی ہے۔ قصبات میں شمار اموات دیہات کے مقابل کچھ زیادہ ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہاں

آبادی زیادہ گنجان ہے (اور صفائی کا کافی انتظام نہیں)

عمر

باقاعدہ حساب لگانے سے تحقیق ہوا کہ انگریزوں کے مقابل ہندوستانیوں کی زندگی کا تخمینہ ہر عمر کے لحاظ سے کم نکلتا ہے۔ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری سے معلوم ہوا کہ یہاں مرد کی عمر کا تخمینہ حساب سے ۲۲،۵۹ سال ہوتا ہے اور عورت کی عمر کا ۲۳،۳۱ سال۔ حالانکہ انگریزوں میں مرد اور عورت کی عمر کا تخمینہ علی الترتیب ۴۶،۰۴ اور ۵۰،۰۲ سال ہوتا ہے۔ عمر کے ہر حصے میں فرق اسی درجہ نمایاں رہتا ہے مرد اور عورت کی عمر کا مندرجہ بالا تخمینہ ۱۸۹۱ء اور ۱۹۰۱ء کے تخمینوں سے بھی گھٹا ہوا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ عمروں میں روز افزوں کمی ہو رہی ہے۔ حالانکہ انگلستان کے موجودہ اور گزشتہ تخمینوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں عمریں بڑھ رہی ہیں۔ عمر کے لحاظ سے ہندوستانیوں کی حالت بہت نازک ہو چلی ہے سرکار کو اور نیز تمام تعلیم یافتہ جماعتوں کو جلد اس طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔

توطن داخلی

دوسری چیز جس کا آبادی کی تعداد پر اثر پڑتا ہے۔ توطن ہے یعنی ایک جگہ سے دوسری جگہ جا کر آباد ہونا۔ توطن کی دو قسمیں ہیں۔ داخلی اور خارجی۔ داخلی توطن کی کئی صورتیں ہیں۔ اتفاقی، ہنگامی، دوری، نیم مستقل اور مستقل اتفاقی اور ہنگامی نقل و حرکت تو صوبہ صوبہ اور ضلع ضلع ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ مثلاً کلکتے کے کارخانوں کے مزدور بالائی حصہ ملک سے آتے ہیں۔ دوری نقل و حرکت اس حالت میں جاری ہوتی ہے جبکہ خاص خاص موسموں میں مزدوروں کی ضرورت پیش آتی رہے۔ نیم مستقل توطن بھی بہت شاذ نہیں لیکن اندرون ملک مستقل توطن کی انتہائی کمی ہے۔ لوگوں کی قدامت پسند طبیعت اور عادات۔ گھر بار کی محبت، افلاس و ناداری۔ دوسرے حصوں کی حالت سے بےخبری۔ یہ سب باتیں مل ملا کر مزدور کو اسی کے گاؤں میں ڈالے رکھتی ہیں۔ مستقل توطن کی جو ایک خاص مثال حال میں قائم ہوئی ہے وہ پنجاب کی نہری آبادیاں ہیں جہاں بہت سے لوگ جا کر بس گئے ہیں۔

توطن خارجی

خارجی توطن کی دو صورتیں ہیں یا تو لوگ کسی ملک سے باہر جا کر آباد ہوں یا باہر سے آکر اس ملک میں بسیں۔ پہلی صورت میں ملک کی زائد آبادی خارج ہوتی

رہتی ہے۔ لیکن ہندوستانی تارک الوطن تعداد میں اس قدر قلیل ہیں کہ قابل لحاظ نہیں۔ سنہ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری میں ہندوستانی تارک الوطن جو پیوستہ دس سال کے اندر سلطنت برطانیہ کے دوسرے حصوں میں جاکر آباد ہوئے دس لاکھ سے کچھ ہی زیادہ تھے۔ ایسے خارجی توطن کا رجحان ہندوستان میں روز بروز گھٹ رہا ہے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ نو آبادیوں میں ہندوستانیوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوتا۔ ایسے نوواردوں کی تعداد بھی بہت کم ہے جنھوں نے ہندوستان میں مستقل توطن اختیار کیا ہو۔ آبادی کا بار گھٹانے کے خیال سے خارجی توطن کا مسئلہ خاص توجہ کا مستحق ہے۔

ذات پات کے بندھن اور قدیم رسم و رواج مزدوروں کو پیشہ تبدیل کرنے کا کوئی موقع نہیں دیتے تھے۔ لیکن جوں جوں ذات اور رواج کا اثر گھٹ رہا ہے وہ سب بندشیں بھی ٹوٹتی جاتی ہیں۔ تاہم اس تغیر کی رفتار میں ابھی پوری روانی اور آزادی پیدا نہیں ہوئی۔

اضافۂ آبادی گزشتہ دس سال کے اندر ہندوستان کی آبادی انتیس کروڑ چالیس لاکھ سے بڑھ کر اکتیس کروڑ پچاس لاکھ ہوگئی۔ گویا ہر سال فی ہزار ۷ نفوس کا اضافہ ہوا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا آبادی حد سے زیادہ جلد بڑھ رہی ہے۔ بعض لوگ تو بیشتر اس شرح اضافہ سے خائف ہو رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ذرائع معاش پر آبادی کا بیجا بار پڑ رہا ہے اور یہی عام خستہ حالی کا بڑا باعث ہے۔ ان کو خوف ہے کہ اگر آبادی یوں ہی بڑھا کی تو عنقریب ملک کو سخت مصیبت کا سامنا ہوگا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ گو آبادی بڑھ رہی ہے پھر بھی اس کی رفتار دوسرے مہذب ملکوں کے مقابل کم ہے۔ اضافہ کچھ یوں بھی معلوم ہوتا ہے کہ مردم شماری کا انتظام بہ مقابل سابق زیادہ منضبط اور مکمل ہو گیا ہے اس کے علاوہ بقول پروفیسر سیلگمین آبادی کے مسئلے کو صرف تعداد پر ختم نہ سمجھنا چاہیئے بلکہ اس کو پیداوار کی قوت اور واجبی تقسیم سے بھی بہت کچھ تعلق ہے۔ قانون تقلیل حاصل کا پورا پورا عمل صرف زراعت میں ہوتا ہے۔ اور حقیقی تقابل آبادی اور خوراک میں نہیں بلکہ آبادی اور دولت میں ہے۔ اگر آبادی بڑھے اور دولت اپنی اسی

مقدار پر قائم رہے یا آبادی کے مقابل اس میں کمتر اضافہ ہو تو نتیجہ یہی ہوگا کہ لوگ اور بھی زیادہ خستہ حال ہو جائیں۔ چنانچہ پچھلے زمانے میں ہندوستان کی یہی حالت رہ چکی ہے۔ اس کے برعکس اگر اضافۂ آبادی کے ساتھ پیداوار اور دولت میں بھی اسی قدر ترقی ہوتی رہے تو ملک میں موجودہ آبادی سے بھی زیادہ لوگ اچھی طرح بسر کر سکتے ہیں۔ گیٹ صاحب جو امپیریل گزیٹیر کے ایک مدیر بھی ہیں، ہندوستان کے مستقبل کے متعلق ان کی بھی یہی رائے ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ اول تو غیر زرعی پیشے پھیل رہے ہیں دوسرے جہاں آبادی خوب گنجان ہے وہاں بھی سائنس کے طریق سے کاشت کرکے زمین کی پیداوار بڑھا سکتے ہیں۔ تیسرے ملک میں ابھی کچھ حصے خالی پڑے ہیں مثلاً برما۔ لوگ چاہیں تو وہاں جا بسیں اور کمائیں کھائیں۔ اسی طرح مغربی راجپوتانے میں بہت سا ریگستان غیر مزروعہ پڑا ہوا ہے اگر ذرائع آبپاشی مہیا ہو جائیں تو وہاں خوب کاشت ہو سکتی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ ملک میں ابھی اضافۂ آبادی کی گنجائش موجود ہے۔

# چوتھا باب

## نظم معاشرت

### ۱- ذات پات کا طریق

ہندؤوں کی معاشرت میں ذات پات کا طریق سب سے زیادہ عجیب نظر آتا ہے بہت قدیم زمانے سے اس کا رواج چلا آتا ہے۔ لیکن یہ طریق اوّل اوّل کس لیئے اور کس طرح جاری ہوا اس کا ٹھیک ٹھیک پتہ ملنا محال ہے۔

ابتدا

وید کی چند عبارتوں میں تو ذات پات کا یوں ہی پتا چلتا ہے لیکن منو جی کے دھرم شاستر رامائن مہابھارت اور پرانوں میں ان کا صاف ذکر موجود ہے۔ سری کرشن بھگوت گیتا میں لکھتے ہیں کہ میں نے لوگوں کے اوصاف اور پیشوں کے بموجب چار قومیں بنا دی ہیں۔ اس طریق کی ابتدا کے متعلق یہی خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ تقسیم عمل کے اصول پر لوگوں نے ذات اور فرقے بنا لیئے۔ سپاہی منش اور جنگ جو لوگ تو شتری کہلانے لگے۔ ملکی فتوحات اور قیام امن و امان انھوں نے اپنے ذمے لے لیا۔ ذہین اور پارسا منش لوگ تعلیم اور مذہب کی خدمت میں لگ گئے یہی برہمن شمار ہونے لگے۔ باقی لوگ جو کھیتی باڑی اور کاروبار میں مصروف رہے وہ ویش بنگئے۔ یہاں کے وحشی مفتوحہ اور نیز مخلوط النسل آریا لوگ سب سے نیچ ذات یعنی شودر قرار پائے۔

ذات پات کے طریق میں خاص بات یہ ہے کہ انسان کی معاشرتی حیثیت اور خانگی تعلقات سب کچھ اس کی پیدائش ہی سے قرار پا جاتے ہیں اور اپنی ذاتی کوشش سے وہ ان میں کوئی رد و بدل نہیں کر سکتا۔ اس کا کھانا، پینا، شادی، غمی، سب کام اسی فرقے کے رسم و رواج کے تابع ہیں جس میں اس نے جنم لیا ہو۔

باب ۴ مسلمان

اسلام اپنے پیرووں کو مساوات اور اخوت سکھاتا ہے اور ذات پات کے تفرقوں کا مخالف ہے لیکن ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی ذات پات کی دبا پھیل گئی۔ بعض جگہ تو یہ معاشرتی تفرقے بہت نمایاں ہو چکے ہیں۔

ذات پات کے طریق میں جو خرابیاں ہیں۔ ان سے انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن ساتھ ہی اس میں چند خوبیاں بھی ضرور ہیں۔ جن سے لوگ بے پروائی سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ حالات کے بدلنے سے اس طریق میں ترمیم ضرور ہو رہی ہے۔ خواہ بھلی ہو یا بری۔ اب پیشے سے خواہ مخواہ ذات قرار نہیں پاتی۔ مختلف ذاتوں کے لوگ اب تقریباً ہر پیشے کو اختیار کر لیتے ہیں پہلے کے مقابل ذات پات کے قواعد بھی نرم ہو چلے ہیں۔ اور آج کل کا رجحان تو یہ ہے کہ اس طریق کی جو جو باتیں جدید معاشی نظم کے واسطے ناموزوں ہوں ان کو خارج کر دیا جائے۔

ذات پات کے طریق میں ایک معاشی خاصہ تو یہ ہے کہ ہر قسم کی محنت کی رسد بالکل معین ہو جاتی ہے۔ مسابقت کا میدان بہت تنگ رہ جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یا تو قانون طلب و رسد کا عمل ہوتا ہی نہیں یا وہ تکلیف دہ بنجاتا ہے۔ جب کوئی بڑا معاشی تغیر ہوتا ہے تو جدید حالات کا جو تقضا ہو محنت وہ صورت اختیار نہیں کر سکتی جس کی وجہ سے بعض وقت بڑی مصیبت کا سامنا ہوتا ہے۔ اجرت اور قیمت کبھی کبھی رواج یا دوسری تدبیروں سے مقرر ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ذات پات کا طریق پیدائش بر پیمانۂ کبیر کے واسطے بہت ناموزوں ہے کہ جہاں چھوٹی چھوٹی فروعات تک تقسیم عمل کی نوبت پہنچتی ہے اور جہاں ہر قسم کی محنت کو طلب پر فوراً موجود ہو جانا ضرور ہے۔ ذات پات کی بدولت لوگوں میں نئے نئے حالات کا ساتھ دینے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی اس طریق کا لوگوں کے اطوار پر بھی بہت اثر پڑتا ہے جب پیدائش ہی کے وقت لوگوں کی زندگی کا مسلک قرار پائے اور ان کا پیشہ مقرر ہو جائے تو پھر یہ موقع کہاں کہ لوگ اپنی خداداد استعداد سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں ہر پیشے میں ایسے لوگ پھنسے رہتے ہیں جو کہ اس میں نکمے ہیں لیکن دوسرے پیشوں میں وہ بہت ہوشیار اور ماہر بن سکتے تھے۔ چونکہ سب کو ترقی کا یکساں موقع نہیں ملتا۔ اس طریق کی

بدولت قوم کی بڑی بڑی جماعتوں کے ساتھ اکثر بے انصافی اور ظلم ہوتا رہتا ہے یعنی ذات پات کے بندھن ان کو ترقی سے محروم رکھتے ہیں۔

پس ذات کی پابندی کا ایک برا نتیجہ تو یہ ہے کہ ترقی معیشت میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس میں اسباب معیشت کے لحاظ سے کچھ فائدے بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہر پیشہ ور اپنے والدین سے کام سیکھ لیتا ہے اور بچپن ہی سے جس صنعت یا کاروبار کی آب و ہوا میں پرورش پاتا ہے۔ بلا زحمت اچھی طرح اس کا علم اور ملکہ حاصل کر لیتا ہے۔ اس میں دوسری خوبی یہ ہے کہ مسابقت کے راستے میں مزاحم ہو کر کمزور پیشہ وروں کی حفاظت کرتا ہے بساط معیشت میں ہر کسی کو اپنی اپنی جگہ مل جاتی ہے ناچار اور بے وسیلہ کوئی بھی نہیں رہتا۔

آیا ذات بندی کے فوائد بڑھے ہوئے ہیں یا نقصانات اس کا جواب محض معاشیئین نہیں دے سکتے۔ عام رائے تو یہ ہے کہ نقائص کے مقابل فوائد کا پلہ بھاری ہے۔ لیکن بعض لوگ اسی طریق کو موجودہ معاشی جمود اور سیاسی غلامی کا خاص سبب قرار دیتے ہیں۔

ذات وار جتھے

قدیم زمانے میں ہر ایک ذات والوں میں اُن کی برادری کا ایک جتھا ہوا کرتا تھا۔ گویا ہر ذات میں ایک قسم کا کاروباری جتھا قائم تھا۔ نوجوانوں کی باقاعدہ کار آموزی کا انتظام۔ اجرت کا تعین۔ تجارتی بے عنوانی کی اصلاح اور آپس کے جھگڑوں کا تصفیہ یہ سب کام انھیں جتھوں کی پنچایت کے ہاتھ میں تھا۔

ان جتھوں کا خاص مقصد یہ تھا کہ اپنی اپنی برادری کی باہمی مسابقت کی نگرانی رکھیں۔ اور دوسرے پیشہ وروں کے مقابل اپنی جماعت کے مفاد کی حمایت کریں۔ ان کے فیصلے کی تعمیل برادری کا مجرم قرار پانے یا جرمانے کے دباؤ سے ہوتی تھی۔ انعام کے ذریعے سے یہ جتھے کارکردگی کو ترقی دیتے تھے اور ناراضی کا دباؤ ڈال کر اس کے تنزل کو روکتے تھے۔ باہمی بیمے کا کام بھی انجام دیتے تھے۔ بیکار لوگوں کو کام دلا کر اور غریب محتاجوں کو امداد پہونچا کر انھوں نے قانونِ اہل افلاس کی ضرورت باقی نہیں چھوڑی۔

باب ۲

قدیم و جدید جتھے

ہندوستان کے یہ قدیم جتھے بہت وجوہ سے قرون وسطےٰ کے یورپین جتھوں کے مشابہ تھے۔ لیکن ساتھ ہی ان میں کچھ فرق بھی تھا۔ مثلاً یورپ کے جتھوں میں یہ ضرور نہ تھا کہ ایک ہی ذات یا خاندان کے لوگ جن کے آپس میں بیاہ شادی ہوتی ہو شریک ہوں۔ بلکہ دوسرے باہر کے لوگ بھی کام سیکھ کر اس میں داخل ہو سکتے تھے وہاں خود پیشہ اصلی بنائے اتحاد و تقویت تھا حالانکہ ہندوستان میں انھی پیشوں کی بنا پر اس قدر فرقے بن گئے۔ چنانچہ یورپ کے جتھوں میں بڑھنے اور پھیلنے کی گنجائش تھی۔ لیکن ہندوستان کا یہ طریق سخت پتھر کی لکیر تھا۔ جو جس ذات یا جتھے میں پیدا ہوا اسی کا پابند رہا۔

کسی زمانے میں ہندوستان کے یہی جتھے امور معیشت میں بہت کچھ دخل رکھتے تھے اپنی خوش انتظامی سے انھوں نے بہت کچھ دولت پیدا کی۔ ہندوستانی دیہات کے مشہور آفاق کپڑے انھیں کے اہتمام سے تیار ہوتے تھے۔ جو اس خوبی کو پہنچے اب تو ایسے جتھے ہندوستان میں خال خال نظر آتے ہیں اور جہاں ہیں بھی ان کا وہ پہلا سا اثر باقی نہیں رہا۔ کچھ تجارتی جتھے البتہ موجود ہیں۔ جن کے اغراض و مقاصد بھی وہی ہیں جو قدیم زمانے میں ہر ایک قوم کے جتھوں کے تھے۔ لیکن ان میں یہ قوت نہیں کہ اپنا کام ٹھیک ٹھیک انجام دے سکیں۔ ان کی شرکت خواہ مخواہ کسی ذات یا فرقے کے واسطے مخصوص نہیں۔ پھر بھی اس میں وہ اتحاد کہاں جو دوسرے ملکوں میں نظر آتا ہے۔ بلکہ اس کا نصف بھی میسر نہیں نہ ان کے جذبات و حسیات میں یکرنگی۔ نہ انتظام میں وہ ثبات کہ جس کی بدولت آج یورپ اور امریکہ میں مزدوروں کی متحدہ انجمنیں اس خوبی سے کام کر رہی ہیں۔

مسلمانوں کے جتھے

ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی اپنے تجارتی جتھے بنا رکھے ہیں۔ ان کے اصول تنظیم بھی وہی ہیں جو اہل ہنود کے ہیں۔ لیکن چونکہ مسلمانوں میں ایک جمہوری ولولہ ہے ان کے جتھے ذات پات کے سانچوں میں نہیں ڈھلتے بعض بعض صنعت اور تجارت میں انتظام بہت عمدہ نظر آتا ہے اور ممبروں پر بھی ان کا اچھا خاصا اثر ہے۔

# ۲۔ اشتراک خاندانی

ہندوستان میں کل کا کل خاندان سوسائٹی کا رکن شمار ہوتا ہے نہ کہ ہر فرد واحد اہل ہنود کے ہاں خاندان میں میاں بیوی اور بچوں کے سوا دوسرے رشتہ دار بھی داخل ہیں۔ اس طریق کا خاصہ یہ ہے کہ اہل خاندان کی آمدنی اور خرچ مشترک رہتا ہے۔ ہر فرد کے نفع نقصان میں باقی لوگ بھی شریک ہوتے ہیں۔

ملک مشترک

ہندوؤں کا قانون جائداد مغرب کے قانون سے بالکل مختلف ہے۔ یورپ و امریکہ میں عام طور پر ملکیت منفرد و بلا شرکت و غیر مقید ہوتی ہے ہندوستان میں مشترک جائداد کا قاعدہ ہے۔ مطلق اور غیر مقید ملکیت ملک کے بعض ہی بعض حصوں میں پائی جاتی ہے۔ اور مقاموں میں بہت شاذ ہے۔ قانون جائداد اشتراک خاندان کے طریق پر مبنی ہے اور یہ طریق ہندو معاشرت کی ریڑھ کی ہڈی تھا اور کسی قدر اب بھی ایسا ہی ہے۔

دراصل ہر ہندو خاندان اور اس کی جائداد نہ صرف مشترک بلکہ غیر تقسیم پذیر بھی۔ لیکن اب یہ بات نہیں رہی تاہم جب تک خاندان تقسیم نہ ہو جائداد مشترک ہی مانی جاتی ہے اور ہر ایک فرد اپنے خاندان کی جائداد سے مستفید ہو سکتا ہے۔ اس طریق کا اصول یہ ہے کہ خاندان کے کل افراد اپنے سرگردہ کے تابع ہیں۔ نہ یہ کہ سب کی حیثیت مساوی ہے۔

ہندو قانون کے انواع

ہندو قانون کی جو مختلف انواع ہیں ان کے اصولوں میں بہت کچھ اختلاف نظر آتا ہے۔ متکشرا قانون جو بنگالیوں کے سوا اکثر ہندو طبقوں میں جاری ہے اشتراک خاندانی کا بڑا محافظ اور حامی ہے دیا بھاگ قانون جس کا بنگال میں خاص طور پر رواج ہے اشتراک خاندان کا اس درجہ طرفدار نہیں متکشرا قانون کی رو سے جب تک باقاعدہ تقسیم عمل میں نہ آئے آبائی جائداد سب اراکین خاندان کی مشترک ملک ہے اور سب اس سے مستفید ہو سکتے ہیں جو شخص سرگردہ ہو اس کی حیثیت محض منتظم کی سی ہے۔ نہ وہ خاندانی جائداد فروخت کر سکتا ہے نہ اس کو کسی اور طرح پر علیحدہ کر سکتا ہے۔

البتہ دو صورتوں میں اس کو اختیار ہے۔ یعنی یا تو تمام خاندان کے فائدے کے واسطے یا قانونی ضرورتوں کے واسطے وہ جائداد کے معاملہ کرنے کا مجاز ہے وپابھاگ قانون میں سرگروہ کے اختیارات بہت زیادہ ہیں۔ بلکہ نظائر حال کے مطابق تو وہ خاندانی جائداد کا مالک و مختار ہے۔ اس پر اس کو پورا اختیار حاصل ہے۔ رہی اپنی پیدا کی ہوئی جائداد سو دونوں قانونوں کے مطابق مالک کو اس پر بلا شرکت غیرے پورا حق حاصل ہے۔

اشتراک خاندان کے حسن و قبح

اشتراک خاندان کا طریق ہندوستان میں قرنوں جاری رہ چکا ہے لیکن اب وہ زائل ہو رہا ہے۔ بعض ارباب غور و فکر اس کو بھاگوان باور کرتے ہیں اور بعض اس کو وبال قرار دیتے ہیں۔ ماہر فن کی نظر سے دیکھو تو اس میں خوبیاں بھی ہیں اور نقائص بھی۔ بڑی خوبی تو یہ ہے کہ ہر کسی کو تھوڑی بہت گزر کے قابل معاش مل جاتی ہے اور ترقی معیشت کے واسطے سب سے پہلے اسی کی ضرورت ہے یہ نہیں کہ بچے جبکہ ان کے دماغی اور جسمانی قوے کمزور اور ادھورے ہوں کس مپرسی میں چھوڑ دیئے جائیں۔ بلکہ خاندان والے ان کو سنبھالتے ہیں حتیٰ کہ وہ دنیا میں کام کرنے کے قابل ہو جاویں۔ یہ کیسی فائدہ مند بات ہے بوڑھوں اور ضعیفوں کی بھی خبرگیری کرتے ہیں اور کنبے میں عزیز کرکے رکھتے ہیں۔

لیکن خرابی یہ ہے کہ جب کوشش کئے بغیر وجہ معاش حاصل ہو جاتی ہے تو کام کرنے کا شوق اور ولولہ سرد پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ اکثر لوگ اس طرح کاہل بنجاتے ہیں اور بس دوسروں کے سہارے کام چلاتے ہیں۔ قوت بازو پر بھروسہ کرنے کی عادت جس کے بغیر ترقی معیشت ممکن نہیں۔ کمتر پیدا ہوتی ہے معاشی آزادی جس کی پیدائش دولت میں اس قدر ضرورت ہے۔ بہت محدود رہجاتی ہے خاندان کا بار اس قدر دبا لیتا ہے کہ ہونہار لوگ نئے منصوبوں کی جن میں کچھ خطرہ کا احتمال ہو۔ جرأت نہیں کرسکتے اور ترقی کے واسطے خطروں سے مفر نہیں۔ بس بہت سے لوگ خاندان میں پھنس کر اپنی اعلیٰ استعداد سے پورا پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خاندان کے خرچ کے علاوہ کمائی بھی مشترک

ہوتی ہے۔ سب کے سب مل کر خاندان کے واسطے دولت پیدا کرتے ہیں اس صورت میں مشترک خاندان کے لوگوں کی حالت کسی انجمن اشتراکی یا امداد باہمی کے ارکان کی سی ہوتی ہے اس طرح پر اشتراکی طریق کے فوائد تو بہت سے حاصل ہو جاتے ہیں اور مضرت کم پہنچتی ہے۔ البتہ جہاں یہ حالت ہو کہ چند لوگ تو کمائیں اور باقی سب ملکر کھائیں۔ وہاں نتائج بالکل برعکس پیدا ہوتے ہیں۔

اب اگر نفع اور نقصان کا موازنہ کیا جائے تو بعض حالتوں میں نفع کا پلہ بھاری ہے اور بعض میں نقصان کا۔ پہلے زمانے میں مشترک خاندان کے نظام سے گو فوائد حاصل ہوئے ہوں۔ اب تو اس کا رواج ہر طرف گھٹ رہا ہے۔

اسلامی طریق — مسلمان بھی اپنے کنبہ میں مل جل کر رہتے ہیں۔ لیکن ان میں کوئی اشتراک نہیں مانا جاتا۔ ان میں خاندانی اتحاد اس قدر قوی نہیں ہوتا جتنا کہ ہندوؤں میں ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں یہ طریق اس قدر مستحکم اور سخت نہیں۔ شرع شریف کی رو سے مالک کو اپنی جائداد پر پورا حق ملکیت حاصل ہوتا ہے خواہ وہ جائداد آبائی ہو یا اپنی پیدا کی ہوئی وہ اپنی جائداد کا جس طرح چاہے معاملہ کرے بشرطیکہ اس معاملہ کی تکمیل بھی اس کی زندگی میں ہو جائے۔ صرف وصیت کے معاملہ میں موصی کے اختیارات پر وارثوں کے حقوق کی قید لگی ہوئی ہے۔ یعنی وہ جائداد کے بارہ میں بقدر معین وصیت کر سکتا ہے۔ باقی جائداد ہر حال میں وارثوں کی ملک ہے۔

## (۲) قوانین وراثت

وراثت — غیر منقسم ہندو خاندان میں جہاں متکشرا قانون چلتا ہو سچ پوچھو تو کوئی وراثت عمل میں نہیں آتی ایسے خاندان کی کل جماعت گویا ایک مستقل انجمن ہے کسی ایک رکن کے فوت ہونے سے جائداد باقی ارکان کی ملک بنی رہتی ہے۔ لیکن وراثت کے طور پر نہیں بلکہ پس ماندہ ہونے کے لحاظ سے وراثت پر اس وقت عمل ہوتا ہے جبکہ جائداد جدا گانہ ہو۔ البتہ دیا بھاگ قانون کے

مطابق جائداد مشترکہ میں بھی وراثت چلتی ہے۔ کل جائداد خاندان کے بال بچوں کو مل جاتی ہے وہ نہوں تو پھر دوسرے قرابتداروں کو۔

تقسیم جائداد

مسلمانوں میں مالک کی وفات کے بعد جائداد بہت سے ورثا میں تقسیم ہوتی ہے۔ بیٹوں کے ہوتے ہوئے بھی اکثر قرابت داروں کو حصہ مل جاتا ہے قانون وراثت فرزند اکبر ہندوستان میں کہیں رائج نہیں سوائے رئیسوں اور راجاؤں کے خاندانوں کے۔ یا معدودے چند دیگر خاندانوں کے جن میں خاص طور پر مدت سے اس کا عمل چلا آتا ہے۔ پس ہندو اور مسلمانوں، دونوں کے قانون وراثت کے بموجب جائداد منقولہ وغیر منقولہ متعدد لوگوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ بس یہ نہیں ہونے پاتا کہ چند لوگوں کے پاس بہت زیادہ دولت جمع ہو جائے۔ بلکہ زیادہ لوگ تھوڑی تھوڑی دولت سے مستفید ہوتے رہتے ہیں۔ یہ قانون اعلیٰ اور ادنیٰ طبقوں کا فرق مٹا مٹا کر متوسط طبقوں میں اضافہ کرتا ہے یہ طریق ایک لحاظ سے صنعتی اور کاروباری ترقی کے واسطے بہت موزوں ہے۔ ہر کسی کو کام شروع کرنے کے واسطے کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔ اور چونکہ بالعموم اس کی مقدار اس قدر زیادہ نہیں ہوتی کہ ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر لوگ آرام سے بسر کر سکیں بس اپنی حیثیت کے مطابق زندگی کا سامان مہیا کرنے کے واسطے وہ جدو جہد اور کوشش بھی کرتے رہتے ہیں۔ خودداری جڑ پکڑتی ہے۔ آپ اپنی اپنی امداد کرنے اور اپنے اوپر بھروسہ کرنے کی خوبیاں لوگوں میں پیدا ہوتی ہیں لیکن ساتھ ہی اصل کے یکجا فراہم نہ ہونے سے پیدائش بر پیمانہ کبیر میں رکاوٹ پیش آتی خصوصاً ایسے ملک میں جہاں مشترک سرمایہ دار کارخانوں اور محدود کمپنیوں کا رواج نہ ہو اصل کے منتشر رہنے سے صنعتی ترقی رکی رہتی ہے۔

## ۴ - دیہات کا طریق

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ ہندوستان کی بیشتر آبادی دیہاتی ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ لوگوں کو شہر اور قصبے بسانے نہیں آئے بلکہ عام پیشہ زراعت

رہ گیا ہے اور اس کی ضرورت سے دیہات میں رہنا پڑتا ہے۔

دیہاتی برادریاں

بہت قدیم زمانے سے حکومت کی سب سے چھوٹی تقسیم گاؤں ہی شمار ہوتا ہے۔ دوسرے ملکوں کی طرح یہاں بھی قدیم زمانے میں لوگ اچھی طرح حفاظت اور باہمی امداد کی ضرورت سے دیہات میں بس پڑے۔ لیکن ہندوستان میں یہ عجیب بات ہے کہ بہت سے حصوں میں دیہاتی برادریوں کا طریق پھیل گیا اور صدہا برس تک قائم رہا۔ سر چارلس مٹکاف نے ان برادریوں کا بہت اچھی طرح حال لکھا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ یہ دیہاتی برادریاں گویا چھوٹے چھوٹے جمہورے ہیں اور ان میں اپنی ضرورت کی کل باتیں موجود ہیں۔ اور وہ بیرونی تعلقات سے بالکل الگ تھلگ ہیں۔ خواہ کوئی اور چیز برقرار رہے یا نہ رہے لیکن یہ برابر قایم ہیں شاہی خاندانوں کا خاتمہ ہو گیا۔ انقلاب پر انقلاب آئے۔ ہندو، پٹھان، مغل، مرہٹے، سکھ اور انگریز سب باری باری سے ہندوستان کے مالک بنے لیکن دیہاتی برادریاں ویسی کی ویسی ہی قائم ہیں۔

۱۸۱۹ء میں الفنسٹن صاحب نے احاطہ بمبئی کے متعلق یہ تحریر فرمایا تھا کہ ان دیہاتی برادریوں کا انتظام اس قدر مستحکم اور عمدہ ہے کہ اگر حکومت کا سایہ بھی ان کے سر سے اٹھ جائے تو یہ اپنی حفاظت آپ کر سکتی ہیں۔ سر چارلس مٹکاف نے بھی ان کی تعریف میں لکھا ہے کہ بڑے بڑے نازک وقت آئے لیکن ان برادریوں نے لوگوں کو تباہی سے بچا لیا انھیں کی بدولت دیہاتیوں کی زندگی بہت لطف سے گزرتی ہے اور ان کو بہت کچھ آزادی اور اختیار حاصل ہے۔ ۱۸۱۲ء کی مدراس والی رپورٹ میں درج ہے کہ خدا جانے کس زمانے سے دیہات میں یہ سادہ حکومت بلا بدیہ جاری ہے سلطنت کے الٹ پلٹ اور ٹوٹ پھوٹ سے ان کو کچھ سروکار نہیں وہ تو اپنی دیہاتی برادری کی حکومت میں بآزادی خوش و خرم رہتے ہیں۔

دیہات

اگرچہ دیہاتی برادریوں کو بہت زوال ہوا پھر بھی وہ باقی ہیں بالکل خاتمہ نہیں ہوا۔ ہندوستان کے اکثر حصوں میں اور بالخصوص مدراس و پنجاب

میں ان کی حالت کم و بیش مکمل نظر آتی ہے۔ شمالی ہندوستان میں اکثر دیہات کے گرداگرد دیوار کھنچی رہتی ہے اور لوگ اس کے اندر میل ملاپ سے رہتے ہیں۔ آبادی کے قرب و جوار میں مزروعہ رقبہ اور چراگاہ رہتی ہے۔ ان زمینوں اور مکانوں کا مجموعی نام گاؤں ہے۔ اس کی ملکیت دست بدست منتقل ہوا کرے۔ لیکن گاؤں اپنی ایک ہی شکل و حالت پر قائم رہتا ہے۔

دیہاتی برادریوں کی ابتدا اس وقت ہوئی ہوگی جبکہ کچھ لوگ مل ملاکر جنگل صاف کرتے تھے تاکہ زمین کاشت کرسکیں۔ اور وحشی جانوروں اور ہمسایہ دشمنوں کے مقابل بغرض حفاظت آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے لیکن دیہاتی زمیندار اور کاشتکاروں میں جو اتحاد قائم ہے اس کے متعدد اسباب ہیں۔ کچھ مادی، کچھ معاشرتی، اور معاشی،

دیہات کی دو قسمیں ہیں۔ رعیتواری، اور زمینداری، پہلی قسم کے گاؤں میں لوگوں کے پاس کچھ زمینیں ہوتی ہیں۔ جن کو یا تو وہ خود کاشت کرتے ہیں یا کسی اسامی کو اٹھا دیتے ہیں۔ یہ سب زمینیں جداگانہ قطعے شمار ہوتی ہیں یہ نہیں کہ کل رقبہ سب کی مشترک ملک ہو اور یہ زمینیں اس کے حصے ہوں۔ ہر زمین والے کے اغراض و مفاد بھی جدا جدا ہیں۔ ان کے باہمی اتحاد کی بنا ہے تو یہ ہے کہ سب ایک بستی میں رہتے ہیں گاؤں کا مقدم ایک ہے۔ اور دیہات کے وہی دستکار اور ادنیٰ خدمت گزار سب کا کام کرتے ہیں۔ مدراس، بمبئی، متوسط ہند، اور برار میں اس قسم کے دیہات بہت ہیں۔ کبھی صوبۂ متوسط اور بنگال میں بھی موجود تھے۔

زمینداری دیہات میں جو لوگ کاشت کرتے ہیں ان کی زمینیں جداگانہ قطعے شمار نہیں ہوتیں۔ بلکہ گاؤں کے مجموعی رقبے کے حصے ہوتی ہیں اور کل رقبہ کسی فرد واحد یا خاندان کی ملک ہوتا ہے اور اس کے حقوق کاشتکار کے حقوق سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں ہر گاؤں میں زمینداروں کی جماعت بالعموم ایک ہی خاندان کی نسل ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض دیہات میں بہت سے حصہ دار ہوتے ہیں۔ یہ لوگ خود تو شاذونادر کاشت کرتے ہیں۔ بلکہ اکثر زمین اسامیوں کی

## نظمِ معاشرت

اٹھا دیتے ہیں جو لگان دیکر کھیتی باڑی کرتے ہیں -

اصول مشارکت

زمین کو حصہ داروں میں تقسیم کرنے کے تین اصول ہیں - اول تو قدیم خاندانی حصہ داری کا طریق جس کو بٹی داری بھی کہتے ہیں - اس کے بموجب ہر حصہ دار اپنی خاندانی حیثیت کے مطابق کل میں سے اپنا حصہ لے لیتا ہے جس طرح کہ خاندان کے ہر رکن کا حصہ ہندو قانون یا شرع شریف میں مقرر ہے دوسرے کسی خاص رواج کے مطابق تقسیم کرنا - مثلاً برابر برابر حصے لینا - اس طریق کو بھائی چارہ کہتے ہیں - حصے کبھی ہلوں کے حساب سے اور کبھی کنوؤں کے حساب سے بھی مقرر ہوتے ہیں - تیسرا طریق یہ کہ جس قدر زمین جس کے پاس ہو وہی اس کا حصہ سمجھا جاوے صوبۂ متحدہ پنجاب اور سرحدی صوبہ میں زمینداری دیہات بہت ملتے ہیں -

زمینداری دیہات تین طرح پر وجود میں آئے - اول تو ممکن ہے کہ افراد نے ان کو آباد کیا ہو یا وہ کسی کو ہبہ کئے گئے ہوں - یا مالگزاری کے تحصیل کرنے والوں نے ان کو اپنا بنا لیا ہو - دوسرے ممکن ہے کہ حکمراں گھرانوں میں ٹوٹ پھوٹ ہونے کے بعد گاؤں زمینداری بن گئے ہوں - یا تیسری صورت یہ ہے کہ کسی خیل کے بزرگوں نے ان کو بسایا ہو جیسا کہ جاٹ اور راجپوتوں کا قاعدہ تھا -

دیہاتی عہدہ دار

ہر رعیتواری گاؤں میں ایک سرکاری سرگروہ رہتا ہے جس کو پٹیل منڈل یا ریڈی کہتے ہیں اس کا عہدہ ہمیشہ سے بہت ضروری سمجھا جاتا ہے اسکو خفیف سے فوجداری اختیارات بھی حاصل ہوتے ہیں اور بحیثیت منصف دیوانی یا بحیثیت سرپنچ چھوٹے چھوٹے معاملات بھی فیصل کرتا ہے گاؤں کی تمام بہبودی کے مختلف کام بھی وہی انجام دیتا ہے - لیکن اپنی زمین کے سوا وہ باقی زمینوں کی مالگزاری کا ذمہ دار نہیں اس کا عہدہ موروثی ہوتا ہے اور خدمات کے صلے میں اس کے پاس ایک قطعہ بطور عطیہ رہتا ہے - زمینداری دیہات میں گاؤں کا انتظام ایک پنچایت کے سپرد رہتا ہے - گاؤں کا سرگروہ اس کا صدر شمار ہوتا ہے اسی کو نمبردار کہتے ہیں - کل گاؤں کی مالگزاری کا وہی ذمہ دار ہوتا ہے، نمبردار

بعض بڑے بڑے دیہات میں دو تین لمبردار رہتے ہیں۔
گاؤں کا دوسرا عہدہ دار جو محاسب کا کام کرتا ہے پٹواری کہلاتا ہے۔ اس کے ذمہ بھی بہت سے ضروری کام رہتے ہیں۔ زمیندار اور حصہ دار جو مالگزاری داخل کرتے ہیں اور جو ان پر بقایا رہتی ہے کاشتکار جیسے لگان ادا کرتے ہیں اور گاؤں کے عام اخراجات کی مد میں جو کچھ وصول ہوتا ہے۔ یہ سب حسابات پٹواری تیار کرتا ہے نیز گاؤں کے نقشے۔ کھیوٹ۔ کھتونی جن میں زمینوں کے متعلق حقوق۔ حصے اور دیگر ضروری حالات بالتفصیل درج رہتے ہیں۔ پٹواری پیش کرتا ہے۔ مزروعہ فصلوں۔ مویشی اور دوسری چیزوں کے متعلق بھی اعداد وشمار کی خانہ پری وہی کرتا ہے۔ ملکیت اراضی میں جو جو تبدیلیاں ہوتی ہیں انکی یادداشت بھی وہی بناتا ہے۔ اور اگر گاؤں میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آئے تو وہی تحصیل میں خبر دیتا ہے لمبردار اور پٹواری کے علاوہ ہر گاؤں میں ایک دو چوکیدار رہتے ہیں اور بعض میں دو ایک چھوٹے چھوٹے عہدہ دار بھی۔

دیہات کی معاشی زندگی

زیادہ زمانہ نہیں گزرا جبکہ ہر گاؤں ایک صنعتی خطہ تھا اور اس میں سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اپنی سب ضروریات خود ہی مہیا کرتا تھا۔ باہر سے بہت کم چیزیں منگائی پڑتی تھیں۔ بیشتر لوگ زراعت پیشہ ہیں۔ کاشتکار یا تو براہ راست سرکار سے یا زمیندار سے پٹے پر زمین لیتے ہیں اور لگان ادا کرتے ہیں وہ اپنے کنبے کی مدد سے کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ کبھی کبھی مزدور بھی رکھ لیتے ہیں جو تھوڑا بہت روپیہ اصل کے لیے درکار ہوتا ہے وہ یا تو اپنے اندوختہ سے نکالتے ہیں۔ یا زمیندار یا ساہوکار سے قرض لے لیتے ہیں۔ وہ خود ہی اپنے کھیتوں کے منتظم ہیں خود ہی آجر ہیں اور خود ہی اپنے کام کے ماہر ہفتے میں دو ایک بار تھوڑا سا مال بازار لیجاتے ہیں اور دوسری چیزیں خرید لاتے ہیں۔

دیہاتی طبقے

زمیندار اور کاشتکار کے علاوہ گاؤں میں ایک تیسرا طبقہ اور بھی رہتا ہے جس میں دستکار لوگ شامل ہیں۔ جولاہے۔ لوہار۔ تیلی۔ اور سنار۔ گاؤں کی چھوٹی سی بستی کی ضرورتیں بس انہیں سے پوری ہو جاتی ہیں۔ اور دیہاتی برادری کے یہ بھی خاص رکن مانے جاتے ہیں۔ مختلف چیزوں کے مبادلے

کا کام ایک ٹٹو بنجارہ کا ندارا نجام دیتا رہتا ہے۔ ساہوکار قرضہ دینے کے علاوہ اور کام بھی کرتا ہے۔ بالخصوص غلے کی تھوک فروشی اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے اپنی مالی حیثیت کی وجہ سے گاؤں میں وہ بہت بڑا آدمی شمار ہوتا ہے۔

دستکاروں وغیرہ کو کام کی اجرت میں روپے پیسے کے بجائے مختلف سامان مثلاً غلہ وغیرہ دیا جاتا تھا اور اس کا تھوڑا سا رواج اب بھی باقی ہے۔ دیہات کی طرزِ معیشت میں بیرونی مقامات سے مسابقت کرنے کی بہت کم نوبت آتی ہے۔ البتہ گاؤں کے اندر اندر لوگ قدرتاً ذاتی منفعت کی خواہش سے زیادہ نفع کے متلاشی رہتے ہیں۔ اجرت اور منافع کا تقرر بیشتر رسم و رواج پر منحصر ہے اسی وجہ سے اُن کی شرح معین سی رہتی ہے اور بآسانی تبدیل نہیں ہوتی۔ تقسیمِ عمل کا طریق بھی اختیار کیا جاتا ہے لیکن چونکہ اس کا بیشتر دار مدار بازار کی وسعت پر ہے اس لئے گاؤں میں اس کی زیادہ گنجائش نہیں، محنت منتقل نہیں ہوتی یعنی مزدور گاؤں سے باہر جانا بہت کم پسند کرتے ہیں اور گاؤں میں جو تھوڑا بہت روپیہ اصل کا ہوتا ہے وہ زمین میں مقید ہے۔

گاؤں کے مختلف طبقے خوب سمجھتے ہیں کہ ہر ایک دوسروں کی مدد کا محتاج ہے اور ہر ایک کا مفاد دوسروں کے مفاد سے وابستہ ہے۔ اس طرح گاؤں میں بہت اتفاق اور اتحاد پیدا ہو جاتا ہے جس سے اس میں خوش حالی رہتی ہے۔

دیہاتی زندگی

دیہات کی زندگی بہت سادہ ہوتی ہے۔ اگر فصل اچھی ہوئی تو بس فراغت اور اطمینان ہے گاؤں میں بھلا اور دولت ہی کیا ہے۔ لیکن ایک فائدہ بھی ہے وہ یہ کہ اصل کی کثرت سے جو خرابیاں پھیل جاتی ہیں ان کا وہاں پتہ بھی نہیں کاشتکار اور دستکار قصباتی زندگی کے عیش و عشرت کو بھلا کیا جانیں اور وہ اس کی پروا بھی نہیں کرتے انکا عقیدہ تو یہ ہے اور بالکل صحیح ہے کہ اس دنیا کی چیزوں سے بڑھکر بھی کچھ چیزیں ہیں اور اپنے مذہب اور روایات کی رہنمائی سے وہ ان چیزوں کو بھی حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

دیہات کے قدیم طور و طریق تو یہ تھے۔ لیکن اب وہ ہندوستان کے کسی حصّے میں بھی پورے پورے نظر نہیں آتے۔ آج کل ملک کی معاشی حالت میں بڑا

انقلاب ہو رہا ہے اور جوں جوں حالات بدلتے ہیں دیہات بھی ان کا ساتھ دیتے ہیں۔ مغربی تہذیب سے جو سابقہ پڑا تو دیہاتیوں کے خیالات اور تخیلات بھی رنگ بدل رہے ہیں اور اب قدیم طرز کی سادہ زندگی بسر کرنی ان کے واسطے بھی محال ہے۔

## ۵۔ حیثیت اور رواج

رواج کا اثر

ہندو لوگ اپنی حیثیت ماں کے پیٹ سے ساتھ لاتے ہیں۔ خاندان اور سوسائٹی میں وہی پیدائشی حیثیت مستند مانی جاتی ہے اور اسی کے مطابق ہر ایک کا دَورِ زندگی قرار پاتا ہے۔ پہلے زمانے میں زندگی کے کل کام اور تعلقات مطلقاً رواج کے تابع تھے اب البتہ رواج کا اثر روز بروز گھٹ رہا ہے دوسرے ترقی یافتہ ممالک کی طرح عام رجحان یہ ہے کہ پیدائشی حیثیت پر ذاتی معاہدہ غالب رہے یعنی حیثیت میں تو انسان کو کوئی دخل نہیں ملتا البتہ معاہدہ اس کا اختیاری ہے۔ پھر بھی عام طور پر ہندوستان میں آزادانہ مسابقت کے بجائے رسم و رواج زیادہ چلتے ہیں۔ چنانچہ مسٹر رانا ڈے کا قول ہے کہ نہ تو آزادانہ مسابقت کی خواہش ہے اور نہ سلیقہ۔ البتہ چھوٹے چھوٹے محدود فرقوں میں کچھ یوں ہی سی جاری ہے۔ مسابقت کی بہ نسبت رواج اور سرکاری قوانین بہت زیادہ دخیل ہیں اور حیثیت کا اثر معاہدے سے کہیں بڑھا ہوا ہے۔ لیکن ہماری رائے میں رواج کا اثر سراسر مضر بھی نہیں ہے بلکہ جہاں تک رواج طاقتور کے مقابل کمزور کی حمایت کرتا ہے۔ فیض رساں ہے۔ مسابقت کا تو یہ خاصہ ہے کہ قوی کو قوی تر بناتا ہے اور کمزور کو مٹا دیتا ہے۔ رواج کا اصول دوسرا ہے وہ دست درازی کو روکتا ہے ساتھ اس کے مسابقت میں یہ خوبی ہے کہ انسان کے بہترین جوہر کو جلا دیتی ہے۔ اور قدرت کی بہترین اشیاء ڈھونڈھ نکالتی ہے۔ حالانکہ رواج ایسی ترقی کا مانع ہے۔ ہندو اور مسلمان بادشاہوں کے عہد میں اور نیز برطانوی حکومت کے شروع شروع میں زمینوں کا لگان رواج کے مطابق مقرر ہوتا تھا۔ اس کے بعد البتہ مسابقت کا زور شروع ہوا سرکار کو محسوس ہوا کہ

آزادانہ مسابقت کا نتیجہ عوام کے حق میں بہت مضر ہوگا۔ اور بڑی مصیبت پھیلے گی پس سرکار نے مسابقت کی کچھ مناسب حدیں مقرر کردیں اور قانون لگان کا خاص منشا یہی قرار پایا کہ کاشتکاروں کے حقوق قدیم رواج کے موافق بحال رہیں اس طرح سے ہندوستان میں اب تک لگان کا بہت کچھ دارومدار رواج پر ہے ریکارڈو صاحب کا مسئلہ لگان ہندوستان سے مطابقت نہیں رکھتا۔ پس اسکا نتیجہ بھی جو نکالا گیا ہے ہندوستان پر منطبق نہیں ہوتا۔ وہ نتیجہ یہ ہے کہ لگان زرعی پیداوار کی قیمت کا کوئی جزو نہیں ہے ۔

اجرت گزشتہ صدی کے وسط تک اجرت بھی رواج کے تابع تھی لیکن اب اسپر مسابقت کا اثر زیادہ ہے تاہم ابھی یہ اس درجہ تغیر پذیر نہیں ہوئی ہے جتنی کہ یورپ اور امریکہ میں ہے کہ ذرا ذرا سے تغیرات سے اجرت میں فرق پڑ جاتا ہے۔ یہاں بھی شرح اجرت میں کمی بیشی ہوتی ہے مگر خفیف سی۔ اور تھوڑے تھوڑے حصوں تک محدود رہتی ہے قصبات میں چونکہ محنت کی طلب بہت بڑھی ہوئی ہے۔ وہاں تو اجرت پر مسابقت کا اثر پڑ گیا ہے۔ البتہ دیہات میں خصوصاً جو دور افتادہ ہیں اجرت اب تک رواج کے ہاتھ ہے۔ یہ معاشی قانون کہ محنت کی طلب و رسد سے اجرت قرار پاتی ہے۔ ہندوستان میں بھی اسی قدر صحیح ہے جس قدر کہ اور کہیں لیکن یہاں اس کا حلقۂ عمل بہت محدود ہے ۔

قیمت کسی زمانے میں قیمتیں بھی رواج سے مقرر ہوتی تھیں لیکن اب وہ قانون طلب و رسد کے عمل سے قرار پاتی ہیں البتہ دور افتادہ دیہات میں جہاں آمد و رفت کم ہے اب بھی قیمتوں پر رواج کا کم و بیش اثر باقی ہے ۔

# پانچواں باب

## پیدائش دولت

### ۱ - عام حالات

زمین

عاملین پیدائش میں قدرتی ذرائع سب سے زیادہ اہم ہیں جیسا کہ اوپر واضح ہو چکا ہے - ہندوستان میں ایسے ذرائع کی کوئی کمی نہیں زرخیز زمین بکثرت موجود ہے اور معدنیات بھی جا بجا بکھری پڑی ہیں - زمین کی پیداوار زیادہ تر بارش کی محتاج ہے - یہ البتہ ایک دقت ہے کیونکہ بارش کا بھروسہ نہیں ہو سکتا - زمین لکھوکھا چھوٹے چھوٹے حصوں میں منقسم ہے اور بے شمار کاشتکار اس میں کھیتی باڑی کرتے ہیں - تقریباً جس قدر زمینیں زیر کاشت ہیں ان پر لگان مقرر ہے واضح ہو کہ بے لگان زمینوں کی حد اکثر ممالک میں نمایاں اور معین نظر نہیں آتی - عملی طور پر بے لگان زمین کا مفروضہ انہی ممالک پر صادق آتا ہے جہاں کاشتکاروں کے علاوہ زمینداروں کے باہم مسابقت پورے زور سے جاری ہو اور جہاں زمین کی رسد ختم ہو چکی ہو - بالفاظ دیگر ایسے ہی مقامات میں ایسی زمینیں ملتی ہیں - جن سے کوئی لگان حاصل نہیں ہوتا ہندوستان کے غیر آباد حصوں میں گو اب تک بہت سی افتادہ زمین موجود ہے - تاہم آباد حصوں میں چپہ بھر حاصل خیز زمین خالی نہیں ملتی -

محنت

صنعتی مرکزوں کے علاوہ ہر جگہ مزدوروں کی کثرت ہے - شرح اجرت بہت ادنیٰ ہے - لیکن چونکہ مزدور جاہل اور بے ہنر ہیں ان سے کام بھی معمولی سا اور تھوڑا ہوتا ہے - پس محنت کو ارزاں نہیں کہہ سکتے مزدوروں میں نقل و حرکت مکانی بھی بہت بے قاعدہ رہتی ہے اور ایک پیشے کو چھوڑ کر دوسرا

اختیار کرنا تو بہت شاذ ہے۔ مسابقت جب واقع ہوتی ہے تو مزدوروں کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔ مزدوری یوں تو مستعد مشقت پسند اور متین ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی غریب پست حوصلہ اور کم ہمت بھی ہے۔ قدرتاً وہ تیز فہم واقع ہوا ہے۔ چنانچہ سر جان اسٹریچی کا قول ہے کہ ہندوستانی کاشتکار ذہانت میں ممالک یورپ کے کاشتکاروں سے کسی طرح کم نہیں۔ لیکن اسے تعلیم نہیں ملی کہ اپنی خداداد ذہانت سے کام لے سکتا۔ مفلس ہونے کے علاوہ وہ اکثر قرضدار بھی رہتا ہے وہ بالعموم اپنے طور پر کام کرتا ہے۔ پس اصل دار اور منتظم کے کام بھی اسی کو انجام دینے پڑتے ہیں حالانکہ اس میں اتنی قابلیت نہیں ہوتی۔ سوسائٹی کے اعلیٰ طبقے مزدوروں کی قدر و وقعت نہیں سمجھتے۔ محنت میں تقسیم و تفریق کا رواج بہت محدود ہے بالعموم ایک ہی شخص متعدد کام انجام دیتا ہے۔

دیسی اصل نہ صرف مقدار میں کم ہے بلکہ شرمایا ہوا بھی ہے یعنی لوگ اپنے اندوختوں کو بطور اصل کاروبار میں لگانا بہت کم پسند کرتے ہیں غالباً اسکی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اٹھارویں صدی میں جو بہت زیادہ بدامنی رہی تو دولت کے جمع کرنے اور معاشی ترقی سے لوگوں کا دل ہٹ گیا۔ کہیں دولت ہے بھی تو یہ حوصلہ نہیں کہ اس کو کاروبار میں لگائیں۔ کیونکہ اصل دار خطرے سے بچتے ہیں حالانکہ ترقی میں خطرے سے مفر نہیں ہو سکتا۔ دوسرے ان کو مستقبل کا اندازہ کرنا بھی نہیں آتا اور اس کے بغیر کاروبار دشوار ہے۔

**تنظیم**

جدید صنعتوں کی ترقی کا سب سے بڑا راز کاروبار کی اعلیٰ تنظیم ہے۔ اور ہندوستان میں ابھی لوگ اس سے بہت کم واقف ہیں عملی تجربہ جو بطریق احسن کاروبار چلانا سکھاتا ہے ابھی تک حاصل نہ ہو سکا کہ ہندوستانیوں میں بڑے بڑے کارخانوں اور دکانوں کا انتظام کرنے اور اس زمانے کے آجروں کو اہم فرائض انجام دینے کی قابلیت پیدا ہو سکتی۔ صنعتی تعلیم اور تجارتی معلومات کے ساتھ اب تک جس قدر بے اعتنائی برتی گئی وہ قابل افسوس ہے ابھی تک امداد باہمی اور اتحاد کے فوائد محسوس نہیں ہوئے۔ اعلیٰ درجے کے قابل اور باوضع لوگ شاذ و نادر کاروبار میں قدم رکھتے ہیں اور معمولی لوگ جو کاروبار چلاتے

باب۳ ہیں کافی اعتماد اور اعتبار پیدا نہیں کر سکتے حالانکہ یہی دو چیزیں جدید صنعتی ترقی کی روح رواں بنی ہوئی ہیں۔ یہی وہ خاص قوتیں ہیں جو باوجود اعلےٰ قدرتی ذرائع کے موجود ہوتے پیدائش دولت کی رفتار تیز نہیں ہونے دیتیں۔ دوسرے مہذب ممالک کے مقابل یہاں کی سالانہ پیداوار کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ ملک میں مرفہ الحالی بہت کم ہے۔ بعض لوگوں کا تو خیال ہے کہ متوسط طبقوں کی مالی حالت پہلے سے بھی زیادہ سقیم ہے اور غریب لوگ تو سال بھر جوں توں کر کے زندگی تیر کرتے ہیں بہت بڑی جماعت ایسی ہے کہ اس کو کبھی نقرئی سکہ پاس رکھنا نصیب نہیں ہوتا۔

اوسط پیداوار کھیت کی پیداوار کا اوسط فی کس چالیس روپیہ سالانہ اندازہ کیا جاتا ہے سر رابرٹ گفن اور سر پیٹرک پلیفیر سے سربرآوردہ اور ماہر انگریزوں نے یہاں کی سالانہ آمدنی دو پونڈ یعنی تیس روپیہ فی کس تخمینہ کی ہے اور مسٹر ولیم ڈگبی اور مسٹر دادا بھائی نارو جی کا اندازہ اس سے بھی کم ہے۔ اگر معمولی کاشتکار اور مزدور کی اوسط آمدنی دریافت کرنی ہو تو خوشحال طبقوں کی آمدنی کو مجموعی قومی آمدنی میں سے منہا کر دیا جائے جو کچھ باقی بچے وہ عام لوگوں کی آمدنی ہے اس طرح سے جماعت کثیر کی سالانہ آمدنی کا اوسط صرف ۱۸ شلنگ یعنی چودہ روپیے فی کس رہجاتا ہے۔ دوسرے مہذب ممالک کے مقابل ہندوستان کی آمدنی بہت ہی کم ہے آج سے بیس سال پہلے مل صاحب کے تخمینے کے بموجب انگلستان کی سالانہ آمدنی ۲۷ پونڈ فی کس تھی یعنی ہندوستان کی موجودہ آمدنی کی ساڑھے اٹھارہ گنی۔ اسی طرح ریاستہائے متحدہ امریکہ کی سالانہ آمدنی ۳۹ پونڈ فی کس تھی۔ فرانس کی ۲۷٫۸ پونڈ اور جرمنی کی ۲۲٫۳ پونڈ۔ اور بیس سال کے اندر اب تو ان ممالک کی آمدنی کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ سلطنت متحدہ کی موجودہ سالانہ آمدنی خود بقول مسٹر لائڈ جارج حال وزیر انگلستان ۵۲ پونڈ فی کس ہے۔ یعنی ہندوستان کی آمدنی سے پچیس گنا زیادہ اور ہندوستان کی آمدنی میں اضافے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

دولت ہندوستان کی دولت کے معتبر اعداد و شمار تو ملتے نہیں تاہم اس کا اوسط

۱۰ پونڈ سے لیکر بیس پونڈ فی کس تک تخمینہ کیا جاتا ہے یعنی ڈیڑھ سو سے تین سو روپے تک سلطنت متحدہ کی دولت کا اوسط ۲۳۴ پونڈ فی کس پڑتا ہے۔ فرانس کا ۲۵۲ پونڈ۔ ریاستہائے متحدہ کا ۲۷۰ پونڈ اور جرمنی کا ۲۴۶ پونڈ سنہ ۱۹۰۳ء میں مختلف ملکوں کی مجموعی دولت کا تخمینہ حسب ذیل تھا۔

| | پونڈ |
|---|---|
| امریکہ | اٹھارہ ارب |
| جرمن | سولہ ارب |
| انگلستان | پندرہ ارب |
| فرانس (بعد منہائی دولت عامہ) | نو ارب |
| ہندوستان | تین ارب |

تخمینہ کیا گیا ہے کہ جرمنی کی دولت پچاس ساٹھ کرور پونڈ سالانہ بڑھتی رہی ہے اور اسکی موجودہ مقدار میں ارب سے کم نہیں۔

**ہندوستان کا مستقبل**

ہندوستان کی جو مالی حالت اوپر بیان ہوئی وہ بیشک بہت افسوسناک ہے لیکن آیندہ کے واسطے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر لوگ پورے استقلال اور تندہی سے کوشش کریں تو یقیناً یہاں کی معاشی حالت کا یا پلٹ ہو سکتی ہے بلکہ قرائن کہہ رہے ہیں کہ بہتر زمانہ آنے والا ہے لوگوں کی سست عملی اوپر بیان ہوئی وہ پیدائشی اور فطری نہیں ہے بلکہ نامساعد حالات سے پیدا ہو گئی ہے۔ اور حالت کو درست کرنے کی کوشش ہر طرف جاری ہے۔ صنعتی ترقی کا ولولہ پھیل رہا ہے۔ کاروبار میں اولوالعزمیاں نمودار ہو چلی ہیں۔ مزدوری پیشہ لوگ خواب غفلت سے بیدار ہو چکے ہیں اور جہالت کی تاریکی سے باہر نکلنا چاہتے ہیں۔ اصل بھی اب پہلا سا شرمیلا نہیں رہا۔ گویا لوگوں میں شغل اصل یعنی اصل سے کام لینے کا رواج بڑھ رہا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ لوگ نئے اور پرزور صنعتی دور کی تیاریاں کر رہے ہیں خدا راس لائے۔

**خلاصہ**

جہاں تک پیدائش دولت کا تعلق ہے۔ معاشی حالت یہ ہے کہ ہندوستان میں اضافہ پیداوار کی بہت گنجائش موجود ہے۔ قدرتی ذرائع کی کثرت ہے اور ارزاں محنت بافراط دستیاب ہو سکتی ہے۔ البتہ یہاں اصل اولوالعزمی اور تنظیم

کی بہت کمی ہے لیکن یہ نقص ایسے ہیں جو بخوبی رفع ہو سکتے ہیں اور ان کو رفع کرنے کی کوشش پہلے سے جاری ہے۔

## ۲- زراعت اور صنعت کا مقابلہ

ملک کے زراعتی اور صنعتی حالات مفصل طور پر بیان کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایسے دو ملکوں کی خصوصیات کا مقابلہ کیا جائے جن میں سے ایک خاص طور پر زراعتی اور دوسرا خاص طور پر صنعتی ہے۔ دونوں کی خصوصیات مختصراً حسب ذیل ہیں۔

(ا) جس ملک کا خاص پیشہ زراعت ہو وہاں مسابقت یا کاروباری آزادی پورے طور پر جاگزیں نہیں ہو سکتی حالانکہ یہ چیزیں جدید صنعتوں کی خصوصیات میں داخل ہیں۔ کاشتکار کو اپنے کام کی خاطر زمین کے پاس رہنا پڑتا ہے حالانکہ صناع لوگ خام پیداوار باہر سے منگاتے ہیں اور اپنے گھر بیٹھکر مصنوعات تیار کر لیتے ہیں۔

(ب) کاشتکار بہت کچھ قدرت کے دست نگر رہتے ہیں ان کو اپنا کام موسم کے مناسب حال رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن صناع کو اس لحاظ سے بہت کچھ آزادی حاصل ہے

(ج) زراعت میں پیدائش بر پیمانۂ کبیر کا طریق اتنا نہیں پھیل سکتا جتنا کہ صنعت میں۔ اور صنعت کے مقابلہ میں تخصیص کی بھی گنجائش کم ہے۔

(د) چونکہ زراعت کی پیداوار ایسے اسباب پر منحصر ہے جو انسان کے اختیار اور قابو سے باہر ہیں۔ مثلاً دھوپ بارش موسمی حالت۔ اس لیئے زرعی پیداوار بہت معرض خطر میں رہتی ہے اس کے برخلاف مصنوعات بہت محفوظ ہیں۔

(ہ) زراعت میں قانون تقلیل حاصل کا عمل پورے طور پر جاری رہتا ہے لیکن مصنوعات میں قانون تکثیر حاصل اس قانون کی بہت کچھ روک تھام کر لیتا ہے۔

(و) زراعتی ملک میں محنت بیشتر غیر منتقل ہوتی ہے کیونکہ ایک زمین چھوڑ کر دوسری زمین سنگوانے میں بہت دقت اور صرفہ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اور اگر

خود کاشتکار ہی مالک زمین بھی ہو تو منتقل ہونا خارج از بحث ہے۔ صنعتی ملک میں منتقل ہونا آسان ہے۔ اگرچہ موانع ہیں تو یہی جہالت۔ افلاس اور قدامت پسند عادتیں۔

(ز) چونکہ زراعت کے کام معدودے چند اور بہت سادہ ہوتے ہیں ان میں صنعتوں کے مقابل تقسیم عمل کی بھی گنجائش بہت کم ہوتی ہے۔

(ح) مصنوعات کا منافع زراعت سے بڑھا رہتا ہے پس جب دو ملک آپس میں زرعی پیداوار اور مصنوعات کا مبادلہ کرتے ہیں تو گرچہ مبادلے سے فائدہ دونوں ملکوں کو ہوتا ہے لیکن صنعتی ملک کا منافع مقابلۃً بڑھا رہتا ہے۔

(ط) صنعتی ملک میں چونکہ دولت زیادہ پیدا ہوتی ہے زراعتی ملک کے مقابل وہاں زیادہ آبادی آرام سے رہ سکتی ہے۔

(ی) لیکن زراعت میں ایک خوبی ہے وہ یہ کہ اس پیشے میں لوگ آزادی سے رہتے ہیں ان میں خود اعتمادی اور دوسری اخلاقی خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لیکن صنعتوں میں خصوصاً آجکل جبکہ امکل کا دور دورہ ہے مزدوروں کی آزادی چھن جاتی ہے اور ساتھ ہی ان میں بعض اعلیٰ خوبیاں بھی گم ہو جاتی ہیں۔

# چھٹا باب

## زراعت

ہندوستان کا خاص پیشہ زراعت ہے ملک کی دو تہائی آبادی کا اسی پر گزر ہے اور دیہاتی آبادی میں سے نوے فیصدی کا بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی سے تعلق رہتا ہے۔

پیداآوری زمین

ہندوستان جیسے وسیع ملک میں زمین کی پیداآوری جابجا مختلف ہونی عجب نہیں۔ ایکطرف تو وادی گنگ کی از حد زرخیز سیاہ زمین جو کپاس کی کاشت کے واسطے بہت موزوں ہے۔ اور دوسری طرف وندھیا پہاڑ کی برہنہ چٹانیں اور مغربی راجپوتانہ کا ریگستان ان حالتوں کے درمیان ملک میں ہر درجے کی زرخیزی موجود ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ کہنا بیجا نہیں کہ ہندوستان کی زمین زرخیز ہے۔

زمین کی قسمیں

زمین کی تقسیم کئی طرح پر قرار پاسکتی ہے۔ خاص خاص تقسیمیں یہ ہیں۔ مزروعہ اور غیر مزروعہ۔ قابل کاشت اور ناقابل کاشت۔ آبی اور خاکی ایک فصلی اور دو فصلی یعنی جو زمین سال بھر میں ایک فصل اور جو دو فصلیں تیار کرے۔

ہر سال زرعی پیداوار زیادہ تر بارش کی مقدار اور اوقات پر منحصر ہوتی ہے موسموں کے دور کی وجہ سے اکثر جگہ دو اور کہیں کہیں مثلاً مدراس کے آبپاشی والے حصوں میں تین فصلیں تیار ہو جاتی ہیں۔ ہندوستان کے کل مزروعہ رقبے میں سے تقریباً ساتواں حصہ دوفصلی ہے یعنی وہاں سال میں دو فصلیں پیدا ہوتی ہیں۔

خاص فصلیں

خاص دو فصلیں یہ ہیں خریف یعنی موسم گرما کی فصل۔ اور ربیع یعنی موسم سرما کی فصل۔ خریف کی فصل کو زیادہ پانی درکار ہے۔ اس لیئے جنوب مغربی ہوا و برشگال کے چلتے ہی اس کو بو دیتے ہیں اور ستمبر نومبر کے درمیان پک کر تیار ہوتی ہے۔ جیسا کہ خود نام سے ظاہر ہے۔ ربیع کی فصل کو زیادہ پانی کی ضرورت نہیں۔ اکتوبر نومبر میں کھیتیاں کی ہوتی ہیں اور مارچ اپریل تک فصل تیار ہو جاتی ہے چونکہ

خریف اور ربیع کی فصلیں مختلف اوقات اور حالات میں نشو و نما پاتی ہیں ان کے خواص بھی جدا جدا ہیں۔ چنانچہ یہ فرق شمالی ہندوستان میں بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ البتہ بنگال میں اس درجہ فرق نہیں اور مدراس میں تو بہت ہی کم ہے۔ کھیتی بڑھنے کے زمانے میں کسی قدر سردی پڑتی ہے پس اس سے فصلوں کی اجناس بھی مخصوص ہو جاتی ہیں بنگال اور مدراس میں البتہ گرمی ہو یا جاڑا دونوں موسموں میں وہی چیزیں کاشت ہو سکتی ہیں۔

احاطہ بمبئی میں جہاں تقریباً کل بارش جنوب مغربی باد برشگال سے حاصل ہوتی ہے۔ خریف خاص فصل مانی جاتی ہے۔ مدراس میں ربیع کی چیزیں زیادہ کاشت ہوتی ہیں کیونکہ وہ جاڑے کا موسم ہوتا ہے جبکہ شمالی مشرقی موسمی ہوا وہاں بارش لاتی ہے۔ شمالی ہندوستان میں خریف کی مختلف فصلیں جنوب مغربی باد برشگال کی مدد سے کاشت ہوتی ہیں اور جاڑے کا موسم ربیع کی فصلوں کے واسطے خوب موزوں ہے۔

مزروعہ چیزوں کی بہت سی قسمیں ہیں مثلاً اناج مینا یعنی دالیں روغنی تخم۔ ریشے، رنگ، ادویات، مسالے، ترکاریاں، ساگ پات، مولیں یعنی وہ جڑیں جو کھانے میں آتی ہیں۔ مثلاً گاجر، مولی اور آلو، پھل، چارہ، اور متفرق فصلیں یہ قسمیں پورے طور پر جداگانہ نہیں بلکہ بعض فصلیں کئی کئی قسموں میں آ سکتی ہیں۔ خاص فصلوں کا مختصر مختصر حال ذیل میں درج کرتے ہیں امید کہ کارآمد ثابت ہوگا۔

چانول مزروعہ رقبے میں سے ۸۰ فیصدی پر خوراکی فصلیں کاشت ہوتی ہیں چانول اُن حصوں میں زیادہ پیدا ہوتا ہے جہاں بارش کی کثرت ہے مثلاً بنگال، آسام، برما اور بمبئی کے ساحلی اضلاع۔ یہی نہیں کہ چانول بنگال کی بہت خاص فصل ہے بلکہ کل ہندوستان کے مزروعہ رقبے میں سے ۴۲ فیصدی سے زیادہ اسی کے زیر کاشت ہے چانول کی بیشمار قسمیں ہیں بنگال میں اس کی دو فصلیں ہوتی ہیں۔ پہلی فصل اوس اور بعد کی فصل امن کہلاتی ہے۔ اوس کو بارش کی اس قدر ضرورت نہیں جس قدر کہ امن کو ہوتی ہے۔ اوس فصل کا چانول موٹا ہوتا ہے

جس کو زیادہ غریب لوگ کھاتے ہیں۔ لیکن اگر خدانخواستہ بارش کم ہو اور امن کی فصل خراب ہو جائے تو قحط میں اوس کے چانول سے بہت کام نکلتا ہے بنگال کے کل مزروعہ رقبے میں سے جس کی مقدار ڈھائی کرور ایکر ہے۔ کوئی ایک کرور ساٹھ لاکھ ایکر میں تو سرما والے اوس چانول کاشت ہوتے ہیں اور پچاس لاکھ ایکر سے زیادہ میں خزاں والے امن چانول سالانہ پیداوار کی مجموعی مقدار تین کرور ٹن یعنی چوراسی کرور من کے قریب رہتی ہے۔ چانول کی فصل بمبئی، مدراس اور برما میں بھی بہت اہم شمار ہوتی ہے۔ صوبہ متحدہ اور اودھ میں چانول یا تو مرطوب مقامات میں یا آبپاشی کی مدد سے کاشت ہوتا ہے۔ دریائی تکونوں کی دلدلوں میں تو اسکی کاشت بہت عام ہے۔

گیہوں

گیہوں تھوڑا بہت ہر صوبے میں کاشت ہوتا ہے۔ اس کی پیداوار کے خاص مقامات یہ ہیں۔ صوبہ متحدہ، پنجاب، بہار، صوبہ متوسط، اور راجپوتانہ، جو حالات گیہوں کی کاشت کے واسطے موافق ہیں وہ چانول کے واسطے ناموافق ہیں چنانچہ بالعموم یہ دیکھا گیا کہ جہاں گیہوں سرسبز ہوتا ہے۔ چانول نہیں ہوتا۔ گیہوں فصل ربیع میں پیدا ہوتا ہے۔ حتی الامکان اس کی آبپاشی کرتے ہیں۔ نہروں کی آبپاشی بڑھنے سے گیہوں کی کاشت کا رقبہ بھی بہت پھیل گیا۔ گیہوں کی دو خاص قسمیں ہیں۔ نرم اور سخت۔ ہندوستانی گیہوں دوسرے ملکوں کے گیہوں سے مقابلۃً عمدہ ہے سالانہ پیداوار کی مقدار ایک کرور ٹن یا ۲۸ کرور من رہتی ہے گیہوں پیدا کرنے والے ملکوں میں ریاستہائے متحدہ اور روس کے بعد ہندوستان ہی کا نمبر ہے۔ مختلف ممالک میں گیہوں کا رقبہ کاشت حسب ذیل دریافت ہوا ہے۔

| | |
|---|---|
| ریاستہائے متحدہ امریکہ | ۴ کرور ۸۰ لاکھ ایکر |
| روس | ۴ " ۶۰ لاکھ ایکر |
| ہندوستان | ۲ " ۷۰ " " |
| فرانس | ۱۰ " ۶۰ " " |
| ارجنٹائن | ۱ " ۱۰ " " |
| کناڈا | ۷۰ لاکھ ایکر |

جرمنی ۵۰ لاکھ ایکڑ
سلطنت متحدہ ۱۷ " "

لیکن اوسط پیداوار بحساب رقبۂ کاشت سلطنت متحدہ اور جرمنی میں سب جگہ سے بڑھا ہوا ہے اس کے بعد فرانس اور ریاستہائے متحدہ کا نمبر ہے اس لحاظ سے ہندوستان کا پانچواں نمبر رہتا ہے۔ قدرتی زرخیزی کے علاوہ جہاں جہاں زراعت میں سائنسی طریق رائج ہو گئے ہیں وہاں پیداوار بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ہندوستان کے مقابل سلطنت متحدہ کا اوسط تقریباً تگنا جرمنی کا ڈھائی گنا اور فرانس کا ڈیوڑھا رہتا ہے۔

جَو جئی — یوں تو جَو کی کاشت تھوڑی بہت تمام ملک میں رائج ہے۔ لیکن صوبۂ متحدہ میں اس کی پیداوار مقابلۃً زیادہ ہے۔ خوراک کے علاوہ جو مویشیوں کے راتب میں بھی کام آتا ہے۔ جئی کی کاشت ہندوستان میں بہت کم ہے۔

مکئی — مکئی ہندوستان کے بہت سے حصوں میں کاشت ہوتی ہے۔ اور صوبۂ متحدہ میں ایک اہم خوراکی فصل شمار ہوتی ہے۔

جوار باجرا — ہندوستان کے تقریباً ہر حصے میں جوار باجرا بکثرت کاشت ہوتا ہے اس فصل کی متعدد قسمیں ہیں ان میں سے جوار باجرا اور راگی خاص ہیں جو کہ جنوبی ہند میں غلے کی اصلی فصلیں مانی جاتی ہیں۔ اس فصل کو چارے کے واسطے بھی کاشت کرتے ہیں۔

یمن — گیہوں کی ایک اعلیٰ قسم یمن کہلاتی ہے یہ گیہوں بہت مقوی اور کثیر الکیموس ہوتا ہے دارجیلنگ کی پہاڑیوں اور صوبۂ متوسط و برار میں اس کی کاشت جاری ہے۔

مسیلے — اناجوں کے بعد خوراکی غلوں میں مسینوں کا نمبر ہے ان کی بھی بہت سی قسمیں کاشت ہوتی ہیں ان میں ارہر، چنا، مسور، اُرد، مونگ اور کلائی خاص خاص ہیں صوبۂ متحدہ اور بہار میں ان کی فصلیں خوب سرسبز ہوتی ہیں بنگال کے دریائی تکون والے حصے میں یہ چیزیں عمدہ پیدا نہیں ہوتیں۔ وہاں کی زمین شور زیادہ ہے اور کھار کی کثرت ان کے واسطے مضر ہے بعض قسمیں مویشیوں کے راتب میں کام آتی ہیں۔

باب ۶

روغنی تخم

ہندوستان کے ہر حصے میں روغن دار تخموں کی کاشت بھی بہت اہم شمار ہوتی ہے۔ اناجوں کے بعد بنگال میں انھی کا رقبۂ کاشت سب سے بڑھا ہوا ہے سالانہ پیداوار کی مجموعی مقدار کوئی ستائیس لاکھ ٹن یا ساڑھے سات کرور من سے زیادہ رہتی ہے ان کی بہت سی قسمیں ہیں مثلاً رائی، سرسوں، ترا، السی تل، رینڈی، سرگوجا، اور مونگ پھلی، بعض پھلوں مثلاً ناریل۔ بعض پھولوں اور نیز کپاس کے بنولے سے تیل نکالتے ہیں حال میں ناریل اور مونگ پھلی کی برآمد بہت بڑھ گئی اور اسی وجہ ان کی قیمت بھی چڑھی رہتی ہے۔ رینڈی کے تخم کی قدر و قیمت بھی بڑھ گئی ہے۔ کیونکہ ایری قسم کے کرم ریشم اسی کے پتوں پر پلتے ہیں۔ روغنی تخم جو بکثرت ملک سے باہر چلے جاتے ہیں تو اس سے ملک کو نقصان پہنچتا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ صرف تیل باہر بھیجا جاوے اور کھلی مویشیوں کے راتب اور زمین کی کھاد میں یہیں کام آوے۔

جوٹ

ریشہ دار چیزوں میں جوٹ اور روئی بہت اہم اور کارآمد ہے۔ دنیا بھر میں جوٹ کا اجارہ بنگال کے ہاتھ میں ہے یعنی وہاں کے سوا جوٹ اور کہیں پیدا نہیں ہوتا۔ تیس لاکھ ایکڑ سے زیادہ رقبہ اس کے زیر کاشت ہے۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی کچھ وسیع قطعے موجود ہیں۔ جہاں اس کی کاشت عمدہ طور پر ہو سکتی ہے ایسی زمین خاص طور پر موزوں ہے جو بارش کے زمانے میں غرق آب ہو جاتی ہو جو حالات چانول کے واسطے وہی جوٹ کے واسطے موافق ہیں۔ یہ بڑی آمدنی کی فصل ہے جوٹ کی برآمد کا سب سے پہلے ۱۸۲۸ء میں پتا چلتا ہے۔ اب تو تین چوتھائی پیداوار ملک سے باہر چلی جاتی ہے۔ بنگال میں سالانہ مقدار نوے لاکھ گٹھے تخمینہ کی جاتی ہے اور ہر گٹھے کا وزن ۴۰۰ پونڈ یا کچھ کم پانچ من ہوتا ہے ۱۹۱۳ء میں جوٹ کی قیمت بہت اچھی رہی یعنی تقریباً ساٹھ روپے فی گٹھا خیال ہے کہ بنگال۔ بہار اور آسام میں دو کرور گٹھے پیدا ہونے کی گنجائش موجود ہے۔ چنانچہ اس کی کاشت پھیل رہی ہے اور چانول کی کاشت گھٹتی جاتی ہے۔ چانول بھی کچھ کم ضروری چیز نہیں ہے اس لحاظ سے جوٹ کی کاشت میں جو اضافہ ہو رہا ہے وہ قابل غور ہے۔

باب ۲

چند دیگر ریشے

دو ریشہ دار چیزیں اور ہیں جو کہ جوٹ سے بہت ملتی جلتی ہیں ایک تو بمبئی کا پٹسن جس کو سنا پٹ کہتے ہیں - اور جس کو بعض مبصر جوٹ سے بھی بہتر قرار دیتے ہیں اور دوسرے سن، علاوہ ازیں "ری" Rhea بھی ایک خاص ریشہ دار چیز ہے - اس کی کاشت کے متعلق آئندہ ترقی کی بہت امید کی جاتی ہے - الیوے کا ریشہ بھی ایک کارآمد چیز ہے - لیکن اس کی کاشت صرف منطقۂ حارہ اور تحت منطقۂ حارہ میں ہوتی ہے -

روئی

ہندوستان کی زرعی پیداوار میں روئی بہت اہم شمار ہوتی ہے - کل رقبۂ کاشت دو کروڑ بیس لاکھ ایکڑ ہے اور سالانہ پیداوار کی مجموعی مقدار کوئی ۵۰ لاکھ گٹھے ہوتی ہے - اس کی کاشت یوں تو کم و بیش تمام ملک میں پھیلی ہوئی ہے لیکن خاص خاص مقامات یہ ہیں - گجرات اور کاٹھیاواڑ کے میدان - تناولی - مدورا - کائمبتور - اور مدراس کے اضلاع مفوضہ دکن کے بلند حصے صوبۂ متوسط اور برار کی وادی - روئی کی دو قسمیں ہیں کہیں کہیں تو وہ سالانہ کاشت ہوتی ہے اور کہیں اس کے درخت لگے ہوئے ہیں - پھر فصلی روئی اور درخت والی روئی کی بھی جداگانہ متعدد قسمیں ہیں - دکن میں سیاہ زمین روئی کی کاشت کے واسطے سب سے زیادہ موزوں ہے اسی وجہ سے اس کو روئی کی زمین بھی کہتے ہیں - پھر بھی یہاں کی روئی عمدگی میں امریکہ کی روئی سے گھٹی ہوئی ہے - اور بحساب ایکڑ پیداوار کا اوسط بھی کم رہتا ہے سندھ میں چند سال تک مصری روئی کاشت ہوا کی - لیکن چونکہ اس کو مقابلۃً زیادہ پانی درکار ہے اس لیے اس کے بجائے اب امریکن روئی کاشت ہونی شروع ہوئی ہے - احاطۂ مدراس کی سرخ زمین میں کمبوڈیا یا تناولی کی روئی خوب پیدا ہوتی ہے - چند سال ہوئے کہ یہ روئی یہاں آئی - امریکن روئی سے عمدگی میں بڑھی ہوئی ہے - اور صاف ہو کر مقدار بھی زیادہ رہتی ہے - جہاں آبپاشی کا انتظام نہیں وہاں تو البتہ روئی کی دیسی قسمیں کاشت کرنا زیادہ فائدہ مند ہے لیکن ذیل کے صوبوں میں لانبے ریشے والی روئی کی کاشت یقیناً زیادہ موزوں ہے - سندھ، پنجاب، گجرات، جنوبی مدراس اور صوبۂ متوسط - ایک بہت بڑے یورپین ماہر کا خیال ہے کہ روئی کی کاشت میں

بہت کچھ ترقی کی گنجائش موجود ہے اور خوراک کی پیداوار کی مزاحمت کیے بغیر ہندوستان میں روئی کی پیداوار دو چند ہوسکتی ہے۔

سنبھل اور آکھ — سینبھل کے درخت اور آکھ کی جھاڑیوں میں بھی جو ریتیلی زمینوں میں خودرو ہوتی ہیں۔ ریشم جیسے نرم اور چمکدار ریشے نکلتے ہیں جس سے عمدہ نباتاتی ریشم تیار ہونا ممکن ہے۔

نیل — کسی زمانے میں نیل ہندوستان کی ایک خاص فصل شمار ہوتا تھا۔ لیکن جب سے یہ انیلین کے رنگ چلے اس کی قدر جاتی رہی۔ بنگال میں تو اس کی کاشت بالکل ترک ہی ہوگئی۔ البتہ صوبہ متحدہ اور بہار میں اب بھی کسی قدر ہوتی ہے موجودہ کیمیائی رنگ نیل اور دیگر نباتاتی رنگوں سے عمدگی میں گھٹے ہوئے ہیں اس لیے ان رنگوں کا دوبارہ زندہ ہونا ممکن ہے۔

پوست — پوست کی کاشت بہار اور صوبہ متحدہ میں دریائے گنگ کے شمالی اضلاع تک محدود ہے۔ برطانوی ہند میں اس کی کاشت سرکار کے لیئے کی جاتی ہے اور چین سے جو معاہدہ ہوا ہے اس کی تعمیل میں اس کا رقبۂ کاشت بہت گھٹا دیا ہے۔ راجپوتانہ اور متوسط ہند کی بعض دیسی ریاستوں میں بھی اس کی کاشت رائج ہے۔ پوست ربیع کی فصل میں پیدا ہوتا ہے۔

تنباکو — ہندوستان میں تنباکو بہ مقدار کثیر پیدا ہوتا ہے یوں تو وہ ہر حصے میں کاشت ہوتا ہے لیکن اس کی کاشت کے خاص مقام یہ ہیں۔ بہار میں ترہوت کے اضلاع بنگال میں رنگپور اور بعض اضلاع مدراس میں۔

چاء، قہوہ اور کنین — چاء ان مقامات میں خاص طور پر کاشت ہوتی ہے۔ بنگال میں تو دارجلنگ اور جلپائی گوڑی کے اضلاع۔ مدراس میں نیلگری پہاڑیاں صوبۂ متحدہ میں ضلع دہرہ دون — اور پنجاب میں کانگڑا وادی۔ سالانہ پیداوار کی مقدار تخمیناً تیس کرور پونڈ ہوتی ہے۔ اس کی قیمت چودہ کرور روپیہ سمجھنی چاہیے چاء کی برآمد پہلے ہی سے بہت زیادہ ہے اور اس میں اب بھی اضافے کی گنجائش ہے۔ قہوے کی کاشت جنوبی ہند تک محدود ہے اور برازل سے جو منابقت آپڑی تو اس میں روز بروز تنزل ہو رہا ہے۔ کنین کی کاشت

کے دو خاص مرکز دارجلینگ اور نیلگری پہاڑیاں ہیں۔ کینین بھی سرکاری اجارے میں داخل ہے۔ یعنی کل پیداوار سرکار خرید لیتی ہے اور پھر اپنے اہتمام سے فروخت کرتی ہے۔

ترکاریاں

ہندوستان میں بہت سی قسم کی ترکاریاں ہوتی ہیں سب سے زیادہ عام اور کارآمد تو آلو ہے۔ اوس چاول یا جوٹ کے بعد آلو کاشت ہوتا ہے اور بعض بعض حصوں میں جہاں آلو کی پیداوار خاص ہے۔ اس کے سوا سال بھر کوئی دوسری فصل پیدا ہی نہیں ہوتی۔ آلو کے واسطے عمیق کاشت ضروری ہے۔ یعنی کھیت خوب گہرا جوتنا چاہیئے دوسرے خاص ترکاریاں یہ ہیں۔ پلول۔ بیگن، کرم کلا، گوبھی، ٹماٹو، شلجم، آلو سے ملتی جلتی ایک ترکاری اور ہوتی ہے جسکو سملا لو، کہتے ہیں۔ کبھی کبھی قحط میں لوگوں کی اسی پر گزر رہ جاتی ہے خشک سالی میں خوب پیدا ہوتی ہے اس کا نہایت مقوی اور خوش ذائقہ کھانا تیار ہوتا ہے۔ اس کی اور اسی قسم کی دوسری ترکاریوں کی کاشت بڑھانی ضروری ہے تاکہ خشک سالی میں قحط کو روکیں۔

پھل

دنیا میں شاید ہی کہیں اس سے زیادہ قسم کے پھل پیدا ہوتے ہوں جتنے کہ ہندوستان میں ہوتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ پھلوں کی کاشت باقاعدہ سائنٹفک طریق کے مطابق نہیں ہوتی۔ اگر ایسا کریں تو یقیناً پھلوں کی عمدگی اور نفاست میں ترقی ہو اور پیداوار بھی ضرور بڑھے علاوہ بریں جن نئے نئے پھلوں کے واسطے زمین اور آب وہوا موزوں ہو ان کی کاشت بھی شروع کرنی چاہیئے۔ ہندوستان میں نہ صرف یہاں کی ضرورت کے قابل پھل پیدا ہو سکتے ہیں بلکہ دوسرے ممالک کو پھل بھیجکر ان کی تجارت سے بہت کچھ فائدہ اُٹھانا ممکن ہے

شکر

شکر سازی کسی زمانے میں ہندوستان کی بہت بڑی صنعت تھی جب سے پردیسی شکر آنی شروع ہوئی یہ صنعت تباہ ہوگئی۔ تاہم اب بھی اس کے واسطے بہت کچھ ممکن ہے اور چند سال سے اس میں کچھ کچھ جان پڑتی نظر آرہی ہے۔ کھانڈ ایک نیم تیار شدہ چیز شمار ہوتی ہے۔ ہندوستان میں کھانڈ یا تو گنے سے بنتی ہے یا تاڑ سے اس کا رقبہ کاشت ۲۵ لاکھ ایکڑ ہے اور سالانہ پیداوار

بھی ۲۵ لاکھ ٹن کے قریب رہتی ہے۔ صوبۂ متوسط اور نیز بعض اضلاع بہار میں نیشکر سب سے اعلیٰ قسم کی ہوتی ہے۔ تاڑ کی شکر یا تو معمولی تاڑ کے عرق سے تیار ہوتی ہے یا درخت کھجور کے عرق سے۔ بنگال میں تاڑ کی شکر بنانے کی صنعت کچھ روز سے بہت خستہ حال نظر آتی ہے لیکن اب بھی اس کو ترقی کا موقع حاصل ہے کیونکہ تاڑ کی کاشت میں زیادہ صرفہ نہیں پڑتا اور پیداوار ہر طرح یقینی ہے۔

مسالے

اگرچہ ملک کے مختلف حصوں میں طرح طرح کے مسالے پیدا ہوتے ہیں۔ تاہم کل پیداوار ملکر بھی ملک کی ضرورت کے واسطے کافی نہیں ہوتی۔ اور ان کی کاشت میں توسیع ہونی ضروری ہے۔

لاکھ اور ربر

متفرق چیزوں میں لاکھ اور ربر بہت کارآمد ہے لاکھ ایک قسم کی رال ہے جو بعض درختوں کی شاخوں پر جم جاتی ہے۔ آسام، برما۔ اور صوبۂ متوسط و ناگپور کے جنگلاتی اضلاع میں اس کی پیداوار زیادہ ہے ہندوستانی ربر کی قدر و قیمت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ کیونکہ وہ صنعت کے بہت سے کاموں میں استعمال ہونے لگی ہے یہاں ربڑ خاص طور پر آسام اور برما میں پیدا ہوتا ہے۔ اگر ہندوستان میں ربر بہ پیمانۂ کبیر بہ تیار ہونے لگے تو ہندوستان کی قومی دولت میں اس سے معتدبہ اضافہ ہو سکتا ہے۔

ریشم کے کیڑے

ریشم کے کیڑے پالنے اور ریشم نکالنے کی صنعت بھی کسی زمانے میں بہت پر منفعت تھی لیکن گزشتہ صدی کے وسط سے اس کا تنزل شروع ہو گیا۔ اب اس میں پھر کچھ جان پڑ رہی ہے۔ اس کے واسطے بہت کچھ ممکن ہے۔ اگر کیڑے پالنے بچے نکلوانے اور ریشم اتارنے کا عمدہ انتظام ہو جائے تو اس صنعت کے ذریعے سے ملک کی دولت میں معقول اضافہ ہو سکتا ہے۔ بنگال، آسام۔ صوبۂ متوسط اور کشمیر کے خاص خاص حصوں میں یہ صنعت جاری ہے۔

چارے کی فصلیں

جوار، باجرا اور راگی کی فصلیں بہت زیادہ چارے کے کام آتی ہیں۔ پنجاب اور بہار میں تو جوار چارے کی فصل کے طور پر کاشت ہوتی ہے۔ بمبئی کے بعض حصوں میں بھی اس کی کاشت جاری ہے مدراس میں راگی جوار کی جانشین بنی ہوئی ہے۔ بہار میں انگریز زمیندار اور کوٹھی والے اوکھ کو چارے کے طور پر

کام میں لاتے ہیں۔ چنا، جئی، جو، شلجم، اور بھٹ کٹیا بھی مختلف حصوں میں چارے کی فصلیں شمار ہوتی ہیں۔ بعض درختوں سے بھی بہت عمدہ چارہ ملتا ہے۔ کون کون سا چارہ کس قدر مقوی اور جسم پرور ہے۔ بہت کم معلوم ہے۔ ظاہر ہے کہ چارے کی فصلوں کی کاشت مویشیوں کی پرورش اور ترقی کے واسطے بہت ضروری ہے۔

زراعتی اعداد و شمار

ہندوستان کی زرعی پیداوار کے متعلق بالکل ٹھیک ٹھیک اور معتبر اعداد و اشمار تو ملتے نہیں البتہ ذیل کے اعداد سے کچھ کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہاں زراعت کی کیا حالت ہے۔

| | |
|---|---|
| کل رقبہ بموجب سرکاری پیمائش | ٦١ کرور ٨٦ لاکھ ایکر |
| جنگلات کا رقبہ | ٨ کرور ٨ لاکھ ایکر |
| غیر قابل کاشت رقبہ | ١٤ کرور ٩٦ لاکھ ایکر |
| افتادہ زمین قابل کاشت | ١١ کرور ٧٤ لاکھ ایکر |
| غیر مزروعہ رقبہ | ٥ کرور ٥٠ لاکھ ایکر |
| مزروعہ رقبہ | ٢١ کرور ٦٠ لاکھ ایکر |
| رقبۂ آبپاشی | ٤ کرور ٦ لاکھ ایکر |

## اب فصلوں کی تقسیم ملاحظہ ہو

| | |
|---|---|
| غلہ ہائے خوراک | ١٩ کرور ٥٠ ایکر |
| دیگر فصل ہائے خوراک | ٧٥ لاکھ ایکر |
| شکر | ٢٥ لاکھ ایکر |
| قہوہ | ٢١ لاکھ ایکر |
| چاء | ٥ لاکھ ایکر |
| روغنی تخم | ١ کرور ٦٥ لاکھ ایکر |
| روئی | ١ کرور ٤٥ لاکھ ایکر |
| جوٹ | ٣٠ لاکھ ایکر |
| افیون | ٢٢ لاکھ ایکر |

| | |
|---|---|
| نیل | ۳۲ لاکھ ایکڑ |
| تمباکو | ۲۱ لاکھ ایکڑ |
| مویشیوں کا چارہ | ۴۹ لاکھ ایکڑ |

غلہ ہائے خوراک کا جسقدر رقبہ اوپر درج ہے اس میں تہائی سے زیادہ تو چانول کے زیر کاشت ہے پانچویں حصے سے کچھ زیادہ میں گیہوں کاشت ہوتا ہے۔ اور تقریباً ایک چوتھائی میں باجرے کی کاشت جاری ہے۔ ہندوستان میں گیہوں کی پیداوار کا اوسط ۱۱½ بشل فی ایکڑ نکلتا ہے۔ حالانکہ انگلستان میں فی ایکڑ ۳۱ ۱/۱۰ بشل گیہوں پیدا ہوتا ہے اس فرق کا بڑا باعث قدیم وجدید طریق کاشت میں مخفی ہے۔

جنگلات — فن جنگلات بھی زراعت سے ملتا جلتا کام ہے۔ گو درختوں کو کھیت کے پودوں میں شمار نہیں کر سکتے۔ برطانوی ہندوستان کے جنگلات بیشتر سرکاری نگرانی میں ہیں۔ انتظام کے لحاظ سے جنگلات کی کئی قسمیں قرار پائی ہیں۔ ایک تو مخصوص دوسرے محفوظ اور تیسرے عام جنگلات، قدرتی ہیئت اور حالات کے لحاظ سے بھی جنگلات کی متعدد قسمیں ہیں۔ ایک تو سدا بہار جنگل جو کہ مغربی ساحل اور نیز برما جزیرۂ انڈمان اور ہمالیہ کے دامن میں مشرق کی طرف واقع ہیں۔ ان میں درخت بہت بہت بلند ہوتے ہیں دوسرے برگ ریز جنگل جن میں سال اور ساگوان کے درخت خاص طور پر ملتے ہیں یہ جنگل بھی ان حصوں میں نظر آتے ہیں۔ جہاں کافی بارش ہو جاتی ہے۔ تیسرے خشک جنگل جو خاص کر پنجاب اور صوبۂ متوسط میں پائے جاتے ہیں۔ چوتھے ہمالیہ کے صنوبری جنگل جن میں دیودار صنوبر۔ بلوط۔ اور دوسری قسم کے کارآمد درخت بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ بنگال میں سندربن کے جنگل دریا اور سمندر کی لہریں آنے سے بہت سرسبز ہو رہے ہیں سیلابی جنگلوں کا یہ عمدہ نمونہ ہیں۔ دریائی جنگل پنجاب اور برما میں نظر آتے ہیں

جنگلات کی تیاری — ہندوستان میں قسم قسم کے درخت پیدا ہوتے ہیں جہاں بارش کی کثرت

ہے وہاں تو خودبخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کو جہاں چاہیں لگا سکتے ہیں حتیٰ کہ خشک حصوں میں ان کا پیدا ہونا ممکن ہے۔ کسی زمانے میں تمام ملک درختوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ انیسویں صدی کے پہلے نصف دور میں درختوں کے ساتھ اس قدر بے پروائی برتی گئی کہ بہت سے حصوں کے جنگل معدوم ہو گئے۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں آئے دن خشک سالیاں اور سیلاب فصلیں تباہ کرتے رہتے ہیں۔ ایسے درختوں کی پرورش از حد ضروری ہے کہ جن سے نشاستہ، تیل، شکر، ریشے، اور ترکاریاں حاصل ہوں۔ درخت نہ صرف اس لئے قابل قدر ہیں کہ ان سے خوراک، چارہ، اور لکڑی ملتی ہے۔ بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ آب و ہوا اور بارش پر ان کا بہت کچھ مفید اثر پڑتا ہے۔ درخت موجود ہونے سے ہوا کی حرارت گھٹ جاتی ہے اور شب کو زیادہ حرارت خارج نہیں ہونے پاتی۔ گویا درخت حرارت میں توازن قائم رکھتے ہیں ہوا کو مرطوب کر کے درخت بارش کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ درختوں کے سائے تلے زمین پر کائی کی سی ایک ڈبل تہ جم جاتی ہے۔ جسکا خاصہ یہ ہے کہ گرمی کے موسم میں درخت کی جڑوں میں ٹھنڈک رہتی ہے اور سردی کے موسم میں گرمی۔ علاوہ بریں پانی کی بڑی بمقدار اسی میں جذب ہو کر محفوظ رہتی ہے یہی وہ صورت ہے کہ درختوں کے ذریعے سے ادنیٰ درجے کی زمینیں زرخیز بن جاتی ہیں۔ ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس تہ کے بنے رہنے سے زمین کی سطح ڈھلنے اور پانی میں بہنے سے محفوظ رہتی ہے۔ درخت سطح کو یوں اور بھی زرخیز بنا دیتے ہیں کہ خوراک کی چیزیں زمین کی گہرائی سے نکال نکال کر پتوں میں جمع کرتے رہتے ہیں اور بعد کو پتے گر گر کر زمین میں خاک ہو جاتے ہیں۔ درختوں کا ایک کام یہ بھی ہے کہ تیز ہواؤں کو چلنے سے روکتے ہیں جہاں ہوا کا زور ہو وہاں ان کی بدولت امن مل سکتا ہے۔ پس سرکار اور نیز عوام کو جنگلات کی ترقی پر توجہ کرنی لازم ہے۔

ماہی پروری۔

ماہی پروری بھی زراعت کے مشابہ ہے۔ مچھلی کھانے کا بھی عمدہ کام دیتی ہے اور اس کا کھاد بھی بنتا ہے۔ ماہی گیری بہت سے لوگوں کا ذریعہ معاش ہے لیکن یہ کام بہت بھدے طریق پر چل رہا ہے اور کچھ اچھی حالت میں

نہیں ہے۔ ہندوستان میں کس قدر ندی، نالے، دریا اور تالاب ہیں پھر اس کا ساحل کتنا طویل ہے۔ اگر ماہی گیری کا کام باقاعدہ کیا جائے تو پھر مچھلی بافراط مہیا ہو سکتی ہے۔

طریق کاشت

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ ہندوستان کی مزروعہ اراضی کروڑہا چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں منقسم ہے۔ گویا یہاں پر کاشت بر پیمانۂ صغیر ہوتی ہے۔ نیز وہ بیشتر وسیع ہوتی ہے۔ عمیق زیادہ نہیں ہوتی۔ یعنی تھوڑی محنت اور لاگت سے کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ کھیت کی درستی اور تیاری میں زیادہ اہتمام نہیں کرتے صوبے صوبے میں کاشتکاری کے کاروبار کی تفصیل حسب اختلاف حالات جداگانہ ہے۔ بنگال اور بہار کی دریائی دلدلیں کرناٹک کی خشک اور بلند سطح۔ دکن کے سیاہ مٹی کے میدان، پنجاب کی سخت چکنی مٹی کی زمین اور سندھ وراجپوتانہ کے ریگستان۔ ان مختلف الحال حصوں میں طریق کاشت بھی مختلف ہونا ضروری ہے۔ ہندوستانی کاشتکار چونکہ جاہل ہے اس لیئے اس کا طریق کاشت بھی غیر سائنٹفک ہے البتہ اپنے عملی کام اور نسلہا نسل کے تجربوں سے وہ یہ جان گیا ہے کہ فصلوں کا دور اور زمین کا گاہ گاہ خالی رہنا زرخیزی کے حق میں مفید ہے۔ اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ کس زمین کے واسطے کیا فصل موزوں ہوگی۔ وہ ٹھیک وقت پر کھیت جوتتا اور ٹھیک وقت پر فصل کاٹتا ہے۔ وہ محنتی اور جفاکش ہے۔ اپنے کھیت سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اکثر اس میں اتنی استطاعت نہیں ہوتی کہ کھیت کو پورے طور پر کھاد لگائے یا عمدہ تخم لیکر بوئے یا ایک آدھ فصل زمین کو خالی چھوڑ دے۔ آلات واوزار بھی بہت سادہ قسم کے ہوتے ہیں لیکن کاشتکار کے کام کے واسطے خوب موزوں ہے۔

اصل کی ضرورت

کاشتکار اور زراعت کی حالت پر نظر ڈالیئے تو بحیثیت مجموعی کاشتکار اپنے کام میں ہوشیار معلوم ہوتا ہے لیکن اس غریب کو کافی اصل میسر نہیں آتا کہ زیادہ کھاد ڈالے عمدہ مویشی خریدے ان کو اچھی طرح پر کھلائے پلائے اور کھیت کو خوب پانی دے۔ غریب کاشتکار کو جدید ترقی یافتہ طریق کاشت کی بھی کچھ خبر نہیں

نہیں۔ یہ خرابی اسی وقت رفع ہوسکتی ہے جبکہ زراعت کے متعلق کچھ تعلیم دی جائے۔

ترقی زراعت

اول تو زراعت اس ملک کا خاص پیشہ ٹھیرا۔ دوسرے اکثر صنعتوں کا دارومدار پیداوار خام کی بہم رسانی پر ہوتا ہے۔ جو لوگ ہندوستان کی بہبودی پر غور و فکر کرتے ہیں ان کو ترقی زراعت کی طرف خاص توجہ کرنی چاہیئے۔ ترقی زراعت کے باب میں وقتاً فوقتاً بہت سی تجاویز بیان ہوا کی ہیں۔ بعض ان حضرات نے بھی تجاویز پیش کی ہیں۔ جنھوں نے نہ تو کاشتکار کی ذاتی حالت پر کافی غور کیا اور نہ اس بات پر نظر ڈالی کہ اس کو کن حالات میں رہ کر کام کرنا پڑتا ہے۔ اگر زراعت بر پیمانۂ کبیر مقصود ہو تو اس کے واسطے بڑے بڑے وسیع قطعات گہری جوتائی۔ پوری پوری آبپاشی عمدہ کھاد اور فصلوں کا مناسب دور۔ یہ سب اہتمام ضروری ہے اس کے لیئے بہت سا اصل چاہیئے۔ اور غریب کاشتکار کے پاس بھلا اتنا اصل کہاں۔ مدت ہوئی ایک ہندوستانی روزانہ اخبار نے لکھا تھا اور بہت سچ لکھا تھا کہ جہاں تک غیر سائنسی طریق کاشت کا تعلق ہے۔ ہندوستانی کاشتکار اس میں خوب ماہر ہے کوئی بات سیکھنی باقی نہیں اور سائنسی طریق کاشت جاری کرنا اس کے بل بوتے سے باہر ہے اس کے اہتمام کی اس کو استطاعت نہیں۔

تاہم ان دشواریوں کے ہوتے ہوئے ترقی زراعت کی بہت کچھ گنجائش موجود ہے اور یقین ہے کہ جدید طریق رائج ہونے پر موجودہ کھیتوں کی پیداوار کچھ نہیں تو پندرہ بیس فیصدی بڑھ جائے گی۔ اگر کاشتکاروں میں امداد باہمی کا طریق رائج ہو جائے تو ان کی بہت سی دقتیں اور دشواریاں رفع ہوسکتی ہیں۔ مثلاً کاشتکار آپس میں ملکر مشترک سرمائے سے جدید قسم کے ترقی یافتہ آلات خرید لیں یا اپنے کھیتوں کی آبپاشی کے واسطے کنوئیں بنائیں یا اپنے مویشیوں کے چرنے کے واسطے مشترک چراگاہیں چھوڑ دیں۔ اگر قرض امداد باہمی کی انجمنیں باقاعدہ چلائی جائیں تو کاشتکاروں کو از حد مدد مل سکتی ہے۔ اگر ملک کی خاص حالتوں کو پیش نظر رکھ کر سائنٹفک تجربوں سے کام لیا جائے تو بہت کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ زراعتی میلے اور نمائشیں اس طرح پر کاشتکاروں کو بہت مفید ثابت ہوں گی کہ وہاں جدید ترقی یافتہ آلات کی خوبیاں۔ نیز عمدہ تخم اور موزوں کھاد کے فوائد عملی طور پر

کاشتکار کے ذہن نشین کیے جائیں بعض ماہرین زراعت ترقی کی طرف سے اس لیئے مایوس ہیں کہ وہ ہندوستانی کاشتکار کو تعطل مجسم تصور کرتے ہیں لیکن درحقیقت کاشتکار اس درجہ قدامت پسند نہیں جتنا کہ لوگ خیال کرتے ہیں لہٰذا جدید ترقی یافتہ طریق کاشت اختیار کرنے میں کچھ عذر نہیں بشرطیکہ کوئی عملی طور پر یہ ثابت کر دکھائے کہ وہ زیادہ مفید مطلب ہے۔ یہ نہیں کہ بس جدید طریقوں کی بہت کچھ تعریف لکھدی بلکہ زراعت کرکے دکھانا چاہیے کہ وہ کسی قدر فائدہ مند ہیں اور جن حالات میں رہ کر کاشتکار کھیتی باڑی کرتا ہے ان کے واسطے بھی موزوں ہیں مسٹر ڈی۔ ایل رائے تحریر فرماتے ہیں کہ سبپور کے وزنی اور بیش قیمت ہل کی خوشنمائی۔ مصنوعی کھادوں کی سائنٹفک خوبیاں۔ عمدہ کھلائے پلائے مویشیوں کی صاف ستھری شکلیں۔ محض شوقین لوگوں کی نظر میں تو بہت قابل قدر ہیں۔ لیکن جو لوگ کاشتکاری کرتے ہیں ان کی نظر میں نفع زیادہ ضروری ہے اور وہ اسی کا خیال کرتے ہیں۔ صوبہ مدراس کے ناظم زراعت لکھتے ہیں کہ کمبوڈیا کی روئی جو مدراس میں کاشت ہونے لگی تو اس امر سے اچھی طرح پر ثابت ہوا کہ اگر کاشتکار کو اطمینان ہو جائے کہ کسی جدید چیز کی کاشت سے عمدہ منافع حاصل ہوگا تو وہ بلا تامل اس کو شروع کر دیگا۔

واضح ہو کہ سائنٹفک طریق کے مطابق اس وقت کاشت ممکن ہے جبکہ کاشتکار کے پاس بہت سا اصل موجود ہو تاکہ وہ کاشت برپیمانۂ کبیر کا اہتمام کر سکے۔ کچھ نہیں تو سو ایکڑ زمین ہونی چاہیئے۔ سائنسی طریق میں یہ خوبیاں ہیں۔ آبپاشی اچھی طرح پر ہوتی ہے۔ کھاد عمدہ لگتا ہے۔ تخم بھی عمدہ پڑتا ہے۔ تقسیم عمل کا زیادہ موقع ملتا ہے۔ موسم اور زمین کے لحاظ سے موزوں فصل کاشت ہوتی ہے اپنے فصلوں میں خوب دور رہتا ہے اور حصول تجربہ کی زیادہ گنجائش نکل آتی ہے لیکن جو کاشتکار بطور خود مختصر کھیتی باڑی کرتے ہیں ان کو بھی چند فوائد حاصل ہیں۔ مثلاً کاشتکار اس حالت میں مقابلۃً اپنے کام میں بہت گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ اس طریق سے آزادی، خود اعتمادی اور دوسرے اخلاقی صفات دل میں جاگزیں ہوتے ہیں اور مالکان زمین کو ایک معاشرتی رسوخ حاصل ہو جاتا ہے۔ اس

سلسلے میں فی نفسہ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ آیا کاشت بر پیمانہ صغیر یہاں کی زمین اور معاشرتی حالات کے واسطے موزوں ہے یا نہیں۔

ڈاکٹر ولکر کی تجاویز

۱۸۸۹ء میں سرکار نے ڈاکٹر ولکر کو یہ کام سپرد کیا کہ وہ ہندوستانی زراعت کی حالت دریافت کرکے اس کی ترقی کے واسطے مناسب تدابیر تجویز کریں۔ ۱۸۹۳ء میں انھوں نے ایک لاجواب کیفیت پیش کی۔ اس میں چند تدابیر اختیار کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔جن کا لب لباب حسب ذیل ہے۔

(۱) عام اور زرعی تعلیم کی اشاعت اور اس غرض کے لیئے دیسی زبانوں میں عمدہ کتب نصاب کی تیاری (۲) جہاں جہاں ضرورت ہو نہر نالوں اور دیگر ذرائع آبپاشی کی توسیع (۳) کنوؤں اور ان کے مثل دیگر کاموں کے واسطے تقسیم تقاوی کا مزید اہتمام (۴) محکمۂ زراعت کی طرف سے ضلع ضلع میں ضروریات آبپاشی کے متعلق باقاعدہ تحقیقات (۵) ایندھن اور چارے کے محفوظ ذخیرے قائم کرنا۔ نہر کے کناروں پر اور ریلوے لائنوں کے ہر دو جانب درخت لگانا اور جہاں تک ہو سکے فن سردرختی کو ترقی دینا (۶) علم کیمیا کی مدد سے نئی نئی فصلوں جدید طریق کاشت اور کھادوں وغیرہ کے متعلق تجربوں کی شکل میں تحقیقات جاری رکھنا (۷) تجربے کے کھیتوں میں جو سرکار کی طرف سے جابجا قائم ہیں، جدید آلات کا امتحان کرنا اور پسندیدہ آلات کو کاشتکاروں میں نمونۃً تقسیم کرنا۔ (۸) انھیں سرکاری کھیتوں میں عمدہ تخم پیدا کرکے کاشتکاروں میں تقسیم کرنا (۹) گائیں گیابھن کرنے کے واسطے سرکاری کھیتوں پر بجار رکھنا اور عمدہ طور پر مویشی پالنے کی ترغیب دینا

آبپاشی اور خشک کاشت

آبپاشی کے مختلف ذرائع بڑھانے اور خشک کاشت کے جو طریق تجربۃً کامیاب ثابت ہو چکے ہوں ان کو اختیار کرنے سے یقیناً رقبۂ کاشت بڑھ جائیگا اور ملک کی زرعی دولت میں اضافہ ہوگا۔ ریاستہائے متحدہ کے محکمۂ زراعت کی طرف سے حال میں ایک جریدہ شائع ہوا ہے۔ جس میں مذکور ہے کہ خشک کاشت سے صرف یہ مراد نہیں کہ جسقدر نمی میسر آسکے اس کو محفوظ رکھ کر ایسے مقامات میں کاشت کی جائے جہاں بارش معمولی یا غیر معین ہو۔ بلکہ ایسے مقامات میں بھی کاشت کرنا مقصود ہے جہاں بارش سراسر ناکافی ہوتی ہو۔

باب ۶
زراعتی تعلیم

اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ کاشتکاروں کی اصلاح حال کے واسطے زراعتی تعلیم لابد ہے۔ زراعتی تعلیم کے اسکول اور کالج جرمنی میں بکثرت قائم ہیں۔ جن کی بدولت وہاں کی زراعت میں حیرتناک ترقی نمودار ہو رہی ہے لیکن زراعتی تعلیم سے پہلے عام تعلیم دینا بھی ضروری ہے سبپور اور چند دیگر مقامات میں سرکار کی طرف سے زراعتی تعلیم کا انتظام موجود ہے۔ حال میں بمقام پوسا اور سابور زراعتی کالج کھلے ہیں لیکن سرکاری مدارس میں جس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے اس سے کوئی عملی نتیجہ نہیں نکلتا سبپور کالج کے سابق لکچرار مسٹر مکرجی کا قول ہے کہ نہ تو کھیتی باڑی کا مزدور یا کاشتکار بالعموم زراعتی تعلیم کی پروا کرے اور نہ زمیندار یہ زراعتی مدارس تعلیم یافتہ لوگوں مثلاً یونیورسٹی کے گریجویٹ وغیرہ کے واسطے موزوں ہیں۔ لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ جو لوگ ان مدارس سے تعلیم پا کر نکلتے ہیں وہ بطور خود کھیتی باڑی نہیں کرتے۔ بلکہ ان کی بھی یہی کوشش ہوتی ہے کہ کہیں سرکاری ملازمت ملجائے۔ زراعتی تعلیم اسی حالت میں حقیقی طور پر مفید ہو سکتی ہے جبکہ اس کے دو درجے ہوں، اعلیٰ اور ادنیٰ پہلا زراعتی ماہرین اور منتظمین کے واسطے، اور دوسرا خود کاشتکاروں کے واسطے، تاکہ ان کو اپنے کام میں مدد ملے۔

کاشتکاری کی خاص باتیں اور ترقی زراعت کی کچھ صورتیں اوپر بیان ہوئیں۔ زراعت میں ہندوستان کو بہت سے قدرتی فوائد حاصل ہیں اور اگر ان سے پورے طور پر کام لیا جائے تو ملک کی دولت میں بہت اضافہ ممکن ہے۔ اول تو زراعت فی نفسہ بہت کچھ اہم ہے۔ دوسرے بہت سی صنعتوں کی ترقی بھی اسی پر منحصر ہے۔

# ساتواں باب

## معدنیات

کان کنی بھی زراعت سے ملتی جلتی ہوئی صنعت ہے دونوں کاموں کا مقصود وہی زمین سے خام پیداوار کا نکالنا ہے - جیساکہ اوپر بیان ہو چکا ہے ہندوستان میں تقریباً ہر قسم کی معدنیات بکثرت موجود ہیں - چنانچہ سرکار ہند کے محکمۂ اراضیات کے ناظم مسٹر ٹامس ہالینڈ نے صنعت و حرفت کی کانفرنس کے دوران ۱۹۰۵ء میں جو مضمون پڑھا تھا - اس میں اس واقعے کی تصدیق کی ہے - اگر کافی اصل میسر ہو کاروبار میں اولوالعزمی بڑھے اور صنعت و حرفت کی تعلیم بھی حاصل ہو جائے تو معدنیات کی قسم سے شاید ہی کوئی چیز ہو جو یہاں دستیاب نہ ہو سکے -

قدیم معدنی اور کیمیائی صنعتوں کے زوال سے ہندوستان میں کان کنی کو بھی سخت نقصان پہنچا - یا تو صرف وہ معدنیات نکلنے لگیں جو سیدھے سادھے طریق سے کام میں آجاتی ہیں - یا جو بوجہ کثرت و ارزانی بطور خام پیداوار کے ملک سے باہر جانے کے واسطے موزوں ہیں - تاہم گزشتہ چند سال میں ایسے حالات پیدا ہو چلے ہیں کہ جن کی وجہ سے یورپ کے طریق پر ان صنعتوں کو دوبارہ ترقی ہو گئی - جن میں آہن خام اور دوسری معدنیات کام آتی ہوں - سر ٹامس ہالینڈ فرماتے ہیں اب موقع آگیا ہے کہ لوہا اور فولاد خود ہندوستان میں تیار کیا جائے اور یہی وہ دو چیزیں ہیں کہ جن کی قیمت معدنیات کی درآمد میں سب سے بڑھی رہتی ہے - تانبے سیسے وغیرہ پر بھی لوگ توجہ کرنے لگے ہیں اور سرگرمی سے اجرائے کاروبار کی تیاریاں ہو رہی ہیں -

معدنیات کی مجموعی پیداوار

گزشتہ دور میں ہندوستانی معدنیات کی پیداوار بہت بڑھ گئی - یہاں کی

معدنی پیداوار کی سالانہ مجموعی قیمت ساڑھے بارہ کروڑ روپیہ رہتی ہے۔ کوئلے کا نمبر سب سے اول ہے کیونکہ تنہا اس کی قیمت کا تخمینہ ساڑھے پانچ کروڑ روپے سے زائد ہوتا ہے۔ جو ایندھن باہر سے آتا تھا اب اس کے بجائے یہیں کا کوئلہ کام آتا ہے۔ ابھی ہندوستان میں کوئلے کی کانیں بہت کم گہری کھدی ہیں، صرف ایک غار ایسا ہے جو آٹھ سو فیٹ سے زیادہ گہرا کھدا ہے۔ حالانکہ دوسرے ملکوں میں کانوں کی گہرائی اس سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ ہندوستان میں کوئلے کی تقسیم غیر مساوی ہے۔ کہیں بہت زیادہ ملتا ہے کہیں بالکل نہیں ملتا۔ کوئلے کا ایک قطعہ ہے جس کو گونڈوانا خطہ کہتے ہیں۔ ۹۵ فیصدی کوئلہ تو وہاں سے نکلتا ہے اور ۵ فیصدی باقی تمام ہندوستان سے۔ ناگپور میں جو بمقام جھریا کوئلے کی کانیں ہیں مجموعی پیداوار کی نصف سے زیادہ مقدار صرف وہیں سے نکلتی ہے۔

صنعتوں کی مسابقت میں کوئلے کو بہت دخل ہے اور جوں جوں ملک میں صنعتیں ترقی کریں گی کوئلے کی ضرورت بڑھتی جائے گی۔ بقول مسٹر منی کے اپنے ملک کا کوئلہ گویا اپنے قبضے میں بہت سی طاقت ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ قدرت نے ایسی طاقت کے عظیم الشان ذخیرے مرحمت کیے ہیں کہ جن کے ذریعے سے عجیب و غریب کلیں چلتی ہیں اور اس سے حسب دلخواہ روشنی، حرارت اور برقی قوت حاصل ہو سکتی ہے۔ واضح ہو کہ انگلستان میں جو صنعتوں کو اس قدر ترقی ہوئی اس کا ایک خاص باعث کوئلے کی افراط بھی ہے۔ اس چھوٹے سے ملک میں کوئلے کی سالانہ پیداوار سنہ ۱۹۱۰ء میں ۲۶ کروڑ ۴۰ لاکھ ٹن تھی۔ حالانکہ سنہ ۱۹۱۴ء میں ہندوستان کی پیداوار ڈیڑھ کروڑ ٹن سے کچھ ہی زیادہ تھی۔ لیکن دنیا کی مجموعی پیداوار کے حساب سے انگلستان میں پیداوار کا اضافہ کم ہوتا جاتا ہے چنانچہ سنہ ۱۸۷۰ء میں انگلستان کا کوئلہ جس کی مقدار ۱۳ کروڑ ۳۰ لاکھ ٹن تھی دنیا بھر کی مجموعی پیداوار کا ۴۸ فیصدی رہا۔ اور سنہ ۱۹۱۰ء میں پیداوار کی نسبت ۲۳ فیصدی رہ گئی۔

سونا

کوئی ساڑھے تین کروڑ روپیہ قیمتی سونا ہر سال یہاں نکلتا ہے سنہ ۱۹۱۰ء میں ہندوستان سے حسب ذیل سونا برآمد ہوا۔

| کمپنی کا نام | مقدار طلا بحساب اونس | منافع فیصدی |
|---|---|---|
| میسور | ۲۳۰۵۷۷ | ۱۱۵ |
| نندی ڈرگ | ۸۶۱۱۰ | ۴۱ ۲/۳ |
| اوری گم | ۹۱۷۹۱ | ۳۲ ۱/۲ |
| چمپین ریف | ۱۱۳۵۴۰ | ۲۳ ۱/۳ |
| بالا گھاٹ | ۱۷۰۰۹ | |

میسور میں بمقام کولار سب سے بڑی طلائی کانیں ہیں۔ خدا جانے کس زمانے سے لوگ قدیم طریق پر یہاں سے سونا نکالا کیے حتی کہ یوروپی پیشہ وروں نے کانوں کو آکر سنگوایا اور کان کنی پیمانۂ کبیر پر شروع کردی۔ اس طریق سے گزشتہ پچیس سال کے اندر کوئی ساٹھ کرور روپیہ قیمتی سونا ان کانوں سے نکالا جا چکا ہے۔ بعض دریاؤں کی تہ کی مٹی کو دھو دھو کر بھی سونا نکالتے ہیں۔ چنانچہ دریائے اراودی پر یہ کام خاص طور سے جاری ہے۔ لیکن ایسے سونے کی پیداوار کے متعلق پورے اعداد و شمار نہیں ملتے۔

مٹی کا تیل — ہندوستان کی معدنیات میں مٹی کے تیل کا تیسرا نمبر ہے۔ اس کی سالانہ پیداوار کی قیمت ڈیڑھ کرور روپے سے زیادہ رہتی ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں دوسری معدنیات کے مقابل مٹی کا تیل نکالنے میں بہت زیادہ ترقی ہوئی ہے کوئی تیس سال ہوئے جب سے تیل نکالنے کے طریق یورپ والوں کی طرح اختیار کیے گئے اس وقت سے اس کی پیداوار برابر بڑھ رہی ہے۔

مینگنیز — شاید ہی کسی دوسرے ملک میں عمدہ قسم کا مینگنیز اس قدر ملتا ہو جتنا کہ ہندوستان میں سالانہ پیداوار کی قیمت پونے دو کرور روپے سے زیادہ رہتی ہے ابھی تک تو صرف عمدہ قسم کے فلز نکالتے ہیں۔ لیکن فولاد سازی کی صنعت ترقی کرے تو غالباً ادنیٰ قسم کے فلز نکالنے میں بھی فائدہ رہے گا۔ کانوں کے پاس فلز صاف کرنے والی کلیں موجود نہیں۔ اس وجہ سے فلز جیسا کان سے نکلتا ہے دوسرے ممالک کو بھیجدیا جاتا ہے۔

ابرک — ابرک کی پیداوار میں ہندوستان سدا سے پیش پیش رہا ہے۔ اب بھی دنیا

کی مجموعی پیداوار کے نصف سے زیادہ ابرک یہیں سے نکلتی ہے۔ سالانہ پیداوار کی قیمت، پچاس لاکھ روپے کے قریب رہتی ہے۔

دوسری خاص خاص معدنیات یہ ہیں۔ نمک، یاقوت، Iadestone سیسہ، ٹین، اور Monazite جب سے ٹاٹا آہن کمپنی قائم ہوئی لوہے کی پیداوار میں معتد بہ اضافہ ہو رہا ہے۔

قانون معدنیات کے تحت میں جسقدر کانیں آئیں ان کی مجموعی تعداد ۱۹۱۳ء میں ۱۱۴۷ تھی ان میں سے ۷۲۵ کوئلے کی کانیں تھیں جن میں سے ۳۴۹ صرف بہار واڑیسہ میں واقع ہیں۔ ۴۷۳ ابرک کی کانیں تھیں ان میں سے بھی ۳۹۵ بہار واڑیسہ میں موجود ہیں ۴۷ کانیں مینگنیز کی تھیں۔ کل کانوں میں مزدوروں کا روزانہ اوسط ۱۶۴۳۰۲ ہے۔ جن میں سے ۱۰۱۹۷۱ مرد تھے۔ ۵۶۵۰۷ عورتیں اور ۵۸۲۴ بچے اور ۱۰۳۹۸۰ مزدور زمین کے اندر کام کرتے تھے۔ مزدور بہت ہی ان گڑھ ہیں۔ کوئی مہارت نہیں رکھتے۔ اور ہر وقت نگرانی کے محتاج ہیں سخت ضرورت ہے کہ ملک کے نوجوانوں کو فن کان کنی کی تعلیم دی جائے تاکہ معدنیات کی مدد سے ملک کی صنعتوں میں ترقی ہو۔

کان کنی کا کاروبار بیشتر یورپ والوں کے ہاتھ میں ہے لیکن کس بنا پر باہر کے لوگوں کی شکایت کیجیئے۔ اگر ہو سکے تو خرابی کے اسباب دریافت کر کے اس کی اصلاح کرنی چاہیئے۔ تمام خرابی کی اصل وجہ یہی ہے کہ نہ تو یہاں کے لوگوں میں اولوالعزمی اور نہ ان کی گرہ میں اصل، اور اس پر طرہ یہ کہ صنعت وسائنس کی تعلیم بھی یہاں عنقا ہے۔ امید ہے کہ جن لوگوں کے پاس اصل ہے وہ آیندہ اس کو کان کنی کی صنعتوں میں لگائیں گے اور سرکار کو بھی چاہیئے کہ فن کان کنی سیکھنے میں یہاں کے لوگوں کو مدد دے۔

# آٹھواں باب

## مصنوعات

ہندوستان کی سابق صنعتیں

آج کل صنعت وحرفت کے میدان میں ہندوستان بہت پیچھے نظر آتا ہے۔ لیکن ایک زمانہ وہ بھی گزر چکا ہے جبکہ ہندوستان دنیا بھر میں صنعتوں کا ایک بڑا مرکز بنا ہوا تھا۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ اٹھارہویں صدی تک صنعتوں کے لحاظ سے ہندوستان یورپ کے ہمپلہ تھا اور بہت سے دور دراز ممالک میں اس کی مصنوعات ہاتھوں ہاتھ پہنچتی تھیں۔ اب سے کچھ سال پہلے تک یہاں مصنوعات دستکاری سے تیار ہوتی تھیں لوگ کلوں کے بجائے سب کام ہاتھ سے کرتے تھے۔ یہاں کے صناعوں کی دستکاری میں اس بلا کی نفاست اور نزاکت ہوتی تھی کہ دوسرے ملک کے صناعوں کو ان پر سبقت پانی محال تھی ان کے ہاتھ کی سبکی اور صفائی کچھ تو پیدائشی کمال سمجھنا چاہیئے جو باپ دادا کی میراث میں پہنچتا تھا اور کچھ مشق اور تجربے سے یہ بات حاصل ہو جاتی تھی۔ نہ صرف یہ کہ وہ روزمرہ کی ضروری چیزیں بناتے ہوں بلکہ بڑی بڑی لاجواب مصنوعات تیار کرتے تھے۔ جن میں فن کا کمال نظر آتا تھا۔

مصنوعات کی عمدگی۔

فلزاتی صنعتیں ان سے بڑھ کر پارچہ بافی ملک کے بہت سے حصوں میں خوب پھیل گئی تھی۔ ایک فاضل رقمطراز ہیں کہ صنعتوں میں اہل ہنود نے بہت پیشتر کے زمانے میں غضب کا کمال حاصل کر لیا تھا حتیٰ کہ روم کے شاہی دربار ہندوستان کے نقرئی اور طلائی بافتوں سے زرق برق بنے رہتے تھے آج سے صدیوں پہلے ڈھاکے کی ململیں تمام مہذب ممالک میں مشہور تھیں۔ یہاں کے پارچے کہ جن کی نفاست دنیا بھر میں بے مثل تھی۔ یہاں کے مشجر کہ جن میں جگمگاتے جواہرات ٹکے ہوتے تھے بیش قیمت زردوزیاں اور کشیدے کمخواب، زربفت اور تاش بادلے، عجیب غریب بوقلمون قالین، نہایت درخشاں مینا کاریاں، وہ نازک پچہ کاریاں کہ بڑی بڑی خورد بینوں

سے کہیں باریک اجزا کا پتا چلے تو چلے۔ ساز و سامان پر نہایت ہی عمدہ بڑے اہتمام کا نقش و نگار۔ طرح طرح کی شکل و صورت کی نہایت عمدہ خمیر کی تلواریں۔ یہ سب چیزیں اب بھی موجود ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ کسی زمانے میں یہاں بھی صنعتوں نے کیا کمال پایا تھا۔ علیٰ ہذا مسٹر مارٹن اپنی کتاب سلطنت ہند میں تحریر فرماتے ہیں کہ جس زمانے میں برطانیہ کے وحشی باشندے اپنے جسم رنگتے تھے تار عنکبوت کی سی باریک ڈھاکے کی ململ، کشمیر کے نفیس شال، اور دہلی کے کارچوب ریشم، قیصر روم کے دربار میں بڑے بڑے نازنین حسین زیب تن کرتے تھے۔ دھات کا بنتی سامان، ہاتھی دانت، آبنوس، اور صندل پر کیسے خوشنما نقش و نگار اور گلکاریاں، کیا ہی خوشنما چھینٹیں، ہیرے، جواہر اور موتی کس نفاست سے جڑے ہوئے زردوز مخملیں اور قالین۔ کیسا پختہ فولاد، نہایت عمدہ چینی۔ اور اعلےٰ درجے کا بحری سامان کشتی اور جہاز وغیرہ صدیوں دنیا کی مہذب قومیں ہندوستان کی ان مصنوعات پر عش عش کرتی رہیں۔ اور جبکہ کوئی لندن کا نام بھی نہیں جانتا تھا ہندوستان دنیا کا سب سے زیادہ ہرا بھرا بازار تھا۔ بقول سر ولیم ہنٹر کے ہندوستان کی قدرتی دولت اور اس کے وسیع بحری ساحل سے کہیں زیادہ اس کے باشندوں کی صنعت گری میں خداداد ذہانت اور قابلیت ایشیا بھر کا سرتاج بنائے ہوئے تھی صنعتیں اور دستکاریاں اچھے خاصے بڑے پیمانوں پر جاری تھیں اور انھیں کی بدولت بہت سے دولتمند اور وسیع شہر و قصبے آباد ہو گئے۔

زوال کے اسباب

اٹھارہویں صدی کے آخر میں یورپ کی صنعتوں میں انقلاب شروع ہوا۔ اور صنعت و حرفت کے قدیم طریق بدل کر بالکل نئے ہو گئے۔ مصنوعات کی تیاری میں محنت اور سامان کی کفایت نکال کر اور بچی کھچی چیزوں کو کام میں لا لا کر وہاں کے لوگ مصنوعات نہایت ارزاں تیار کرنے لگے۔ ہاتھ کے بجائے کلوں سے کام ہونے لگا ہر صنعت میں اصل پر مقدار کثیر لگا دی گئی پیمانۂ صغیر کے بجائے پیمانۂ کبیر پر کاروبار جاری ہونے لگے۔ اور تنظیم میں بھی بہت اصلاح اور ترقی ہو گئی۔ ان بڑی بڑی تبدیلیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیداوار کی قوت بہت کچھ بڑھ گئی۔ لیکن ہندوستان ان ترقیوں سے الگ تھلگ رہا۔ ہندوستانی دستکار وہی اپنے باپ دادا کی طرح کام کیا کیے ان کے پاس نہ زیادہ

اصل نہ کوئی کل اور نہ خاص تنظیم۔ حسب سابق ہر شخص خود ہی اپنے اپنے طور پر کام کرتا رہا۔ آلات و اوزار بھی وہی رہے جو پہلے سے چلے آتے تھے۔ دستکاروں میں کوئی امداد باہمی کا طریق نہ تھا اور تقسیم عمل کا دائرہ بھی بہت محدود تھا۔ ایسی کوئی کوشش نہیں کی گئی کہ یہاں کی صنعتوں کو نئے طور و طریق پر چلا کر اس میں نئی جان ڈالی جاتی۔ اور سب سے بڑی مصیبت یہ آن پڑی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور حکومت برطانیہ نے ایسی چالیں چلیں اور جال پھیلایا کہ یہاں کی دستی صنعتیں بے دست و پا ہونے لگیں۔ کچھ دنوں تو ہاتھ پاؤں مارے بھی لیکن آخر بدیسی صنعتوں کی سابقت میں نڈھال اور پامال ہو گئیں۔ اور کیوں نہ ہوتیں خود سرکار بدیسی صنعتوں کی طرفدار بن گئی نتیجہ یہ ہوا کہ گزشتہ صدی کے وسط میں دیکھا تو ہندوستان محض ایک زراعتی ملک رہ گیا۔ قدیم مشہور آفاق صنعتوں کا نام و نشان بھی نہ رہا۔

سر ولیم ہنٹر اس دردانگیز سرگزشت کو یوں بیان فرماتے ہیں۔ بہت سے ناموافق اسباب نے متفق ہو کر گزشتہ صدی میں ہندوستان کی صنعتوں کو صدمہ پہنچایا۔ اول تو خود انگلستان کی عنایت ملاحظہ ہو۔ ہندوستان کے بنے ہوئے کپڑوں پر بڑھا بڑھا کر محصول درآمد لگانے سے بھی کام نہ چلا تو ان کی درآمد ہی روک دی۔ ہندوستانی کپڑوں کا انگلستان میں آنا ممنوع قرار پایا۔ البتہ جزائر غرب الہند میں ہندوستانی سامان کے خریدار باقی رہ گئے سو فیشن بدلتے بدلتے وہاں کا بازار بھی ہاتھ سے نکل گیا پھر جو نئی نئی کلیں لنکاشائر میں جاری ہوئیں تو وہاں بہت ارزاں کپڑا تیار ہونے لگا۔ سب پر طرہ یہ کہ امریکن جنگ کے زمانے میں جو روئی کی قیمت بہت چڑھ گئی تو اس سے کاشتکار کو کچھ عارضی فائدہ پہنچا۔ لیکن دیسی پارچہ بافی کا کاروبار بالکل بیٹھ گیا اس کے علاوہ جب ہندوستانی بادشاہوں کی سرکاریں اجڑ گئیں تو گراں بہا قماش کے خریدار کہاں سے آتے۔ اول بڑے بڑے ماہر صناع اور دستکار یوں کس مپرسی کے ہاتھوں تباہ ہوئے دوسرے اسی زمانے میں انگریزوں نے بہت بہت سا اصل لگا کر قدرت کی قوتوں مثلاً بھاپ اور برقی طاقت سے کام لینا شروع کیا۔ بھلا ہندوستان کے جاہل اور نادار دستکاروں کی کیا بساط جو ان سے مسابقت کا دم بھرتے حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ غریب جولاہے

کو گرگھا چھوڑ ہل جوتنا پڑا۔ اسی طرح اور بہت سی صنعتیں اور دستکاریاں برباد ہوئیں۔

مشہور مورخ مسٹر ولسن کا قول بھی سننے کے قابل ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ہندوستان کو جس ملک پر بھروسا تھا یعنی انگلستان ہی نے اس کے ساتھ برائی کی۔ اس کی نہایت افسوسناک مثالیں موجود ہیں۔ کمیشن کے روبرو شہادت میں یہ بیان کیا گیا کہ ہندوستانی سوتی اور ریشمی پارچے انگلستان کے بنے ہوئے پارچوں کے مقابل خود انگلستان میں اکثر ۵۰-۶۰ فیصدی کم قیمت پر فروخت کرنے سے بھی معقول منافع مل سکتا تھا۔ گویا ہندوستان میں مقابلۃً ارزاں کپڑا تیار ہوتا تھا۔ غرض انگلستان کی پارچہ بافی کو ہندوستان کی مسابقت سے بچانے اور ترقی دینے کے لیے ہندوستانی کپڑوں کی درآمد پر انگلستان میں ۷۰ اور ۸۰ فیصدی محصول لگا دیا اور جب اس سے بھی ہندوستانی کپڑوں کی رونہ رکی تو ان کی درآمد قانوناً ممنوع قرار دیدی گئی۔ اگر درآمد پر ایسے ایسے محصول درآمد نہ لگتے اور یوں قطعی ممانعت نہ ہوتی تو شروع ہی میں پیزلی اور مینچسٹر کے کارخانے بند ہو جاتے اور دخانی طاقت سے بھی دوبارہ نہ چل سکتے۔ اگر وہ کارخانے جمے اور بڑھے تو ہندوستانیوں کے ایثار اور زیر باری کے ذریعے سے اگر ہندوستان خود مختار اور آزاد ہوتا تو وہ بھی انگلستان سے بدلا لیتا۔ وہ بھی اسی طرح انگریزی مصنوعات کی درآمد پر بڑے بڑے محصول لگاتا اور اپنی صنعتوں کو تباہی سے بچا لیتا۔ اس کو اپنی حفاظت کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ کیونکہ وہ تو غیروں کا محتاج تھا۔ کوئی محصول درآمد لیے بغیر انگریزی مصنوعات کے یہاں انبار لگا دیے المختصر جب بدیسی حریف مسابقت کی تاب نہ لاسکے تو اس طرح پر حکومت کے ہاتھ سے بے انصافی کرا کر انھوں نے ہندوستانی صناع اور دستکاروں کو پیس ڈالا اور آخر کار انکا خاتمہ کر دیا۔

حاصل کلام یہ کہ عرصے تک صنعتیں اور کاروبار میں اولوالعزمی مردہ پڑی رہی چند روز سے البتہ کچھ جنبش شروع ہوئی ہے لیکن اب تو اور بھی قدم قدم پر دقتوں کا سامنا ہے اس زمانے میں صنعتیں اسی وقت سرسبز ہو سکتی ہیں جبکہ تعلیم یافتہ ہندوستانی ان کو اپنے ہاتھ میں لیں۔ لیکن ان میں کاروبار کرنے والوں کی اسی

سمجھ بوجھ نہیں اور اُن کو ایسی تعلیم نہیں ملی کہ وہ اس کی مدد سے آجر یا منتظم کی گوناگوں خدمتیں اچھی طرح پر انجام دے سکیں۔ معمولی تعلیم یافتہ ہندوستانی کے پاس اسقدر اصل نہیں ہے کہ مناسب پیمانے پر کوئی کام شروع ہو سکے اور ایسے بنک نایاب ہیں جو اس کو کاروبار کے واسطے قرض دیں۔ ایسے لوگوں سے کام لینے کا اس کو مقدور نہیں جو کاروبار کی ضروری معلومات اور سائنس میں مہارت رکھتے ہوں۔ ان حالات سے اس قدر ہمت پست ہو گئی ہے کہ وہ مایوس ہو کر کاروبار کے خیال ہی کو دل سے نکال ڈالتا ہے۔ اور اگر بہت ہی پُر جوش اور دھن کا پکا ہوا تو ایسے نادانی کے منصوبے باندھتا ہے کہ ان کا نتیجہ ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

ان تمام دقتوں پر بھی جو ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ گزشتہ دو قرنوں یعنی بیس پچیس سال سے کچھ کچھ ترقی ہو چلی ہے۔ اب لوگوں کو امداد باہمی اور اتحاد عمل کی قدر معلوم ہونے لگی۔ کاروبار کی طرف سے جہالت اور برگشتگی گھٹتے گھٹتے اب ایک نیا ولولہ اور کاروبار کرنے میں اولوالعزمی نمودار ہو رہی ہے تعلیم یافتہ ہندوستانی تعلیم صنائع کی طرف روز بروز بڑھ رہے ہیں تاکہ قدرت کے عطیوں کو بطریق احسن کام میں لا سکیں یہاں کے اصل کا محجوب رہنا جو ضرب المثل بن گیا تھا بتدریج رفع ہو رہا ہے۔ بعض لوگ اپنے اندوختوں سے اصل کے طور پر کام لینے لگے ہیں۔ یہ نہیں کہ اس کو بطور دفینہ بیکار ڈال رکھیں دستکاری کے بجائے اب بھاپ اور برقی طاقت کا رواج بڑھ رہا ہے۔ برقی طاقت پیدا کرنے کا اہتمام ٹاٹا برقی کارخانے کے نام سے بمبئی کے قریب حال میں کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ اس سے پارچہ بافی وغیرہ کے کارخانوں کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ اور بڑی بات ہے کہ یہ کارخانہ خالص ہندوستانی اصل سے قائم ہوا ہے۔ یعنی ہندوستانیوں نے اس میں روپیہ لگایا ہے اور اس کے کل منتظم بھی ہندوستانی ہی ہیں۔ اسی طرح ریاست میسور میں دریائے کاویری کے آبشار پر برقی طاقت پیدا کرنے کا کارخانہ پہلے سے موجود ہے۔ چنانچہ کولار کی طلائی کانوں میں بہت سا کام اسی برقی طاقت سے ہوتا ہے اور یقین ہے کہ اس قسم کے کارخانے اور بھی جابجا قائم ہوں گے۔ کوشش یہ ہو رہی ہے کہ قدیم صنعتوں کو پھر زندہ کیا جائے۔

اور نئی نئی صنعتیں بھی ہر طرف ابھر رہی ہیں۔

خاص خاص صنعتیں۔

خاص خاص صنعتوں کی مختصر کیفیت بیان کرنے سے واضح ہوگا کہ آج کل بلحاظ صنعت و حرفت ملک کی کیا حالت ہے۔ صنعتوں کی قسمیں بالعموم حسب ذیل شمار ہوتی ہیں۔ (۱) پارچہ جات (۲) ماکولات و مشروبات (۳) فلزاتی مصنوعات و معدنیات و جواہرات (۴) شیشے، مٹی، پتھر کے برتن (۵) عمارتی سامان (۶) روشنی ایندھن اور چارہ (۷) گاڑی اور کشتیاں (۸) چوبینہ بینت اور پتے (۹) ادویات اور رنگ (۱۰) چمڑا، سینگ۔ (۱۱) ضمنی ضروریات کی چیزیں۔

پارچہ بافی

زراعت کے بعد ملک کی سب سے بڑی صنعت پارچہ بافی ہے۔ باریک کپڑے بننے میں دستی کرگھے کسی زمانے میں بہت کمال کو پہنچ گئے تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی ململ کی نفاست و نزاکت دنیا بھر میں لاجواب مانی جاتی تھی۔ پارچہ بافی کے ابتدائی کام روئی اوٹنا، صاف کرنا، دبانا، اور سوت کاتنا یہ سب بھی بجائے خود بہت اہم ہیں۔ پہلے زمانے میں تو عورتیں دستی چرخوں سے کپاس اوٹا کرتی تھیں۔ لیکن اب روئی اوٹنے کی کلیں نکل آئی ہیں جو بھاپ کے زور سے چلتی ہیں۔ جن کارخانوں میں کپاس اوٹتی ہے بالعموم وہیں روئی صاف ہوکر اس کی گانٹھیں بندھ جاتی ہیں۔ سوت کی کتائی ایک گھریلو صنعت تھی اور کسی حد تک اب بھی ہے۔ عورتوں کا خاص مشغلہ یہی رہتا تھا۔ کتائی کا دیسی طریق ہے تو سست مگر سستا ضرور ہے۔ مسٹر ہادل کا خیال ہے کہ اس طریق میں ترقی کی گنجائش نہیں۔ کتائی کے کارخانے جاری ہونے ضروری ہیں۔ مینچسٹر کے کارخانوں کی مسابقت سے یہاں کے دستی کرگھوں کو بہت زک پہنچی اور لاکھوں پارچہ بافوں کا روزگار مارا گیا۔ بنگال کے نوربافوں کو جن کا شہرہ کبھی تمام یورپ میں پھیلا ہوا تھا۔ بیرونی مسابقت سے بہت نقصان اٹھانا پڑا۔

دستی کرگھے

پارچہ بافی کے کارخانے ملک کے مختلف حصوں میں کھل چکے ہیں۔ لیکن اب بھی آبادی کا بیشتر حصہ دستی کرگھے پر کام کرتا ہے۔ دستی کرگھے کی بنائی کل کی بنائی سے زیادہ گراں پڑتی ہے۔ مسٹر چیٹرجی نے تخمینہ لگایا ہے کہ ایک پونڈ کپڑا

بننے کا خرچ انگلستان کے کارخانوں میں ۱۴ پائی۔ ہندوستان کے کارخانوں میں ۱۷ پائی۔ اور یہاں کے عمدہ دستی کرگھے میں کم از کم ۲۱ پائی پڑتا ہے لیکن بعض ماہرین کا خیال ہے کہ کرگھے میں چند خوبیاں بھی ایسی موجود ہیں جو اس کی سفارش کرتی ہیں۔ اول تو اس سے کپڑا بننے میں تھوڑا بہت اصلی قائم درکار ہے۔ دوسرے موٹے جھوٹے کپڑے جسقدر مضبوط اور پائدار کرگھے میں تیار ہوتے ہیں، کل سے نہیں ہوتے۔ تیسرے ایشیائی وضع کے اعلے زیبائیشی اور بوقلموں کپڑے دستی کرگھے کے سوا کسی کل سے تیار نہیں ہو سکتے۔ دستی بننے والوں کی مہارت موروثی ہوتی ہے۔ بچپن ہی سے اپنے باپ دادا سے کام سیکھتے ہیں۔ تھوڑی سی آمدنی میں ان کی بسر ہو جاتی ہے اور پارچہ بافی کے ساتھ ساتھ وہ اور کام بھی کرتے رہتے ہیں۔ خصوصاً زراعت۔ اس لیئے وہ تھوڑے سے منافع پر کام چلا سکتے ہیں۔ مستورات جو رسم ورواج کی وجہ سے کارخانوں میں کام نہیں کر سکتیں۔ دستی کرگھوں سے اپنا کام کرتی رہتی ہیں۔ نوربافت چونکہ اپنے طور پر کپڑا بنتا ہے۔ وہ کارخانے کے مزدوروں کے مقابل اپنا کام دل سے کرتا ہے۔ اور اس کو زیادہ توجہ وکوشش سے انجام دیتا ہے۔

محض اس بناء پر کہ باوجود اس قدر ناقدری کے دستی کرگھے بالکل بند نہ ہو سکے بعض لوگوں کو امید ہے کہ وہ دوبارہ چل نکلیں گے۔ بلکہ مسٹر ہاول چیسٹرٹن کا تو خیال ہے کہ اگر اس کی اصلاح اور ترقی ہو جائے تو وہ اب بھی کلوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ دوسرے ماہر اس خیال میں شریک نہیں۔ بلکہ ان کی رائے میں یورپ والوں کی مسابقت کو برداشت کرنے کی یہی سبیل ہے کہ یہاں بھی کارخانے جاری ہو جاویں۔

دیسی کرگھوں کی پارچہ بافی کو ترقی دینے کے متعلق وقتاً فوقتاً جو تجویزیں پیش ہوتی رہی ہیں ان میں سے چند خاص طور پر قابل ذکر ہیں اول تو ابتدائی تعلیم کی اشاعت تاکہ قوم کی ذہانت اور دماغی قابلیت ابھرے۔ دوسرے عمدہ کرگھوں کی ترویج تیسرے ابتدائی کاموں کی اصلاح اور ترقی، چوتھے نوربافوں میں طریق امداد باہمی رائج کرنا۔ پانچویں جو جو تجربے کامیاب اور کارآمد ثابت ہوں

ان کو جولاہوں کے روبرو پیش کرنا۔ چھٹے اعتبار کی ارزانی یعنی کمتر شرح سود پر قرض ملنا۔ ساتویں ترقی یافتہ آلات خریدنے کے واسطے ان کو پیشگی روپیہ دینا۔ آٹھویں نوربافوں کی گاہکوں تک رسائی رہنا۔ تاکہ بازار کی مانگ سے وہ باخبر رہیں۔ نویں دستی کرگھوں کے چھوٹے چھوٹے کارخانے کھولنا۔

پارچہ بافی کے کارخانے

گزشتہ تیس بتیس سال کے اندر ہندوستان میں پارچہ بافی کے بہت سے کارخانے کھل گئے اور اس صنعت نے بمبئی اور صوبہ متوسط میں خصوصاً اچھی خاصی ترقی حاصل کر لی۔ سنہ ۱۸۸۱ء میں روئی کے ۵۵ کارخانے جاری تھے۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں ان کی تعداد بڑھ کر ۲۳۵ ہو گئی۔ جن میں ۲۱۲۷۹ مزدور کام کرتے تھے۔ ان کارخانوں کا بنا ہوا مال بدیسی مال سے عمدگی میں کسی طرح کم نہیں۔ لیکن اسکی مقدار بلحاظ ضرورت ابھی بہت کم ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے تقریباً ۶۶ کروڑ روپے کی قیمت کا سوتی کپڑا ہر سال باہر سے آتا ہے۔ اگر دیسی سوتی کپڑے پر سے محصول چنگی اُٹھا لیا جائے اور سودیشی تحریک کا جوش بھی قائم رہے تو ملک میں صنعت پارچہ بافی پھر ترقی کر سکتی ہے۔

ریشمی کپڑے

ریشمی کپڑا بننے کا طریق بھی وہی ہے جو سوتی کپڑے کا ہے۔ البتہ اس میں احتیاط زیادہ کی جاتی ہے اور اسی وجہ سے اس میں خاص قسم کے آلات استعمال ہوتے ہیں۔ ریشمی سامان زیادہ گھریلو صنعتوں کے طور پر تیار ہوتا ہے۔ دوسرے پیشوں کے ساتھ ساتھ لوگ یہ کام بھی کرتے رہتے ہیں۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ متوسط طبقوں کی مستورات بھی کام کر سکتی ہیں۔ ریشمی کپڑا بننے کے چند کارخانے بھی کلکتہ بمبئی میں کھل گئے ہیں۔

جالی بننا

جالی بننے کا کام بھی پارچہ بافی سے ملتا جلتا ہوا ہے۔ نئے نئے شوقوں نے اس صنعت میں بہت جان ڈال دی ہے۔ موزے، بنیان اور گلوبند، اسی صنعت کا نمونہ ہیں۔ مستورات چاہیں تو گھر بیٹھے چھوٹی چھوٹی مشینوں سے اجرت پر چیزیں بناتی رہیں۔ رسّے دری، قالین اور خیمے وغیرہ یہ چیزیں بھی روئی کی صنعتوں میں داخل ہیں۔ صوبہ متحدہ میں خاص کر دریاں بکثرت بنی جاتی ہیں۔ کپڑوں پہ سوزن کاری اور کشیدے بھی بہت پسند کیے جاتے تھے۔ لیکن

اب ان کا شوق گھٹ رہا ہے۔

اونی کپڑے — جرمن کے سستے مال کی مسابقت سے شمالی ہندوستان کی اونی صنعت کو بہت نقصان پہنچا۔ گزشتہ دس پندرہ سال سے اس صنعت کو جدید طریق پر چلانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ چنانچہ۔ پنجاب اور صوبہ متحدہ میں اونی کپڑا بننے لگے ہیں کچھ کارخانے بھی کھل گئے ہیں۔ منجملہ ان کے دھاریوال اور کانپور کے کارخانے بہت مشہور ہیں۔ صوبہ متحدہ میں بہت عمدہ اونی قالین بھی بننے لگے ہیں۔ اس صنعت کی ترقی میں ایک بڑی دقت یہ ہے کہ یہاں عمدہ اون کم ملتی ہے۔

جوٹ — بورے اور اسی قسم کی اور چیزیں جوٹ سے تیار ہوتی ہیں۔ گزشتہ نصف صدی میں اس صنعت نے بنگال میں ازحد ترقی کی ہے۔ بھاگیرتی دریا کے دونوں طرف کنارے کنارے بہت سے کارخانے پھیلے ہوئے ہیں اور مشرقی بنگال میں بھی جابجا قائم ہیں۔ لیکن یہ صنعت بہ تمام و کمال یورپ والوں کے ہاتھ میں ہے ہندوستانیوں کی بس اسی قدر شرکت ہے کہ وہ کارخانوں میں مزدوری کرتے ہیں۔ اصل اور منافع میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ کسی زمانے میں کاغذ سازی بھی ایک بڑی دستی صنعت شمار ہوتی تھی۔ لیکن اب تو اس کا تقریباً خاتمہ ہو گیا۔ کاغذ کے کارخانے البتہ بعض بعض شہروں میں قائم ہیں۔ مگر حالت ان کی بھی اچھی نظر نہیں آتی۔ ہندوستان میں کاغذ بنانے کے قابل بہت سی چیزیں موجود ہیں۔ مسٹر ریٹ جو کہ سرکار ہند کی طرف سے بطور ماہر فن اس صنعت کی ترقی کے واسطے مامور ہیں، فرماتے ہیں کہ شمالی اور متوسط ہند کی بیکار گھانس کا عمدہ کاغذ تیار ہو سکتا ہے۔ اور بانس کا گودا تو شاید عنقریب ہندوستان میں سب سے بڑھ کر کاغذ بنانے میں کام آنے لگے گا۔

رنگسازی — کسی زمانے میں رنگسازی بھی یہاں کی ایک بڑی صنعت تھی۔ گرچہ ہندوستانی رنگ مقابلۃً عمدہ اور دیرپا ہوتے تھے تاہم ان کے بجائے انیلین کے سستے رنگوں کا رواج بہت بڑھ گیا ہے۔ سرکار برطانیہ نے حال میں اس صنعت کی ترقی کے واسطے ایک معقول رقم منظور فرمائی ہے۔ کیا وجہ کہ سرکار ہند بھی اس طرز عمل کی تقلید نہ کرے اور ہندوستان میں رنگسازی کو ترقی نہ دے۔ رنگسازی کے

باب ۳

واسطے یہاں بہت سی چیزیں موجود ہیں۔ مثلاً نیل، کتھا، آل، کسم، لاک، اور ہلدی۔ کہیں کہیں تارکول سے بھی رنگ بننے لگے ہیں۔ لیکن ابھی بڑے پیمانے پر نہیں بنتے۔

**خوراک۔** دھان کوٹ کر چانول نکالنا، گیہوں پیسنا۔ ڈبل روٹی بسکٹ بنانا خوراک کی چیزوں کے متعلق جو یہ کام ہیں۔ صنعتوں میں داخل ہیں۔ بہت سے شہر اور قصبوں میں پون چکی یعنی آٹا پیسنے کے کارخانے کھل گئے ہیں۔ لیکن شمالی ہندوستان میں اب بھی بیشتر آٹا ہاتھ سے چکی کو پھرا کر پیستے ہیں۔ چانول نکالنے کی چھوٹی چھوٹی کلیں تو بکثرت چل نکلی ہیں۔ چھوٹی پون چکیوں کا رواج بھی بڑھتا جاتا ہے بنگال اور پنجاب میں کچھ کارخانے بسکٹ کے بھی کھل گئے ہیں۔

**شکر** شکر سازی بھی کسی زمانے میں ہندوستان کی بڑی صنعت شمار ہوتی تھی لیکن اب اس کی حالت بھی اچھی نظر نہیں آتی۔ صاف شدہ ہندوستانی شکر بدیسی شکر سے مسابقت نہیں کر سکتی۔ بڑی وجہ یہ کہ یہاں کا طریق شکر سازی ایسا ہے کہ مال بہت ضائع ہوتا ہے۔ ضرور ہے کہ اول تو عمدہ قسم نیشکر کی کاشت ہو دوسرے نیشکر پیلنے۔ رس ابالنے اور شکر صاف کرنے میں جدید ترقی یافتہ طریقوں سے کام لیا جائے۔ پھر امید ہے کہ اس صنعت میں دوبارہ جان پڑ جائے گی۔ مسٹر ہادی اور مسٹر چٹرجی وغیرہ نے جن تجربوں میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ان سے اس صنعت میں ترقی ضرور ہوگی۔ شکر سازی کے چند چھوٹے چھوٹے کارخانے جاری ہو بھی چکے ہیں۔ ایک بڑا کارخانہ بہار میں کھلا ہے لیکن روپیہ اور انتظام سب اہل یورپ کا ہے۔ خیر این ہم غنیمت است۔

**چمڑا** آج کل چرمی صنعت کو ہندوستان میں اچھا فروغ ہو رہا ہے کروم قسم کا چمڑا جسکی دباغت چند سال ہوئے اول اول مدراس میں شروع ہوئی تھی۔ اب تقریباً ہر جگہ تیار ہونے لگا ہے جابجا دباغت خانے کھل چکے ہیں۔ چرمی سامان کے خاص مرکز یہ ہیں۔ آگرہ۔ کانپور۔ کلکتہ، بمبئی، کٹک اور مدراس۔

**روغن** روغن اور روغنی تخموں سے بہت سی عمدہ صنعتیں وابستہ ہیں اور پھر بھی ان کی ترقی کے واسطے ابھی بہت گنجائش موجود ہے۔ یہی بنولہ ہے جسکی بدولت ریاستہائے متحدہ کو زیادہ تر یہ رتبہ حاصل ہے کہ صناع قوموں میں

باب ۵

اول درجے کی تیار ہوتی ہیں۔ اسی بنولے کی برآمد سے ہندوستان کو گویا کم خسارہ پہنچ رہا ہے۔ اگر جو جو صنعتیں اس سے وابستہ ہیں یہیں پھیل جاویں تو بالواسطہ اور بلا واسطہ بہت کچھ منفعت کا ذریعہ ہوں۔

فلزاتی صنعتیں

فلزاتی صنعتوں میں البتہ مقامی دستکاریاں بہت بڑھی ہوئی ہیں، چنانچہ سر ٹامس ہالینڈ فرماتے ہیں کہ ہندوستانی لوہے کی عمدگی، فولاد سازی کی جو ترکیبیں آج یورپ میں مستعمل ہیں ان کا پہلے ہی سے یہاں رائج ہونا، تانبے اور پیتل کی نفیس اور خوشنما چیزیں۔ ان سب کی بنا پر یقین ہے کہ کسی زمانے میں ہندوستان فلزاتی صنعتوں کے میدان میں سب سے سربرآوردہ اور ممتاز رہ چکا ہے۔ تانبے، پیتل کے برتن جو گھر گھر کام میں آتے ہیں یوں تو اب بھی ہر ضلع میں تیار ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے خاص مرکز یہ ہیں۔ مرشد آباد، سری نگر، بنارس، مرزا پور، مراد آباد اور میسور، ملتان۔ کٹک۔ مدورا، پونا، دہلی اور لکھنؤ کے مرصع اور سادہ کار زیور ہندوستان بھر میں مشہور ہیں علاوہ بریں معمولی سنار اور زرگر ہر قصبے بلکہ دیہات تک میں رہتے ہیں۔ چند سال سے کہیں کہیں، چاقو۔ چھری۔ کانٹے وغیرہ بھی بننے لگے ہیں۔ کلکتہ علی گڑھ، اور ہاتھرس، میں قفل سازی کے کارخانے خوب چل رہے ہیں۔ اسٹیل ٹرنک یعنی لوہے کے بکس بھی بکثرت بنتے ہیں۔ ہر صوبے میں ان کے کارخانے کھلتے جاتے ہیں۔ گزشتہ بیس سال میں المونیم کی صنعت نے بھی مدراس میں خوب ترقی کر لی ہے۔ المونیم کے برتنوں کا رواج ہر طرف پھیل رہا ہے۔

لوہا

صنعت آہن گری کی ترقی میں ایک بہت بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی بھٹیوں میں لوہا پگھلانے کا جو قدیم طریق رائج ہے اس میں مال بہت ضائع جاتا ہے۔ حال میں کچھ کارخانے قائم ہوئے ہیں جہاں جدید طریق پر لوہا اور فولاد تیار کرتے ہیں۔ خصوصاً ٹاٹا آہنی و فولادی کارخانہ جو چھوٹے ناگپور میں قائم ہوا ہے بہت عمدہ سامان تیار کر رہا ہے۔ ریلوے کمپنیوں کے اپنے کارخانے بھی ہیں جن میں سے بعض بہت بڑے ہیں۔

شیشہ

بہت قدیم زمانے سے یہاں شیشے کا سامان تیار ہوتا چلا آتا ہے! وسرزمین

باب

کی ریہہ یا شور مٹی سے کانچ یعنی شیشۂ خام نکال کر اس سے چوڑیاں، بوتلیں، دواتیں، اور اسی قسم کا سامان بناتے ہیں۔ چند سال ہوئے مختلف مقامات پر شیشے کے کارخانے کھولے گئے جن میں بعض بند کرنے پڑے شمالی اور مغربی ہندوستان کے کارخانوں کو ایک بڑی دقت پیش آتی ہے وہ یہ کہ بھٹی کے واسطے کوئلہ بہت دور سے لانا پڑتا ہے۔ اس صنعت کی ترقی میں چند دقتیں اور بھی حائل ہیں۔ مثلاً ماہر کاریگر نہیں ملتے بھٹیوں کے متعلق یہ تجربہ نہیں کہ ہندوستان کی آب وہوا ان کے لیئے کیا کیا درکار ہے اور سب سے بڑھکر یہ کہ گرمی کے موسم میں یہاں شیشہ پھونکنا بہت دشوار ہے۔

چوبینہ — نجاری اور لکڑی کا کام اب تک دستی صنعتیں ہیں۔ البتہ آرہ کشی کے کارخانے جابجا کھل گئے ہیں۔

کیمیائی صنعتیں — بیرونی مسابقت نے ہندوستان کی سرسبز وشاداب کیمیائی صنعتوں کو بیخ وبن سے اکھاڑ ڈالا۔ بدیسی کیمیائی مصنوعات تمام ملک پر پھیل گئیں۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ ارزاں بہت ہیں اور کچھ اس لیئے کہ ان کی عمدگی کی یکسانی کا اطمینان ہوتا ہے۔ چند کارخانے ہندوستان کی قدیم کیمیائی مصنوعات کو زندہ کرنے میں بہت سرگرمی اور کامیابی دکھا رہے ہیں۔ خصوصاً بنگالی کیمیائی کارخانہ جو کلکتہ میں جاری ہے۔

عطریات — عطر اور پھلیل صوبۂ متحدہ کی خاص صنعتیں ہیں۔ غازی پور، جونپور، اور قنوج میں عطر، عرق گلاب، پھلیل اور دوسری خوشبوئیں بہت اعلیٰ قسم کی تیار ہوتی ہیں، کلکتہ۔ بمبئی اور دوسرے شہروں میں یورپ کے طرز کے کارخانے قائم ہوئے ہیں۔ صابون دیسی ترکیب سے بھی بنتا ہے۔ اور کہیں کہیں اس کے جدید طرز کے کارخانے بھی موجود ہیں خصوصاً میرٹھ اور کلکتے میں صابون کے کارخانے خوب چل رہے ہیں۔

تمباکو — تمباکو کی صنعت بہت پھیلی ہوئی ہے۔ اور برابر بڑھ رہی ہے اگر بدیسی تمباکو پر محصول درآمد بڑھا دیا جائے تو یہاں کی صنعت کو بہت امن اور مدد ملجائے۔

دودھ مکھن کے کارخانے — دودھ مکھن کے کام کو صنعت کے مقابل زراعت سے زیادہ تعلق ہے

اوراس کے ساتھ یہ کام خوب چل سکتا ہے ۔ ہندوستان کے سے زراعتی ملک میں تو اس کام کو خوب فروغ ہونا چاہیئے تھا ۔ لیکن افسوس ہے کہ اس کی حالت ابتر ہے ۔ ایک سبب تو یہ ہے کہ کام کا طریق بہت فضول سا ہے یعنی مال زیادہ ضائع ہوتا ہے ۔ دوسرے مویشیوں کی پرورش اور نسل کی طرف کوئی توجہ نہیں ۔ تیسرے عمدہ چراگاہیں میسر نہیں ہوتیں ۔ چنانچہ دودھ اور اس کی دوسری چیزیں مثلاً مکھن ، گھی ، مٹھا سب کی پیداوار گھٹ رہی ہے ۔ لوگوں پر لازم ہے کہ اس صنعت کو سنبھالیں جس سے ان کو بہترین مقوی اور تن پرور غذا ملتی ہے ۔ اول تو مویشیوں کی پرورش اور نسل میں اصلاح و ترقی ہونی چاہیئے ۔ دوسرے چراگاہوں میں اضافہ ہونا ضروری ہے ۔ کناڈا میں تو سرکار مدرسے کھول کھول کر اور ماہرین کو ملازم رکھ کر اس صنعت کو ترقی دے رہی ہے ۔ کیا اچھا ہو کہ سرکار ہند بھی ادھر توجہ کرے ۔

بھاپ یا برقی قوت سے چلنے والے کارخانوں کی مجموعی تعداد ۱۹۱۱ء میں ۲۵۶۳ تھی خاص خاص قسم کے کارخانوں کی فہرست درج ذیل ہے ۔

| | |
|---|---|
| سوتی کپڑے کے کارخانے | ۲۳۵ |
| روئی اوٹنے اور دبانے کے کارخانے | ۱۱۶۶ |
| جوٹ بننے کے کارخانے | ۶۰ |
| جوٹ دبانے کے کارخانے | ۱۱۵ |
| اونی کپڑے کے کارخانے | ۴ |
| کاغذ کے کارخانے | ۸ |
| ہتھیار اور بارود کے کارخانے (سرکاری) | ۱۶ |
| شراب کشی کے کارخانے | ۲۲ |
| جہاز گودام | ۲۳ |
| نیل کے کارخانے | ۴۹ |
| لوہے اور پیتل کے کارخانے | ۸۵ |
| لاک کے کارخانے | ۳۴ |

| | |
|---|---|
| مٹی کا تیل صاف کرنے کے کارخانے | ۷ |
| چھاپے خانے | ۶۰ |
| ریلوے کے کارخانے | ۵۹ |
| چانول کے کارخانے | ۲۱۹ |
| آٹے کے کارخانے | ۳۸ |
| آرہ کشی کے کارخانے | ۱۰۲ |
| ریشم اٹیرنے اور بننے کے کارخانے | ۶۳ |
| شکر سازی کے کارخانے | ۲۵ |
| کھپریل کے کارخانے | ۲۸ |

واضح ہو کہ مندرجۂ بالا فہرست میں وہ کارخانے شامل نہیں جو بھاپ اور برقی قوت سے نہیں چلتے روئی اوٹنے، صاف کرنے اور دبانے کے ۱۱۶۶ کارخانے جو اوپر درج ہیں ان میں سے ۲۸۵ برار میں واقع ہیں۔ ۳۸۰ بمبئی میں، ۱۳۵ پنجاب میں اور ۱۲۳ صوبۂ متحدہ میں صرف بمبئی میں ۱۹۴۰۰۰ مزدور روئی کی مختلف صنعتوں میں لگے ہوئے ہیں۔ بمبئی کی طرح مدراس، صوبۂ متوسط اور برار میں بھی کتائی اور پارچہ بافی خاص صنعتیں شمار ہوتی ہیں۔ بنگال میں جوٹ دبانے کے کارخانے برابر بڑھ رہے ہیں۔ ریشم اٹیرنے کے کارخانے بھی خاص کر بنگال میں ملتے ہیں۔ نیل اور لاک کے کارخانے بہار و اڑیسہ میں زیادہ ہیں۔ آٹے کے کارخانوں کی پنجاب میں بہت کثرت ہے اور شکر سازی کے کارخانے صوبۂ متحدہ اور بہار میں زیادہ ہیں۔ چانول نکالنے اور آرہ کشی کے کارخانے برما میں بہت عام ہیں۔ کیونکہ چانول اور ساگون وہاں کی خاص پیداوار ہیں۔ یہہ کارخانے بیشتر اہل یورپ کے ہاتھ میں ہیں۔ اور صوبے بھر میں یہی دو بڑی صنعتیں ہیں جو کہ مغربی طرز کے انتظام سے چلتی ہیں چھاپے خانوں کی بمبئی اور مدراس میں زیادہ کثرت ہے۔ لوہے اور پیتل کے کارخانے جن میں انجینیری کے کارخانے بھی شامل ہیں۔ ۳۰ تو بنگال میں قائم ہیں اور ۲۲ بمبئی میں ٹاٹا آہنی و فولادی کارخانہ ۱۹۱۲ء میں بمقام چھوٹا ناگپور جاری ہوا اور اس

مختصر دوران میں وہ بہت بڑھ گیا ہے۔ اس کارخانے کا صاف کیا ہوا لوہا جاپان اور امریکہ تک جاتا ہے۔ کل کارخانوں میں سے ۱۱۹ کارخانے سرکار یا مقامی جماعتوں کی ملک تھے جن میں سے ۱۹ چھاپے خانے تھے۔ ۲۳ ریلوے کارخانے ۱۲ نہر اور انجینیری کے کارخانے۔ اور ۱۷ فوج اور توپخانے کے کارخانے۔ مدراس اور صوبۂ متحدہ میں یہ ایک خاص بات ہے کہ وہاں زراعت اور دیہاتی صنعتوں کے واسطے چھوٹی چھوٹی دخانی کلیں استعمال ہونے لگی ہیں۔

ہندوستان کی تمام صنعتوں کا مفصل حال بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ پس خاص خاص صنعتوں کی مختصر اور سرسری کیفیت بیان کرنے پر اکتفا کرنا پڑا۔ تاہم اس قدر صاف ظاہر ہے کہ صنعتوں کا میدان ترقی میں قدم بڑھنا شروع ہو گیا ہے البتہ رفتار بہت سست ہے۔

ترقی کی وسعت

اصل ترقی کے بیان کرنے میں اکثر مبالغے سے کام لیا جاتا ہے۔ تجارت کے اعداد و شمار میں غیر معمولی اضافہ دیکھکر جو لوگ مطمئن ہو گئے ہیں ان کو شاید یہ خیال نہیں کہ ملک میں جسقدر صنعت کی ترقی ہو رہی ہے۔ وہ بیشتر بدیسی اصل اور بدیسی اولوالعزمی کا نتیجہ ہے۔ ہندوستان کے روپے اور کوشش کو اس میں بہت تھوڑا دخل ہے کان کنی اور کلوں کے کارخانے اور بڑی بڑی صنعتیں زیادہ تر یورپ والوں کے ہاتھ میں ہیں جو کچھ منافع نکلتا ہے وہ یہاں جمع ہونے کے بدلے باہر چلا جاتا ہے چنانچہ ایک اعلیٰ سرکاری عہدہ دار مسٹر چیٹرٹن کا قول ہے کہ ان بڑے بڑے کارخانوں کے جاری ہونے سے ہندوستان کو تو بس اتنا ہی فائدہ ہے کہ کچھ لوگ ادنیٰ عہدوں پر کام کر کے تھوڑی تھوڑی تنخواہ پا لیتے ہیں۔ یا قلی کی حیثیت سے پیٹ پالتے ہیں لیکن دوسروں کی کامیابی پر برافروختہ ہونے کا کیا سبب۔ خود یہاں کے لوگوں نے جب بڑے بڑے قدرتی ذخیروں کو ہاتھ نہ لگایا تو نو وارد اولوالعزموں نے ان کو آنگوایا۔ شکایت کی کیا گنجائش ہے کاروبار کی ترقی وقت اور جوار بھاٹے کی طرح کسی کا انتظار نہیں کرتی۔

اب یہاں ایک نہایت بحث طلب مسئلہ چھڑتا ہے وہ یہ کہ ہندوستانی اور

باب

دیسی اور بدیسی اصل

بدیسی اصل کا مقابلہ کیا جائے اس بات میں بہت کچھ رد و قدح ہو چکی ہے لیکن اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اب تک صاف صاف اچھی طرح غور نہیں کیا گیا۔ ایک طرف تو یہ کہا گیا کہ بدیسی اصل کا استعمال لازماً ملک کے حق میں مضر ہے۔ دوسری طرف یہ ثابت کرتے رہے کہ بدیسی اصل کا ہمیشہ ملک پر مفید اثر پڑتا ہے وتھلداس دھودر ٹھیکر سے جو خود بہت کامیاب تاجر ہیں اور ترقی صنائع کے مسئلے میں بڑی سند مانے جاتے ہیں۔ انھوں نے اس بحث کے متعلق اپنے خیالات البتہ نہایت صفائی اور زور کے ساتھ ظاہر فرمائے ہیں۔ ان کا یہ قول نہایت بجا اور درست ہے کہ دنیا کے کسی ملک نے اس وقت تک صنعت و حرفت میں ترقی نہیں کی جب تک وہاں اصل کی افراط ہو گئی۔ ہندوستان میں صنعت و تجارت کی ترقی کے واسطے نہایت وسیع میدان موجود ہے۔ وقت ہے تو یہ کہ دیسی اصل کی مقدار بہت تھوڑی ہے پس بدیسی اصل کے بغیر ہندوستان کا کام چلنا دشوار ہے محض جذبات کے اثر میں آکر بدیسی اصل سے دستکش رہنا بھی کوتہ اندیشی ہوگی لیکن ساتھ ہی اس کے یہ بھی اچھی طرح پر سمجھ لینا چاہیے کہ کس حد تک بدیسی اصل سے کام لینا مفید ہو سکتا ہے۔ جاپان کے محب وطن بڑے شوق سے بدیسی اصل لا لا کر اپنے ملک میں صنعت و حرفت کو ترقی دے رہے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی وہ کاروبار کا منافع ملک سے باہر نہیں جانے دیتے۔ پس حسب ضرورت ہمکو بدیسی اصل سے کام تو ضرور لینا چاہیے۔ لیکن اس کا خیال رہے کہ دوسری قوموں کی بہ نسبت ہم کو زیادہ بار اٹھانا نہ پڑے۔ بعض صنعتیں ایسی ہیں کہ ملک کی بہبودی کے واسطے ان کی ترقی بہت ضروری ہے لیکن ان کے واسطے ملک میں کافی اصل نہیں ملتا ایسی صورت میں باہر سے اصل کا لے لینا مناسب ہے۔ بدیسی اصل کا ایسے کاموں میں لگانا مضائقہ نہیں۔ جیسے کہ ریل۔ لیکن بقول سر وتھلداس جب دوسری صنعتوں پر نظر ڈالتے ہیں۔ مثلاً برما کا مٹی کا تیل۔ میسور کی سونے کی کانیں۔ بنگال کا کوئلہ۔ چاء۔ اور جوٹ کا کاروبار۔ تجارت کی بحری نقل و حمل۔ ہماری تجارت خارجہ میں بیرونی بنکوں کا روپیہ لگنا ان صورتوں میں بدیسی اصل کا کام اپنے واسطے اس قدر مفید نہیں معلوم ہوتا حال میں تخمینہ کیا گیا تھا کہ بقدر ۷۴ کرور پونڈ

برطانوی اصل ہندوستان میں لگی ہوئی ہے ۔ خدا جانے اس بدیسی اصل کے ذریعے سے یہاں کی کسقدر دولت دوسرے ملکوں کو چلی جا رہی ہے ۔ سرکاری اخراجات مہیا کرنے کے بعد بھی ہندوستانی برآمد یہاں کی درآمد سے جسقدر بڑھی رہتی ہے ۔ اس سے کچھ اندازہ دولت کے نکل جانے کا ہو سکتا ہے اس میں سے جس قدر رقم بطور سود جاتی ہے وہ تو نقصان میں شمار نہ ہونی چاہیئے ۔ البتہ منافع کے طور پر جو زر کثیر چلا جا رہا ہے وہ ضرور قابل گرفت ہے اس صورت میں تو یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جب تک برطانوی حکومت کے سائے میں ملک کی حالت درست ہو اور یہیں کے لوگ صنعتوں کو سنبھالنے کے قابل نہیں ۔ اس وقت تک مٹی کا تیل، سونا ، کوئلہ ، اور ایسی ہی چیزیں یونہی دبی دبائی پڑی رہیں ورنہ ملک ان چیزوں سے بتدریج خالی ہو جائے گا ۔ اور منافع سے غیروں کی جیبیں بھرتی رہیں گی اس وقت کان کنی میں تقریباً ایک لاکھ ہندوستانی کام کرتے ہیں ۔ تو کیا جس ملک کی آبادی تیس کروڑ ہو اس کام کے بغیر یہ لاکھ مزدور بھوکوں مر جائیں گے ۔ حاصل کلام یہ کہ ان صنعتوں سے ملک کو بحالت موجودہ بہت بڑا نقصان یکساں پہنچ رہا ہے اور فائدہ نہایت قلیل اور چند روزہ ہے ۔

سرکار ہند کے محکمۂ ارضیات کے سابق ناظم سر ٹامس ہالینڈ کی بھی یہی رائے ہے جو اوپر بیان ہوئی ۔ برما میں جو نہایت کامیابی سے مٹی کا تیل نکالا جا رہا ہے اسکے متعلق صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ یہ بات بہت افسوسناک ہے کہ تیل کے چشمے کھودنے کے واسطے کل اصل یورپ سے آئی ہے اور اس صنعت کا کل منافع یورپ کو چلا جاتا ہے ۔ جب تک ہندوستان کے ذی استطاعت اپنا اندوختہ صنعت و حرفت میں نہ لگائیں گے ہندوستان مٹی کے تیل اور دوسری اس قسم کی صنعتوں میں یونہی زیر بار ہوا کرے گا ۔ دوسرے ملک روپیہ لگا کر ان صنعتوں کا گرانقدر منافع منگواتے رہیں گے اور خود ہندوستان اس سے سراسر محروم رہے گا ۔

خلاصہ

حاصل کلام یہ کہ ملک میں صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے لیئے بدیسی اصل سے کام لینے میں مضائقہ نہیں ۔ بلکہ ایسا کرنا مفید ہے ۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اصل پر صرف سود ادا کیا جائے ، نہ یہ کہ بدیسی اصل آکر تمام دولت ڈھو لیجائے اور ملک کو

کھو کھلا کردے۔ یہ بھی خیال رہے کہ بعض بعض صنعتوں کے واسطے ملک میں اگر پورا روپیہ نہ مل سکے تو رقم مطلوبہ کا ایک جزو ضرور مل سکتا ہے اس طرح پر جتنی دیسی اصل کام میں لگے گی اس کا منافع ملک میں رہے گا اور باہر جانے سے بچے گا۔ مسٹر وتھلداس کی تجویز ہے کہ سرکار ایک ایسا قانون بنادے کہ جسقدر کاروبار بدیسی کمپنیوں کی طرف سے یہاں جاری ہوں ہندوستان کے اصلداروں کو بھی اس میں روپیہ لگانے کا سہل موقع دیا جائے اور دونوں ملکوں میں ایک ہی وقت کاروباری اشتہار شائع ہوا کرے تاکہ جو چاہے شریک ہو جائے۔

زراعت اور صنعت کا مقابلہ

بعض حلقوں میں یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ ہندوستان میں ترقی صنعت کی تحریک کو شاید ہی کامیابی ہو بعض صاحبوں کا قول ہے کہ قدرت ہی کا منشا یہ ہے کہ ہندوستان ایک زراعت کا ملک بنا رہے اور صنعت گری کے ملک کا رتبہ نہ پا سکے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اس خیال اور بیان کی بنا کیا ہے اور اس کے کیا معنی ہیں اس میں کلام نہیں کہ یہاں زراعت کے واسطے چند غیر معمولی سہولتیں موجود ہیں اور زراعت ہمیشہ یہاں کا ایک خاص پیشہ بنی رہے گی۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ کہاں نکلتا ہے کہ ہندوستان قدرتی طور پر صنعتوں کی ترقی کے واسطے ناموزوں واقع ہوا ہے۔ بلکہ زراعت کے معاملے میں جو اس کو خاص قدرتی سہولتیں حاصل ہیں ان سے صنعتوں کی ترقی میں اور بھی مدد مل سکے گی۔ چنانچہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں یہی واقع ہوا کہ وہاں کی زراعت سے صنعتوں کو بہت امداد اور تقویت پہنچی۔ خواہ کوئی صنعت ہو۔ اس کا خام سامان آخر زمین ہی سے حاصل ہوتا ہے پس جس حد تک ہندوستان میں خام سامان سستا پیدا ہوگا۔ اس حد تک اس کو دوسرے ملکوں پر جو باہر سے سامان منگاتے ہیں سبقت حاصل رہے گی۔ زراعت اور صنعت آپس میں منافی ہونے کی جگہ ہندوستان سے وسیع ملک میں ایک دوسرے کی معاون ہونگی۔ صنعت کو ترقی ہو تو یہ ضرور نہیں کہ زراعت سے ہاتھ اٹھا لیا جائے بلکہ عجب نہیں کہ زراعت بھی ساتھ ساتھ ترقی کرے عوامل پیدائش۔ یعنی زمین، محنت۔ اور اصل یہ سب جس حد تک اس وقت زراعت میں لگے ہوئے ہیں اسی طرح لگے رہیں گے اور جو صنعتیں پھیلیں گی، تو ان میں

غیر مزروعہ زمین۔ بیکار مزدور، اور نیا اصل کام کرے گا۔ یہ نہیں کہ زراعت چھوڑ کر وہی عوامل پیدائش صنعت میں آلگیں۔ جب صنعت اور زراعت کے یکجا ہونے سے امریکہ کو اس قدر فائدہ پہنچ رہا ہے تو پھر کیا وجہ کہ ہندوستان کو ویسا ہی فائدہ نہ پہنچے۔ ضرور پہنچے گا۔ موقع ملنا شرط ہے۔

ہندوستان اور صنعتیں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ جن حالات نے صنعتوں کو یورپ اور امریکہ میں ترقی دی وہ ہندوستان میں موجود نہیں۔ اس قول پر غور فرمائیے۔ اگر لوگوں کی جسمانی اور اخلاقی خوبیوں کو لیجیے تو وہ کسی خاص قوم کی نرالی ملک نہیں ہو سکتیں اس معاملے میں بعض بعض لحاظ سے تو ہندوستان کو پہلے ہی فوقیت حاصل ہے اور جو کچھ کمی بھی ہو وہ سائنس کی مدد سے پوری ہو سکتی ہے صنعتوں کی ترقی کے واسطے جو جو خوبیاں اور اوصاف درکار ہیں ان میں سے بیشتر تو اب بھی لوگوں میں موجود ہیں۔ البتہ وہ حالت جمود میں ہیں تھوڑی سی کوشش سے وہ پھر ابھر سکتی ہیں۔ ہندوستان کو ایک بڑی سہولت یہ حاصل ہے کہ یہاں احتیاج معیشت بہت قلیل ہے۔ آج سے تین سو برس پہلے ہالینڈ وغیرہ اولوالعزم ملکوں کے مقابل انگلستان صنعت میں بہت پیچھے تھا۔ لیکن آج وہ صنعت گری کی پہلی صف میں نظر آتا ہے۔ جرمنی کا جو رتبہ آج نظر آتا ہے وہ اس نے صرف نصف صدی میں حاصل کیا ہے۔ اسی طرح ہندوستان کی ترقی کی بھی امید ہے۔ ہندوستان کی موجودہ پس ماندگی کے کچھ اسباب تو وہ ہیں جو اوپر بیان ہو چکے ہیں اور کچھ اسکی سیاسی حالت میں مضمر ہیں لیکن یہ توقع عبث نہیں کہ عنقریب سیاسی حالت کی اصلاح اور ترمیم عمل میں آئے گی۔

سچ پوچھیے تو ہندوستان میں ترقی صنعت کی از حد گنجائش موجود ہے۔ جب ہندوستان میں اس قدر سامان خام پیدا ہوتا ہے تو نہ صرف وہ اپنی ضروریات پوری کرسکتا ہے بلکہ چاہے تو اپنی مصنوعات دوسرے ملکوں کو بھیج دے۔ لیکن یہ بات اسی وقت میسر ہو سکتی ہے جبکہ اصل میں معقول اضافہ ہو۔ مزدور کو باقاعدہ صنائع کی تعلیم دی جائے اور کام کرنے کے جدید طریق رائج ہوں۔

پیدائش بر پیمانۂ صغیر وکبیر

ہندوستان کی صنعت کا حال جو اوپر بیان ہوا اس سے صاف ظاہر ہے کہ

باب

ابھی تک یہاں پیدائش بر پیمانۂ صغیر کا بہت رواج ہے۔ البتہ بعض بعض حلقوں میں پیدائش بر پیمانہ کبیر کا طریق بھی چل نکلا ہے یہ سوال کہ آیا ہندوستان اپنا قدیم دستکاری کا طریق جاری رکھے یا جدید طریق کے بموجب بہت بہت سی اصل لگا کر کلوں سے کام لے اس قدر پیچیدہ اور بحث در بحث ہے کہ نہ تو یہ ممکن اور نہ مناسب کہ یونہی سرسری طور پر اس کا کوئی قطعی جواب دیدیا جائے اس سے تو انکار نہیں ہوسکتا کہ مواد پیدائش خصوصاً محنت اور اصل کی قوت پیمانۂ صغیر کے مقابل پیمانہ کبیر میں بہت بڑھ جاتی ہے پیمانہ کبیر پر پیداوار ہونے کی خاص خاص سہولتیں اور فوائد درج ذیل ہیں۔ جن سے پیداوار میں اضافے کے اسباب بخوبی واضح ہونگے۔

(۱) تقسیم عمل کا خوب موقع ملتا ہے مزدوروں سے ان کی قابلیت اور کارکردگی کے متناسب کام لیا جاتا ہے۔

(۲) نئی قسم کی کلیں چلتی ہیں اور ہر کام کے واسطے ایک جداگانہ کل مخصوص رہتی ہے یہ بھی تقسیم عمل کی ایک صورت ہے۔

(۳) اتنی کلیں چل سکتی ہیں کہ قوت محرکہ یعنی انجن پورا پورا کام دیں۔

(۴) ترقیاں بآسانی عمل میں آسکتی ہیں۔

(۵) ایجادات کے باب میں ہمت افزائی ہوسکتی ہے۔

(۶) اعلٰے درجے کی مہارت سے کام لینے کا زیادہ موقع ملتا ہے یعنی بڑے کارخانوں میں بہت سے مہارت یافتہ لوگ کام کرتے ہیں۔

(۷) ہر قسم کا سامان خام دستیاب ہوسکتا ہے اور کام کے بہترین طریق عمل میں آسکتے ہیں۔

(۸) زیادہ زیادہ مقدار میں خریدنے کی وجہ سے سامان خام سستا ملتا ہے۔

(۹) تھوک فروشی کی وجہ سے مال کی نکاسی میں دقت کم ہوتی ہے اور شرح منافع کم ہونے پر بھی مقدار منافع بڑھی رہتی ہے۔

(۱۰) مختلف شعبوں کی نگرانی پر قابل منتظم تعینات کیے جاسکتے ہیں۔

(۱۱) میر کارخانہ کو بڑے بڑے معاملات طے کرنے اور تمام نگرانی رکھنے کا موقع ملتا ہے۔

(۱۲) زائد پیداوار بھی کام آجاتی ہیں۔ ادنیٰ سے ادنیٰ چیزیں بھی بیکار نہیں جاتیں۔ لیکن واضح ہو کہ کوئی چیز خالص خوبیوں کا مجموعہ نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ پیدائش بر پیمانۂ کبیر کے طریق میں چند نقص بھی ثابت ہوچکے ہیں۔ مثلاً

(۱) اگر طلب اشیا میں کوئی بڑا تغیر ہو تو کارخانوں کو بڑا نقصان پہنچ سکتا ہے۔
(۲) نگرانی کا خرچ کبھی کبھی بہت بڑھ جاتا ہے
(۳) خود مالک کے مقابل تنخواہ یاب منتظم کو کاروبار سے بہت کم دلچسپی ہوتی ہے۔
(۴) جب تک طلب بہت زیادہ نہ ہو۔ بڑے کارخانے نہیں چل سکتے۔

مندرجۂ بالا نقائص کے علاوہ اس طریق میں کچھ ایسی اخلاقی اور معاشرتی خرابیاں مضمر ہیں کہ جن کی وجہ سے اس پر اعتراض عائد ہوتا ہے۔ مثلاً جو لوگ بڑے بڑے کارخانوں میں کام کرتے ہیں وہ خود بھی گویا کل بن جاتے ہیں۔ ہمیشہ ایک ہی طرح کی محنت شاقہ کرتے کرتے نہ کوئی قوت اختراع باقی رہے اور نہ کوئی تشخص کا خیال مزید براں بڑے بڑے مجمع رہنے سے لوگوں کی صحت اور اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے یہ بات بھی کچھ کم قابل لحاظ نہیں کہ پیدائش بر پیمانۂ صغیر کے طریق میں بہت سے لوگوں کو آزادی کے ساتھ روزگار کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس کے برعکس پیدائش بر پیمانۂ کبیر میں چند لوگ عروج پاتے ہیں اور باقی بہت سے دستنگر بنے رہتے ہیں چنانچہ خود یورپ اور امریکہ میں بعض بعض عالی خیال لوگ اس طریق سے بیزار ہوچلے ہیں۔ جن ملکوں میں اصل کا بہت زور ہے وہاں افراط کے روبرو افلاس کا بھی بہت ہجوم رہتا ہے چنانچہ مسٹر ہنری جارج اپنی مشہور کتاب ترقی و افلاس میں رقمطراز ہیں کہ پامالی بھی انجن کے ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ اور جس طرح کہ بیش قیمت عمارتیں مال گودام اور عالیشان گرجا مادی ترقی کے آثار ہیں اسی طرح خیرات خانے اور قید خانے بھی اسی کے لوازمات ہیں بقول صاحب موصوف ترقی اور افلاس کا موجودہ اتصال اس زمانے کا ایک بہت بڑا معمہ ہے جڑ یہی ہے جس سے طرح طرح کے معاشی معاشرتی اور سیاسی فساد نکلتے ہیں جن کو دیکھ کر دنیا حیران ہے اور جو بڑے بڑے مدبروں اور فیاضوں کے دبائے نہیں دبتے۔ تقسیم دولت کی عدم مساوات ملاحظہ ہو۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں برطانیہ کی آمدنی کا تخمینہ یوں ہوا ساڑھے بارہ لاکھ دولتمندوں

کی آمدنی ساڑھے اٹھاون کرور پونڈ۔ ۲۷ لاکھ خوشحالوں کی آمدنی ساڑھے چوبیس کرور پونڈ۔ تین کرور اسی لاکھ غریبوں کی آمدنی اٹھاسی کرور پونڈ۔ امریکہ کی حالت اور بھی عجیب ہے اور تمام یورپ کا کم و بیش یہی حال ہے دولت کی کثرت ہے مگر اس کی تقسیم بہت غیر مساوی ہے۔

انقلاب صنائع

درحقیقت طریق پیدائش کی یہ بحث بہت پیچیدہ ہے اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی صنعت میں ایک انقلاب پیدا ہو چلا ہے۔ آیا یہ انقلاب مفید بھی ہوگا اس پر ازحد اختلاف رائے پھیلا ہوا ہے کچھ لوگ تو نہ صرف اس کا خیر مقدم کررہے ہیں بلکہ اس کی رفتار بڑھانے کے واسطے بھی آمادہ ہیں اور کچھ لوگ اس سے بیزار ہیں اور خدا سے چاہتے ہیں کہ کہیں رک جائے۔ ایک طرف تو یہ عقیدہ جما ہوا ہے کہ اس انقلاب سے ملک میں از سرنو جان پڑجائے گی۔ دوسری طرف یہ خوف طاری ہے کہ کہیں مغربی مادہ پرستی یہاں بھی لوگوں کی روحانی امنگوں اور پاکیزہ فطرتی کے جذبات کا خاتمہ نہ کردے ایک جماعت تو نہایت اطمینان کے ساتھ توقع لگائے بیٹھی ہے کہ اس انقلاب کے ساتھ ایک ایسا معاشی دور آئیگا کہ ملک میں دولت پھٹ پڑے گی۔ اور ہر طرف مرفہ الحالی پھیل جاویگی دوسری جماعت کا دل دھڑکتا ہے کہ خدا جانے اس انقلاب کی بدولت ملک میں کیسی کیسی آفتیں برپا ہوں اور کیا مصیبتیں پھیلیں۔

جب لوگوں میں اس قدر اختلاف رائے برپا ہو تو پھر ایک غریب ماہر فن معیشت کو اپنی عالمانہ رائے دینے میں کس قدر دقت پیش آئے گی۔ اس معاملے کی بھلائی برائی پر غور کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ دونوں فریق کی متضاد راؤں میں کچھ نہ کچھ اصلیت ضرور ہے اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ مغرب میں بیحد و حساب دولت کے پہلو بہ پہلو انتہائی افلاس بھی جاگزیں ہے۔ کون نہیں جانتا کہ انگلستان اور یورپ کے دوسرے ممالک میں جب انقلاب نمودار ہوا تو اس کے جلو میں کیسی کیسی خرابیاں آئیں — خانہ برباد عورتیں روتی تھیں اور بھوکے بچے بلکتے تھے۔ سب کو تسلیم ہے کہ معاشی مسابقت کا خاصہ یہی یہ ہے کہ بھرتے کو بھرے اور رستے کو واندھا

کرے یعنی دولتمندوں کی دولت بڑھتی ہے اور مفلسوں کا افلاس پس مسابقت غریبوں کے حق میں بڑا وبال ہوگا - یہ خطرہ بھی پوشیدہ نہیں کہ نئے طریق کاروبار کا لوگوں کی سیدھی سادھی زندگی پر کیسا مضر اثر پڑتا ہے - ساتھ ہی یہ واقعات بھی پیش نظر ہیں کہ لوگوں کی خواہش بغیر یہ انقلاب پہلے ہی سے ملک میں شروع ہوگیا - اب کس کی طاقت ہے جو اس کو روک سکے - اب ہزار روک تھام کیجیے وہ بڑھتا چلا جائے گا - اور اگر یہاں کے لوگوں نے اس کو نہیں سنبھالا اور فائدہ نہیں اٹھایا تو دوسرے لوگ فائدہ اٹھائیں گے - پس ماہر فن اس کے سوا اور کیا مشورہ دے سکتا ہے کہ جب کچھ بس نہ چلے تو مخالفت کے بجائے حالات کے ساتھ موافقت کرنی چاہیئے اور دوسری قوموں کے تلخ تجربے سے عبرت حاصل کرکے جہاں تک ہو سکے اس انقلاب کی خرابیوں کو روکا جائے بلکہ خُذْ مَا صَفَا دَعْ مَا کَدِرْ کے اصول پر قدیم اور جدید طریق کو ملا سکیں تو بہت اچھا ہو -

اصلاح

پچھلی نصف صدی تک تمام مہذب ممالک میں مزدوری پیشہ لوگوں کی حالت درست کرنے کی سخت کوشش ہوتی رہی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب ان کی حالت مقابلۃً بہت اچھی نظر آتی ہے - مزدوروں کی حفاظت کے واسطے ایک فیکٹری ایکٹ یعنی کارخانہ جات کا قانون ہندوستان میں بھی پاس کرنا پڑا - یکم جولائی ۱۹۱۲ء تک تو یہاں کے کارخانہ جات میں وہی ۱۸۹۱ء ایکٹ نمبر ۱۱ جاری رہا - باستثنائے چند یہ قانون ان تمام کارخانوں پر عائد ہوتا تھا جن میں ۵۰ یا اس سے زیادہ لوگ کام کرتے ہوں - اور خاص صورتوں میں ان کارخانوں پر بھی نافذ ہو سکتا تھا جن میں ۲۰ یا اس سے زیادہ مزدور کام کریں - ۹ سال سے کم عمر کے بچے تو کارخانوں میں کام کر ہی نہیں سکتے - ۹ سال سے ۱۴ سال کی عمر تک روزانہ کام کا وقت زیادہ سے زیادہ ۷ گھنٹے مقرر تھا اور مستورات کے واسطے ۱۱ گھنٹے جن میں ڈیڑھ گھنٹے کا وقفہ بھی لازمی تھا - ان کارخانوں کے سوا جہاں مزدوروں کی دو یا زیادہ ٹولیاں باری باری کام کرتی ہوں - دوپہر کو تھوڑی دیر کے واسطے کام بند کرنا لازمی تھا - ۱۹۱۱ء میں دوسرا قانون پاس ہوا جس میں

مزدوروں کی صحت اور حفاظت کے اہتمام کے علاوہ یہ بھی قرار پایا کہ ریشہ دار چیزوں مثلاً اونی، سوتی کپڑے اور جوٹ کے کارخانوں میں کوئی شخص روزانہ بارہ گھنٹے سے زیادہ کام نہ کر سکے گا اور نہ کوئی بچہ ۶ گھنٹے سے زیادہ اور سوائے اس صورت کے کہ مزدوروں کی ٹولیاں مناسب طور پر باری باری کام کرتی ہوں اور چند دیگر مستثنیات کے سوا کسی کارخانے میں کوئی شخص ساڑھے پانچ بجے صبح سے پہلے اور سات بجے شام کے بعد کام نہ کر سکے گا۔ مستورات کسی کارخانے میں ۱۱ گھنٹے سے زیادہ کام نہیں کر سکتیں۔

امداد باہمی

کاروبار کی دنیا میں جو آجکل اصل کا اس قدر تسلط بیٹھا ہوا ہے تو اصل شاہی کا اقتدار گھٹانے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ امداد باہمی کے طریق کو رواج دیا جائے اس طریق سے یورپ اور امریکہ نے بہت فائدہ اُٹھایا ہے۔ پھر کیا وجہ کہ ہندوستان فائدہ نہ اُٹھائے لیکن امداد باہمی کا طریق اس وقت چل سکتا ہے۔ جب کہ لوگوں میں چند اوصاف پہلے سے موجود ہوں مثلاً کاروبار میں ایمانداری باہمی اعتماد اور بھروسا۔ فرض کا احساس، پس جو لوگ اس طریق کو جاری کرنا چاہیں ضرور ہے کہ پہلے یہ اوصاف پیدا کر لیں۔

گھریلو اور چھوٹی صنعتیں

اگر پیدائش برپیمانہ کبیر کا طریق بھی یہاں چل نکلے تو یہ کیا ضرور ہے کہ چھوٹی چھوٹی دستی صنعتیں فنا ہو جائیں بلکہ امداد باہمی کے سہارے سے یہ بھی جاری رہ سکتی ہیں۔ طریق امداد باہمی کا مقصد بالفاظ مسٹر کرولی یہ ہے کہ اس سے حُسنِ معاشرت بڑھے۔ علم یا عمل سے معاشی معلومات میں اضافہ ہو۔ اور حق والصاف کی عادت سے اخلاق میں ترقی ہو۔ بعض حالتوں میں تو چھوٹے چھوٹے دستکاروں کو خود بخود ایسی سہولتیں حاصل ہوئی ہیں کہ وہ مصارف پیدائش میں بہت تخفیف کر کے بڑے کارخانوں سے اچھی طرح پر مسابقت کر سکتے ہیں۔ گو جاپان میں بسرعت تمام بڑے بڑے کارخانے کھل رہے ہیں۔ تاہم اب تک وہاں چھوٹی دستکاریوں کا زیادہ رواج ہے ان کی سرسبزی کا راز یہ ہے کہ کچھ تو وہاں کے صناع اور دستکار بہت ہوشیار اور کارگزار ہیں اور کچھ سرکار نے محصول درآمد میں زیادتی کر کے ان کو بیرونی مسابقت سے محفوظ و مامون کر دیا ہے۔ کبھی کبھی

چھوٹی دستکاریاں ضمنی صنعتوں کی حیثیت سے بڑے بڑے کارخانوں کے قرب و جوار میں خوب عروج پاتی ہیں۔ مثلاً جوتوں یا سگرٹوں کے کارخانوں کے آس پاس کاغذ کے ڈبے ڈبیاں بننے لگتی ہیں جن میں سامان لگ لگ کر باہر جاتا ہے۔ یا کانوں کے قرب و جوار میں موزہ بافی وغیرہ شروع کر دیتے ہیں تاکہ کان کنوں کی بہو بیٹیاں بھی کچھ کما سکیں۔ احاطۂ مدراس کے ناظم مسٹر ٹریسلر سوئٹزرلینڈ کی گھریلو صنعتوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہاں تقریباً ایک ثلث صنعت پیشہ آبادی گھریلو صنعتوں میں لگی رہتی ہے خاص گھڑیاں اور فیتے بناتے ہیں۔ اور اگر بہت سی دولت فراہم نہیں کرتے تو کم سے کم اپنی زندگی آرام و آسایش سے بسر کرتے ہیں۔ سب گھریلو صناع کسی نہ کسی کارخانہ دار سے میل رکھتے ہیں۔ کارخانوں میں بہت کچھ سامان تیار ہوتا ہے اس میں سے کچھ کام باہر بھی بھیجدیا جاتا ہے۔ مثلاً کارخانوں میں تاگا، تن کر فیتوں کی بنائی کے واسطے تیار کر دیتے ہیں۔ جو جو کام تجربے سے برائے منفعت ثابت ہو چکے ہیں۔ ان کو گھریلو صناع انجام دیتے ہیں اور جو کچھ کام بچتا ہے وہ کارخانوں کی کلوں سے پورا ہو جاتا ہے۔ صناعوں کو اس طریق سے تقسیم عمل کے فوائد بھی حاصل ہو جاتے ہیں ماہرین کی امداد سے بھی مستفید ہوتے ہیں اور بڑے بڑے مستقل بازاروں تک ان کی رسائی رہتی ہے۔ گویا چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں بڑے پیمانے کا رنگ آجاتا ہے۔

تعلیم صناع

جو لوگ دل سے لوگوں کی معاشی بہبودی چاہتے ہیں ان کو تعلیم صنائع کی طرف توجہ کرنی لازم ہے۔ کیونکہ تعلیم ہی سے کارگزاری میں بڑی بڑی ترقیاں ہو سکتی ہیں۔ تمام مہذب ملکوں میں صنائع کی تعلیم یا تو سرکار کی طرف سے یا کم سے کم سرکاری اہتمام اور نگرانی میں جاری ہے ریاستہائے متحدۂ امریکہ کی ہر ایک ریاست میں ایک ایک صنعت وحرفت کا کالج قائم ہے جہاں سرکار کی طرف سے مفت تعلیم دیجاتی ہے۔ اسی تعلیم پر جرمنی، فرانس اور خود انگلستان میں ہر سال بڑی بڑی رقمیں صرف ہوتی ہیں اور جاپان بھی اس طرح کی تعلیم کے اہتمام میں کسی سے پیچھے نہیں۔ لیکن افسوس کہ ہندوستان میں اس کو بُری طرح سے پس پشت ڈال رکھا ہے سرکار اور بہی خواہان ملک نے ابھی تک کوئی معقول اہتمام

نہیں کیا۔

اب کچھ دنوں سے جو سرکار کو ادھر توجہ ہوئی تو مختلف ذرائع سے حالات دریافت کیئے جا رہے ہیں تاکہ اس طرح کی تعلیم کا کچھ نہ کچھ اہتمام ہو جائے۔ کچھ خود مختار دیسی ریاستوں نے بھی جن میں بڑودہ کی روشن خیال ریاست سب سے اوّل نمبر ہے یہ ضرورت محسوس کی کہ ٹھیٹ صنعت و حرفت کی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اس میں سے بعض اس سابق کمی کے پورا کرنے کے واسطے بہت سرگرم کوشش کر رہی ہیں سنہ ۱۸۹۰ء کا ذکر ہے کہ بنگال کی صنعتوں کا حال دریافت کیا گیا اور کیفیت میں تعلیم کی ضرورت صاف صاف بتا دی گئی اس پر سرکار نے صرف یہ کیا کہ چند مجلس اضلاع اور چند بلدیات کو اپنے ہاں چھوٹے چھوٹے صنعت کے مدرسے کھولنے کی ہدایت کر دی۔ بمبئی میں جو وکٹوریا جوبلی انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا تو اس میں بھی البتہ سرکار نے مدد دی۔ یہ مدرسہ بہت مفید ثابت ہوا۔ لوگ کلوں کا کام سیکھ سیکھ کر کارخانوں میں وجہ کفاف پیدا کر رہے ہیں۔ دوسرے صوبوں میں بھی صنعتی مدارس کھل رہے ہیں مگر ابھی کسی نے کوئی بڑی ترقی کر کے نہیں دکھائی۔ رڑکی، سبپور، اور پونا میں جو سرکاری انجینیری کالج قائم ہیں گو وہاں صنعت کی تعلیم نہیں دی جاتی تاہم وہاں کی تعلیم صنعت کے مشابہ ہے اور سبپور انجینیری کالج میں تو تعلیم صنعت کے کچھ ابتدائی درجے بھی کھل گئے ہیں۔ بہار انجنیری اسکول میں بھی ایک حد تک فن انجینیری کی تعلیم ہوتی ہے۔ بردوان، ڈھاکہ اور کرسیانگ کے تربیتی یعنی ٹریننگ مدارس میں دکانداری کا کام سکھاتے ہیں۔

بطور خود بھی لوگ تقریباً ہر صوبے میں صنعتی تعلیم کا اہتمام شروع کر رہے ہیں۔ مثلاً سنہ ۱۹۰۴ء سائنس اور صنائع کی تعلیم کی ایک انجمن قائم ہوئی جو کہ ہر سال کچھ نوجوانوں کو وظیفہ دیکر تعلیم کے واسطے باہر بھیجتی رہتی ہے جو لوگ اس طریق سے تعلیم پا کر آئے ہیں۔ اس میں سے بعض نے تو اپنے کارخانے کھول دیئے اور بعض دوسروں کے کارخانوں میں کام کرنے لگے۔ اسی طرح سنہ ۱۹۰۶ء میں بنگال ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا۔ اب یہ مدرسہ قومی تعلیمی مجلس کے تحت میں آ گیا۔ اس میں خاص خاص قسم کی صنعتیں تعلیم ہوتی ہیں مثلاً کلوں کی یا برقی انجنیری، کیمیا، صناعی، اضیات

لوگوں کے صنعتی مدارس

وغیرہ۔ ایک ہندوستانی انجمن ترقی سائنس قائم ہوئی ہے جو عملی کیمیا اور اسی قسم کی صنعتوں کی تعلیم پھیلا رہی ہے ہندوستانی سائنس انسٹی ٹیوٹ جو کہ مسٹر جے این ٹاٹا آنجہانی کی فیاضی کی یادگار ہے۔ گو بذات خود سائینس کالج نہیں لیکن مضامین صنعت کی اعلیٰ تعلیم کے واسطے بیحد کارآمد ثابت ہوگا۔ بنگال میں کچھ ایسی انجمنیں بھی قائم ہیں جو مستورات کو گھریلو صنعتیں سکھانے کا بندوبست رکھتی ہیں اس تعلیم کا یہ شعبہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔ مشنری یعنی پادریوں کی انجمنیں بھی جابجا بہت مفید کام کر رہی ہیں۔ لیکن جو معیار ان کے پیش نظر ہے وہ بہت ادنیٰ ہے۔

صنعتی نمائش

صنعتی نمائشیں جو ملک کے مختلف حصوں میں وقتاً فوقتاً منعقد ہوتی رہی ہیں ان میں نہ صرف خریداروں کو سامان دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ بلکہ سامان بنانے والوں کو ایک قسم کی تعلیم حاصل ہوتی ہے۔ دستکاروں کے خیالات میں وسعت ہونے سے سامان کی عمدگی میں ترقی ہوتی ہے گویا نمائشی خریداروں اور مال بنانے والوں دونوں فریق کے واسطے مفید ہیں۔

تعلیم صنائع کی قدر نے ناکامی

جو کیفیت اوپر بیان ہوئی اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس طرح کی تعلیم کے بارے میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے لیکن بڑا افسوس تو یہ ہے کہ جو کچھ تھوڑا بہت انتظام ہوا بھی اس میں پوری پوری کامیابی نہ ہو سکی۔ اس جزوی ناکامی کے کئی سبب ہیں کسب سے بڑی خرابی تو یہ ہے کہ اب تک مستعد اور ذہین نوجوان اس تعلیم کی طرف نہیں متوجہ ہوئے جن کو اور کوئی ذریعۂ معاش نہیں ملا وہی لوگ اس کے جویا ہوئے۔ پس اگر ان کو ایسی تعلیم سے بہت کم فائدہ پہونچا تو کیا تعجب ہے۔ البتہ اب کچھ روز سے اچھے اچھے ہونہار نوجوان شریک ہونے لگے ہیں۔ اس سے امید ہے کہ جلد دن پھرنے والے ہیں۔ اس تعلیم کی ترقی میں ایک دقت یہ بھی حائل ہے کہ تعلیم محض اصول و مسائل پر ختم ہو جاتی ہے ہندوستانیوں کو عملی کام اور تجربہ حاصل کرنے کا نہ تو ہندوستان میں کہیں موقع ملتا ہے اور نہ دوسرے ممالک میں تجربے سے خوب ثابت ہو گیا کہ کاروبار صنعت میں کامیابی حاصل کرنے کے واسطے پوری پوری عملی تربیت پانا لابد ہے۔ چنانچہ اب تک

ہندوستانی طلبہ کو کارخانوں میں کام سیکھنے میں جو دقتیں مانع آتی تھیں ان کو رفع کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ نہ معلوم اس شکایت کی کیا حقیقت ہے کہ اگر ہندوستانی طلبہ کارخانوں میں کام سیکھنا چاہیں تو ان کو جرمنی آسٹریا، اور امریکہ میں اس قدر دقت پیش نہیں آتی جسقدر کہ انگلستان میں۔ امید ہے کہ انگریز کارخانہ دار اس معاملے میں فیاض دلی اور روشن خیالی سے کام لیں گے۔ شکر ہے کہ دفتر وزیر ہند میں بھی اس کے متعلق کچھ کارروائی ہو رہی ہے۔

صنعتی تعلیم اور ذات پات کا طریق

صنعت و حرفت کی تعلیم کا جدید طریق پرانے طریق سے مختلف ہے پہلے تو ہر ایک لڑکا اپنے باپ دادا کے پیشے میں کار آموزی کا زمانہ بسر کرتا اور جوان ہو کر اسی پیشے میں شریک ہو جاتا تھا وہ اپنی ذات کا پیشہ چھوڑ کر کوئی نیا پیشہ اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ اب وہ ذات پات کی بندشیں ٹوٹ گئیں۔ ہر ذات اور فرقے کا آدمی جو پیشہ چاہے اختیار کر لے۔ اپنے اپنے ذات والوں کی نگرانی میں کام سیکھنے کا جو قدیم طریق رائج تھا۔ اس سے بہت کچھ کمال پیدا ہوا لیکن اس زمانے میں حالات بالکل بدل گئے۔ اب ضرورت ہے کہ باقاعدہ سائنس کے مطابق تعلیم دی جائے۔

تعلیم تجارت

اس وقت تعلیم تجارت کی بھی بہت سخت ضرورت ہے۔ آجکل کی تجارت بڑی ٹیڑھی کھیر ہے جب تک تمام اصول اور تفصیل ذہن نشین نہ ہو تجارت چلنی محال ہے۔ جو کوئی تجارت کا بیڑا اٹھائے اس کو صرف معاشیات کی معلومات حاصل کرنا کافی نہیں۔ بلکہ ضرور ہے کہ پیدائش اور مبادلہ اشیاء کے متعلق جس ملک میں جو جو صورتیں پیش آتی ہوں ان کو بھی نہایت غور سے مطالعہ کرے اور سمجھے۔ خوب سوچ بچار کر طریق تعلیم ایسا مقرر کرنا چاہیئے کہ طلبہ کو اس قسم کے مضامین پر پورا عبور ہو جائے جیسے کہ قانون و تاریخ تجارت، طریق بنک مسائل درآمد و برآمد مبادلات خارجہ، نقل و حمل، انتظام کارخانہ جات و کمپنی۔ اور مختلف ممالک کے بازاروں کی حالت، کاروبار کے شعبے میں جو لوگ ادنیٰ حیثیت سے رہنا چاہیں ان کے واسطے بھی فن تجارت کی تعلیم ضروری ہے چند سال سے مضامین تجارت کی تعلیم کے واسطے کلکتہ بمبئی وغیرہ میں کالج کھل گئے ہیں امید ہے کہ ابھی اور جابجا قائم ہونگے۔

# نواں باب

## تقسیم دولت

لگان

ہندوستان میں لگان تین اسباب کے اتحاد عمل پر منحصر ہے - اول تو رواج دوسرے مسابقت اور تیسرے قانون - پہلے زمانے میں لگان رسم و رواج کے مطابق قرار پاتا تھا - ایک طرف تو آبادی بڑھی - دوسری طرف وہ نیم اشتراکی اصول کہ جن پر قدیم دیہاتی برادریوں میں افراد کے باہمی تعلقات مبنی تھے - غائب ہونے شروع ہوئے - پس لگان پر بھی روز بروز مسابقت کا زیادہ زیادہ اثر پڑنے لگا - اس تبدیلی سے لوگوں پر سخت مصیبت آگئی اور بالآخر اسامی کی بہبودی کے خیال سے سرکار کو مداخلت کرنی پڑی - یوں تو صوبے صوبے کا قانون لگان مختلف ہے لیکن منشا سب کا یہی ہے کہ زمیندار حسب دلخواہ لگان میں اضافہ کرنے سے باز رکھا جاوے - خود قانون لگان رواج کی بنا پر بنا ہے - اور اگرچہ اس میں مسابقت کے اثر کا لحاظ رکھا ہے تاہم اس کی معقول طور پر حد بندی کردی ہے اصل منشا یہ نہیں کہ زمیندار ان فوائد سے محروم رہیں جو قدرتاً انکے حق میں پیدا ہوں بلکہ منشا یہ ہے کہ جو حقوق رواج سے اسامیوں کو حاصل ہو چکے ہیں وہ برقرار رہیں - پس معلوم ہوا کہ اب بھی ہندوستان میں لگان کی بنا زیادہ تر رواج ہے - یوں تو رکارڈو صاحب کا مسئلۂ لگان دنیا کے کسی ملک پر بھی پورا پورا منطبق نہیں ہوتا - جو جو حالتیں اس میں فرض کی گئی ہیں وہ بہ تمام و کمال کسی ملک میں بھی نہیں ملتیں - تاہم ریاستہائے متحدۂ امریکہ اور انگلستان میں حالات ان مفروضات کے قریب قریب پہنچ گئے ہیں - اور اس حد تک یہ مسئلہ ان دونوں ملکوں پر خاص کر منطبق ہوتا ہے - ہندوستان کی حالت بالکل برعکس ہے یہاں ان حالات کا نام و نشان بھی نہیں - پس

رکارڈو صاحب کا مسئلۂ لگان بہ مشکل ہندوستان پر منطبق ہو سکتا ہے۔ یہاں لگان کم و بیش ایک معین مطالبہ ہوتا ہے۔ یہ ضرور نہیں کہ کسی کھیت کا لگان اس کی پیداوار کاشت مختتم والے کھیت کی پیداوار کا باہمی فرق ظاہر کرے۔ ہر کھیت کے لگان مقرر کرنے میں اس کی زرخیزی کا لحاظ ضرور کرنا پڑتا ہے لیکن اس کے علاوہ کچھ امور قابل لحاظ اور بھی ہیں۔ اکثر یہ بھی واقع ہوتا ہے کہ لگان زرعی پیداوار کے مصارف کا جزو بن جاتا ہے۔

رواج مسابقت اور قانون

ہر حصۂ ملک میں شرح لگان ہر سہ مذکورہ بالا اسباب کی نسبتی قوت پر منحصر ہے۔ جہاں رواج کا اثر زیادہ ہے وہاں وہ باقی دونوں اسباب کو دبا لے گا۔ جہاں رواج کمزور ہوگا وہاں مسابقت اپنا راستہ نکال لے گی البتہ قانون چاہے تو سدراہ بن جائے۔ جہاں آبادی بہت ہلکی ہے۔ مثلاً آسام صوبۂ متوسط اور راجپوتانہ میں وہاں لگان بہت کم ہے۔ کہیں کہیں تو آسامیوں کو بلا بلا کر اس رعایت سے آباد ہونے کی ترغیب دیتے ہیں کہ پہلے پہل چند سال ان سے کوئی لگان نہیں لیا جائیگا۔ جن حصوں کی آبادی بہت گنجان ہے یعنی جہاں بارش کی کثرت ہے یا بڑے بڑے دریا بہتے ہیں۔ وہاں زمین کے معاملے میں مسابقت کا بہت زور ہے۔ اور اگر قانون مداخلت نہ کرے تو زمیندار اسامی سے بہت بہت لگان وصول کرنے لگیں۔ اگر رواج اور قانون کے اثرات معین فرض کر لیے جائیں تو مسابقت کے اثر گھٹنے بڑھنے سے شرح لگان میں بھی کمی بیشی ہوگی۔ برطانوی عہد حکومت کے شروع میں آجکل کے مقابل یہاں کی آبادی بہت کم تھی۔ زمین بکثرت خالی پڑی تھی اور اسامیوں کی قلت تھی۔ پس لگان بھی آج کل کے مقابلے میں بہت کم تھا اس کے بعد سے آبادی میں بہت اضافہ ہوا۔ مزید براں صنعتیں تباہ ہو جانے کی وجہ سے آبادی کا بیشتر حصہ زراعت کی طرف ڈھل پڑا۔ اکثر مقامات پر زمین کے واسطے سخت معرکۂ مسابقت برپا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لگان بھی بڑھ گیا۔ بڑے بڑے شہروں میں تو لگان کی کوئی حد ہی نہیں معلوم ہوتی۔

عام قاعدہ تو یہ ہے کہ جہاں چیزوں کی قیمتیں بڑھیں لگان میں بھی

اضافہ ہوگیا۔ گو اضافے کا اتنا سبب ہونا ضرور نہیں۔ بالعموم قیمتیں بڑھنے کے کچھ عرصے بعد لگان میں اضافہ نمودار ہوتا ہے۔ اور کبھی کبھی باوجود قیمتیں بڑھنے کے لگان میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔

پہلے زمانے میں لگان بشکل پیداوار ادا ہوتا تھا فصل کٹتے وقت زمیندار کا کارندہ کھیت پر موجود رہتا تھا۔ اور جو کچھ پیداوار ہوتی تھی۔ زمیندار اور اسامی دونوں آپس میں بانٹ لیتے تھے۔ اگرچہ اس طریق میں کچھ دقتیں بھی تھیں۔ لیکن کاشتکار کے حق میں یہ طریق بہت مفید تھا۔ اگر فصل ماری گئی تو اسامی پورا لگان ادا کرنے کے ذمہ دار نہ تھے بلکہ کچھ بھی ادا نہ کرتے تھے۔ دور افتادہ دیہات میں شاید اب بھی یہ طریق جاری ہو لیکن بالعموم نقد لگان کا رواج ہوگیا ہے۔ نقد لگان میں وہ تغیر پذیری کہاں جو پیداواری لگان میں تھی۔ قانون میں بھی زیادہ تر نقد لگان ہی سے بحث کی گئی ہے۔

حقیت اراضی

طرح طرح کے حقوق زمین سے وابستہ ہیں خلاصہ یہ کہ اسامیوں کے دو طبقے ہیں۔ قسم اول تو وہ اسامیاں جن کو قدیم رواج کی رو سے زمین پر مستقل اور موروثی قبضے کا حق حاصل ہے شرط یہ ہے کہ وہ اپنے ذمے کا لگان ادا کرتے رہیں لگان کی مقدار بھی رواج پر منحصر ہے بعض صورتوں میں تو شرح لگان مستقل طور پر معین ہوتی ہے کہ اس میں اضافہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسی اسامیوں کے حقوق قابل ارث اور قابل انتقال بھی ہوتے ہیں اور بعض صورتوں میں صرف خاص خاص وجوہات کی بنا پر لگان میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اسامیوں کی دوسری قسم وہ ہے کہ جن کو صرف چند سال کے واسطے زمین کا پٹہ ملا ہو اور اس میں وہ اسامی بھی شامل ہیں جن کو کسی فصلی سال کے آخر میں بیدخل کر سکتے ہیں اس صورت میں لگان اسامیوں اور زمیندار کی باہمی رضامندی سے مقرر ہوتا ہے۔

قسم اول کے اسامی اور وہ کاشتکار بھی جو خود ہی مالک زمین بھی ہوں معاش والے کاشتکار کہلاتے ہیں ان کی حالت قسم دوم کے کاشتکاروں سے بدرجہا بہتر ہے مالی مرفہ الحالی مثلاً مویشی، گھر بار، آبپاشی کے کھیت یہ سب چیزیں صاحب معاش کاشتکار اور موروثی اسامیوں کے ہاں نظر آتی ہے سحر ملک کا

اثر ہندوستان میں بھی ایسا ہی پڑتا ہے جیسا کہ کسی اور ملک میں مسٹر آرتھر ینگ نے اس سحر کی بہت فصیح تعریف کی ہے۔ ملکی کاشتکار اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرتا ہے۔ البتہ قسم دوم کی اسامیاں بہت خستہ حال ہیں۔ معاشی اور اخلاقی فوائد کے لحاظ سے ملکی کاشتکاری کا طریق بہت قابل قدر ہے اور ہندوستان کے کاشتکار کی حالت سدھارنے کا اس سے زیادہ کارگر اور کوئی طریق نہیں کہ اس کو کسی نہ کسی حد تک زمین پر مالکانہ حقوق دیئے جائیں۔ زراعتی اور عمارتی زمین کے لگان کا مختصر حال اوپر بیان ہوا لیکن ذیل کے بیان سے واضح ہوگا کہ معدنی زمین کے لگان کی حالت کچھ اور ہی ہے۔

معدنی زمین کا لگان

تقریباً تمام دیسی ریاستوں میں معدنوں کے مالکانہ حقوق وہیں کے حکمرانوں کو حاصل ہیں البتہ کان کنی اور معدنیات کا اندازہ لگانے کے جو قواعد مقرر ہیں انکی رو سے کچھ نگرانی سرکار ہند کی بھی رہتی ہے ہندوستان کے بعض بعض حصوں میں شرائط بندوبست کی رو سے معدنیات اور سطح زمین کے حقوق لوگوں کو مل گئے ہیں۔ لیکن باقی ہندوستان میں کل معدنیات سرکاری ملک ہیں۔ اور کان کنی کی اجازت سرکار ہی کے مقررہ قواعد کے بموجب مل سکتی ہے۔

سرکاری قواعد کی رو سے جستجو کی یعنی معدنیات کا پتا لگانے کی اجازت ایک سال کے واسطے مل سکتی ہے۔ لیکن اس سے کوئی مخصوصی یا دائمی حقوق پیدا نہیں ہوتے اور غیر آباد اور غیر مخصوص مقامات میں بلا اجازت معدنیات کی جستجو کرنے کی کوئی ممانعت نہیں اندازہ لگانے کی اجازت بہ پابندی چند شرائط ایک سال کے واسطے ملتی ہے لیکن اس اجازت کی تجدید دوسرے اور تیسرے سال بھی ہو سکتی ہے اس قسم کی اجازت ملنے کے بعد کان کنی کے پٹے کا پکا حق حاصل ہو جاتا ہے لیکن اس محدود رقبے کے اندر جس قدر جواہرات نکلیں وہ اس حق سے مستثنےٰ ہیں۔

صوبے دار حکومتیں تیس سال تک کے واسطے کان کنی کا پٹہ دینے کی مجاز ہیں۔ شاہی یعنی اعلیٰ حکومت کی اجازت سے پٹے کی میعاد میں مزید توسیع ہو سکتی ہے ہر پٹے میں کچھ ایسی شرائط درج ہوتی ہیں جن کو مقامی حکومت معاملے کی

نوعیت کے لحاظ سے ضروری اور مناسب خیال کرتی ہو۔

قواعد کی رو سے اندازہ لگانے کا لگان بہت ہلکا ہوتا ہے۔ یعنی زیادہ سے زیادہ ایک روپیہ فی ایکڑ۔ ہر پٹہ دار کو سطح زمین کا لگان بھی ادا کرنا پڑتا ہے جو ہر صوبے کے قانون لگان کے بموجب قرار پاتا ہے اور اگر لگان یوں مقرر نہ ہو سکے تو فریقین کی باہمی رضامندی سے طے ہو جاتا ہے لیکن شرح ایک روپیہ فی ایکڑ سے نہیں بڑھ سکتی۔ اس کے علاوہ پٹہ دار کو کچھ محصول بھی ادا کرنا پڑتا ہے جس کو رایلٹی کہتے ہیں۔ پٹہ دار کو پہلے سال کے بعد ہر سال مقررہ رقم بطور مزید لگان ادا کرنی پڑتی ہے لیکن کوئی پٹہ دار محصول اور مزید لگان دونوں رقم ایک ہی قطعے کے واسطے ادا نہیں کرتا بلکہ اس میں سے جو رقم بڑھی ہو وہی ادا کری جاتی ہے۔

ملک اراضی — ہندوستانی معاشیات کے چند معرکۃ الآرا مباحث میں ایک مسئلہ ملکیت زمین کا بھی ہے یورپ اور امریکہ میں تو نہ صرف اشتراکیین بلکہ بہت سے فاضل معاشی زمین کو قومی ملک بنانے کے موافق ہیں۔ ہندوستان میں بھی اس مقصد کا خیال بڑھ رہا ہے۔ حکام کا رجحان یہاں بھی یہ ہے کہ سرکار کو ایک بڑا زمیندار تصور کرتے ہیں جو سب کے آخر میں تمام زمین کی مالک ہے۔ اور لوگ جو مالگزاری داخل کرتے ہیں وہ گویا ایک طرح کا لگان ہے۔ بعض اس اصول کو اس درجہ بڑھاتے ہیں کہ اگر سرکار کل معاشی لگان کا مطالبہ کرے تو اُن کے نزدیک بیجا نہ ہوگا۔ اس خیال کو تاریخی پہلو سے درست ثابت کرنے کی بھی کوشش کی جاتی ہے لیکن قطع نظر ان بحثوں کے حقیقت یہ ہے کہ معاشی لحاظ سے تینوں طبقوں میں یعنی کاشتکار، زمیندار اور سرکار کو زمین میں تھوڑا تھوڑا حق مالکانہ حاصل ہے مزید براں سرکار یوں بھی بڑے بڑے قطعات کی بلا واسطہ مالک ہے مثلاً افتادہ ضبط شدہ، بازگشتہ خرید کردہ زمین اور زمین عامہ۔ ان زمینوں کے لحاظ سے سرکار کی حیثیت بالکل ان زمینداروں کی سی ہے جو مالک زمین ہیں فرق ہے تو صرف یہ کہ ان زمینوں پر کوئی مالگزاری ادا نہیں کی جاتی۔ ان زمینوں کے لگان پر بھی وہی اصول عائد ہوتے ہیں جو اپنی ملکی زمینوں کے لگان پر۔

اجرت

قدیم دیہاتی جماعتوں میں اجرت بہ شکل اجرت رائج ہی نہ تھی بلکہ سب مزدوروں کو پیداوار میں سے حصہ مل جاتا تھا۔ اجرت پر اب بھی رواج کا اثر قائم ہے۔ البتہ کام کی نوعیت اور مزدوروں کی حالت کے مطابق اس کے مدارج مختلف ہیں فی الجملہ یہ کہنا صحیح ہے کہ اجرت مقابلۃً معین ہے۔ یورپ اور امریکہ کے مقابل یہاں پر اجرت تغیر حالات کا بہت کم ساتھ دیتی ہے۔ رواجی شرح سے اجرت گھٹتی بڑھتی ضرور رہی ہے۔ لیکن یہ کمی بیشی نہایت تنگ حدود کے اندر اندر رہتی ہے۔

مسابقت کا اثر

تاہم اجرت کے تعین میں مسابقت کا اثر روز بروز بڑھ رہا ہے ملک کے جن حصوں میں لوگوں کا خاص پیشہ زراعت ہے۔ بہت کم مزدور اجرت پر رکھے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے اجرت کا معیار وہاں بہت ادنیٰ رہتا ہے اور ترقی نہیں کرتا۔ بالخصوص جہاں آبادی بہت گنجان ہے وہاں یہی حالت ہے۔ لیکن اُس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے کہ آبادی کی گنجانی خواہ مخواہ ادنیٰ شرح کا باعث ہوتی ہے۔ اگر گنجانی کے ساتھ محنت کی طلب بھی زیادہ ہو۔ یعنی بہت سے مزدوروں کی مانگ ہو جیساکہ شہروں کا حال ہے تو پھر شرح اجرت بھی بڑھی رہے گی اسی طرح جب بڑے بڑے کاروباری منصوبوں کی بدولت محنت کی طلب بڑھے۔ مثلاً کارخانے جاری ہوں یا ریل کی سڑک نکلے تو شرح اجرت میں اضافہ ہو جائے گا اس کے برعکس بعض حصوں میں جہاں آبادی بہت منتشر ہے محض اس وجہ سے اجرت ادنیٰ ہے کہ وہاں محنت کی مانگ نہیں۔ اگرچہ مسابقت ایک کارگر آلہ ہے۔ یہاں اس کے عمل کا حلقہ محدود رہتا ہے محنت اب تک مقابلۃً غیر نقل پذیر ہے۔ اول تو وہ حالات بھی کم ظہور میں آئے ہیں کہ جن کی بدولت محنت نقل و حرکت کرتی ہے یعنی مزدور جا بجا پھرتے ہیں۔ مزید براں مزدوروں کی ادنیٰ معاش، ان کے خیالات و جذبات، ان کی جہالت اور بیخبری بھی نقل و حرکت میں سدراہ ہوتی ہے۔

اُجرت پیشہ لوگوں کے دو طبقے ہیں۔ ماہر، اور غیر ماہر بڑی بڑی صنعتوں میں ہندوستانیوں کی حیثیت تو غیر ماہر مزدوروں کی سی ہے اور ماہر کاریگر اکثر

دوسرے ملکوں سے آتے ہیں اس لیئے ہندوستانی مزدوروں کو جو اجرت ملتی ہے وہ مجموعی پیداوار کا بہت ہی تھوڑا سا حصہ ہوتی ہے یہ پیداوار کا مالکانہ و نامنصفانہ اصول ہے جسکو مٹانے کی ہر ملک کے مزدور کوشش کر رہے ہیں۔

اجرت کے متعلق جو اعداد و شمار ملتے ہیں وہ نامکمل اور مسلمہ طور پر ناقص ہیں مزدوروں کی سب سے بڑی جماعت زراعت پیشہ ہے۔ لیکن جو کچھ تحریرات دستیاب ہوئی ہیں ان سے مطلقاً ان کی اجرت کا کوئی پتا نہیں چلتا نہ صرف مختلف پیشوں کی اجرت مختلف ہوتی ہے بلکہ اسی ایک پیشے میں حالات اور مقامات کے اختلاف کے مطابق فرق پڑ جاتا ہے روزگار کا تسلسل بھی سب جگہ برابر نہیں ہوتا۔ اور پورے سال بھر تو کہیں بھی روزگار نہیں لگا رہتا۔ پس ہندوستان میں اوسط اجرت کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ لیکن دوسرے ملکوں سے مقابلہ کرنا ہو تو ایک تندرست غیر ماہر مزدور کی اجرت کا تخمینہ کوئی تین آنے روز پڑتا ہے۔ بچے اور عورتیں جو مزدوری کرتی ہیں ان کی اجرت صاف ظاہر ہے اس سے بھی کم ہوگی۔

اقسام اجرت

ہندوستان میں اجرت کی مختلف قسمیں رائج ہیں کارخانوں میں جہاں مزدوروں کی بڑی بڑی جماعتیں ملکر کام کرتی ہیں۔ اجرت وقت کے حساب سے ملتی ہے۔ گھریلو صنعتوں اور دستکاریوں میں اجرت بالعموم کام کی مقدار کے مطابق دیتے ہیں بعض صورتوں میں اجرت کے متعلق خاص معاہدہ ہو جاتا ہے بعض وقت اجرت کی کم از کم مقدار مقرر کر دیتے ہیں۔ اگر کام اچھا ہوا تو اجرت میں بھی اضافہ کر دیا۔ اگر مزدور کا تمام کنبہ ملکر کام کرے تو سب کو مجموعی طور پر بھی اجرت دیدیتے ہیں۔

پہلے زمانے میں تو اجرت میں جنس دیا کرتے تھے لیکن اب نقد کا رواج ہو گیا ہے۔ دور افتادہ دیہات میں اب بھی کھیتی باڑی کے مزدور اور دستکار اور گھر کے خدمتی لوگ فصل کی پیداوار میں سے کچھ حصہ بطور اجرت پاتے ہیں۔ کہیں یہی حصہ کل اجرت شمار ہوتا ہے اور کہیں اس کا ایک جزو لیکن اجرت اجناس کے بجائے اجرت زر کا رواج ہر جگہ بڑھ رہا ہے۔

اجرت زر میں گزشتہ پچاس سال کے اندر اضافہ ضرور ہوا مگر نہ اس قدر جتنا کہ

قیمت اشیاء میں گزشتہ چالیس سال میں ہندوستان کے باقی صوبوں کے مقابل بنگال اور پنجاب میں صناعوں، دستکاروں، اور زراعتی مزدوروں کی اجرت میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ زراعتی مزدوروں کی اجرت میں ۲۹ فیصدی اضافہ تو بنگال میں دکھاتے ہیں اور ۴۹ فیصدی پنجاب میں اسی طرح دستکاروں کی اجرت میں ۴۸ فیصدی اضافہ بیان کیا جاتا ہے۔ اور پچاس فیصدی پنجاب میں لیکن اسی دوران میں نسبتاً چیزوں کی قیمت کہیں زیادہ چڑھ گئی مثلاً ۱۸۷۳ء میں معمولی چانول کا نرخ سوا اٹھارہ سیر فی روپیہ تھا اب وہ دس سیر بلکہ اس سے بھی کم رہتا ہے۔ بنگال میں قیمت اور بھی بڑھی ہوئی ہے ۱۸۶۲ء کا ذکر ہے کہ بنگال میں ساڑھے انتیس سیر فی روپے کے حساب سے چانول فروخت ہوا اب وہاں اس کا نرخ فی روپیہ آٹھ یا نو سیر ہے۔ پس معلوم ہوا کہ گرچہ اجرت متعارفہ میں اضافہ ہوا اجرت صحیحہ گھٹ گئی۔

اجرت اور قیمت کا تعلق

اب جو سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ کیا اجرت اور قیمت میں بھی کوئی باہمی تعلق ہے۔ تعلق ہونے میں تو کچھ شک نہیں لیکن اس سے ہمیشہ یکساں نتیجہ نمودار نہیں ہوتا۔ دراصل ان کا تعلق ہے بھی کچھ عجب طرح کا بہت راست اور بیّن تعلق تو یہ ہے کہ جب خوراک کی چیزیں ازحد مہنگی ہوتی ہیں تو اجرت میں الٹی تخفیف ہو جاتی ہے اب اس کی وجہ سنیئے۔ فصل کے نہ ہونے سے اجرت کا ذخیرہ گھٹ جاتا ہے۔ ساتھ ہی بے روزگا لوگوں کی جماعت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اگر دم لینے کا بھی سہارا ملتا ہے تو وہ کام پر آمادہ ہو جاتے ہیں گویا محنت کی طلب گھٹتی ہے اور رسد میں ساتھ ہی اضافہ ہوتا ہے۔ اجرت میں آپ ہی تخفیف ہو گی۔ لیکن اگر خوراک کی قیمت تباہی فصل کے بجائے اضافۂ طلب سے بڑھے۔ اور اس طرح کاشتکاروں کے منافع میں کچھ اضافہ ہو تو کاروبار پھیلنے سے محنت کی طلب بھی بڑھتی ہے اور اجرت میں خود بخود اضافہ ہو جاتا ہے۔

سود

بڑے بڑے کارخانوں کے واسطے بیشتر اصل یورپ والوں کی ہوا کرتی ہے پس اس کا سود اور منافع بھی باہر چلا جاتا ہے۔ ہندوستان میں نہیں رہتا۔ کبھی کارخانے یا دکان کی فراہم شدہ اصل کاروبار چلانے کے واسطے کبھی کافی نہیں

ہوتی اور اسی لیئے اکثر موقعوں پر قرض لینے کی ضرورت پڑتی ہے - یہ قرض پریزیڈنسی یا دوسرے بنکوں سے ملتا ہے -

شرح سود اصولاً تو کسی ایک جگہ ایک ہی وقت میں سب کے واسطے سود کی شرح یکساں مانی جاتی ہے لیکن معمولی طور سے یہ شرح منحصر ہوتی ہے - اول تو کارخانے کی ضمانت کی نوعیت پر دوسرے قرض کی مدت پر اس کے علاوہ سود کی شرح ملک کے مختلف حصوں میں مختلف رہتی ہے - تینوں پریزیڈنسی شہروں یعنی کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں تو بنکوں کی شرح قریب قریب یکساں رہتی ہے لیکن ملک کے اندرونی حصوں میں شرح بڑھی ہوئی ہے - خود پریزیڈنسی شہروں کے حدود میں شرح مساوی نہیں رہتی - چھوٹی چھوٹی لین دین کی دیسی دکانیں مہاجنے کے بنکوں کے مقابل زیادہ سود وصول کرتی ہیں - ہر پریزیڈنسی بنک کی طرف سے جو شرح شائع ہوتی ہے وہ ایسے قرضوں سے متعلق ہے جن میں سرکاری تمسکات کی ضمانت داخل کیجائے - طلب زر کے مطابق یہ شرح ہر روز گھٹتی بڑھتی ہے لیکن بالعموم جاڑوں میں جب کہ زرعی پیداوار تیار ہوکر خرید فروخت ہوتی ہے اور برآمد کا سلسلہ شروع ہوتا ہے - سود کی شرح چڑھ جاتی ہے اور اس کے برعکس گرمیوں میں اتر جاتی ہے عام طور پر جولائی اور اگست میں شرح بہت گر جاتی ہے یعنی ۳ یا ۴ فیصدی رہ جاتی ہے ستمبر، اکتوبر، میں کچھ چڑھنی شروع ہوتی ہے حتی کہ فروری مارچ تک بڑھتے بڑھتے ۸ یا ۹ فیصدی تک پہنچ جاتی ہے - بلکہ کبھی تو ۱۱ یا ۱۲ فیصدی تک بھی نوبت آجاتی ہے - اپریل سے پھر گرنی شروع ہوتی ہے حتی کہ پھر ۳-۴ فیصدی تک اتر آتی ہے اور اسی طرح اتار چڑھاؤ کا سال بھر دور بندھا رہتا ہے - شرح کا اوسط انگلینڈ اور یورپ کے دوسرے ملکوں سے کسی قدر بڑھا رہتا ہے لیکن نہ اتنا زیادہ کہ ۱۱-۱۲ فیصدی تک پہنچ جائے - مدامانت میں بنک روپیہ جمع کرتے ہیں - جسپر سود بھی دیتے ہیں لیکن اس کی شرح اپنے قرضے کی شرح سے کسیقدر کم رکھتے ہیں سرکار اور دوسری عام جماعتوں کو بھی کبھی قرض لینے کی ضرورت پڑتی ہے آجکل سرکاری قرضے پر سود کی شرح ۳ $\frac{1}{2}$ فیصدی ہے -

ساہوکار زراعت کے واسطے گاؤں کے ساہوکار اصل مہیا کرتے ہیں یعنی کاشتکاروں

کو کھیتی باڑی کے واسطے روپیہ قرض دیتے ہیں۔ کاشتکار بالعموم غریب ہوتے ہیں اور ساہوکار سے قرض لیکر کام چلاتے ہیں۔ لیکن ان بیچاروں کو بہت زیادہ سود دینا پڑتا ہے کبھی تو نوبت ۵۰-۶۰ فیصدی تک آجاتی ہے۔ قرض لینے کا رواج بہت عام ہے معاملے کی ایک شرط اکثر یہ بھی ہوتی ہے کہ پیداوار بازار کے بھاؤ سے کچھ کم نرخ پر ساہوکار کے حوالے کردی جائیگی۔ کبھی کبھی قرضہ بہت بڑھ جاتا ہے تمام زندگی ادا نہیں ہوتا۔ اور ورثا کو بھی اس کا بار اُٹھانا پڑتا ہے۔

ساہوکار لین دین کی حالت

ایک اعلےٰ سرکاری عہدہ دار کا بیان ہے کہ اکثر کاشتکار مہاجن کے ہاں حساب چلتا رکھتے ہیں۔ مہاجن بازار کے بھاؤ سے ایک سیر کم کے حساب سے تخم تقسیم کرتا ہے کبھی سوائی کے طریق پر تخم بانٹتا ہے یعنی فصل تیار ہونے پر تخم سے چوتھائی حصہ زیادہ پیداوار وصول کرلیتا ہے مثلاً ایک من تخم کے معاوضے میں سوا من پیداوار لیتا ہے۔ شادی بیاہ اور مقدمہ بازی۔ یہ کام تو لازمی ٹھیرے ان کے واسطے بھی مہاجن ہی قرض دیتا ہے جب کاشتکار گردش میں آجاتا ہے تو اس کو بیدخلی سے بچانے کے لیئے لگان بھی مہاجن ہی ادا کرتا ہے سچ یہ ہے کہ ہر نازک وقت مہاجن ہی کاشتکار کا کام نکالتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ کاشتکاروں پر مہاجنوں کا اثر بہت زیادہ شاید ہی کوئی کاشتکار اس سے بچا ہو۔ جب فصل تیار ہوتی ہے تو پیداوار کا بڑا حصہ مہاجن کے کھلیان میں بھرا ہوا ہوتا ہے۔ تھوڑا سا کاشتکار کے پاس بچ رہتا ہے جو دوسری فصل بونے کے وقت تک بھی بہ مشکل کنبے کی خوراک کے واسطے کفایت کرتا ہے دوسری فصل آنے سے بہت پہلے اس کو پھر مہاجن کا سہارا ڈھونڈھنا پڑتا ہے اس طریق سے سختی کے زمانے میں تو کاشتکار کو بہت مدد ملتی ہے۔ قرضدار کی طرح قرضخواہ کا بھی اس میں فائدہ ہے کہ قرضدار بھلا چنگا رہے اسی اتحاد مفاد کی بدولت کاشتکار فاقہ کشی سے بچا رہتا ہے۔

نکلسن صاحب کی رائے

مہاجن غریب کاشتکار کی مجبوریوں اور تنگدستی سے ناجائز فائدہ تو ضرور اُٹھاتا ہے لیکن اسپر یہ احسان بھی ضرور کرتا ہے کہ اس کو تباہی سے بچائے رکھتا ہے مہاجن اور کاشتکار کے تعلقات کے باب میں دو رائیں ہیں ایک تو

باب ۹

یہ کہ مہاجن کاشتکار کا بڑا خیر طلب دوست ہے۔ گویا رعیت کا ساتھی کہ اس کی ضروریات بہم پہنچاتا ہے۔ اور مصیبت کے وقت دستگیری کرتا ہے دوسری رائے یہ ہے کہ وہ ایک درندہ ہے۔ جہاں کوئی کاشتکار اس کے چڑھا ہضم کر گیا۔ جیسا کہ قاعدہ ہے حقیقت حال ان دونوں رایوں کے بین بین ہے سوسائٹی اور اعتبار یعنی لین دین کی موجودہ حالت پر نظر کرتے ہوئے وہ ایک بڑی کمی پوری کرتا ہے اور دیہات کے واسطے اس کی سخت ضرورت ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس میں بھی ذرا شک نہیں کہ وہ بہت خطرے اور زیرباری کا باعث بنا ہوا ہے۔ قدیم زمانے سے مہاجن ہندوستان میں آباد ہیں۔

سہل قرض کا اہتمام

چھوٹی کھیتی باڑی میں ہمیشہ قرض کی ضرورت پڑتی ہے۔ کاشتکار بہت سی باتوں کے واسطے قرض لیتا ہے مثلاً زمین خریدے، یا کھیت میں کوئی مستقل ترقی پیدا کرے مثلاً کنواں بنائے، یا زراعت کا سامان مہیا کرے۔ مثلاً آلات اور مویشی خریدے۔ یا روزمرہ کا خرچ چلائے یعنی تخم کھاد اور چارہ خریدے اور مزدوروں کو اجرت دے جسٹس راناڈے آنجہانی تمام ملک میں قرض دینے والی انجمنیں قائم کرنے کے بڑے مؤید تھے تاکہ کاشتکاروں کو تھوڑے تھوڑے سود پر قرض مل سکے۔ سہل اور سستا قرض مفید ضرور ہے لیکن اس میں ایک نقص بھی ہے اس کو تیغ دودم سمجھنا چاہیئے کیونکہ ممکن ہے کہ سہل ہونے کی وجہ سے فضول خرچ کاشتکار بلا ضرورت بھی بہت بہت سا قرض لینا شروع کر دیں سہل قرض ملنے سے کبھی فضول قرض لینے کی عادت پڑ جاتی ہے اور وہ ایسے کاموں میں صرف ہوتا ہے کہ دولت کے اضافے میں اس سے کچھ مدد نہیں ملتی۔

کاشتکار کی مقروضی روکنے کی تدبیر

وقتاً فوقتاً ایسی تدابیر تجویز ہوتی رہی ہیں کہ کاشتکار قرض دار نہ ہونے پائے اور اس کی حالت درست ہو اسی سلسلے میں سرکار نے حال میں دو تدبیریں اختیار کی ہیں۔ ایک تو پنجاب کا قانون انتقال اراضی۔ دوسرے قانون انجمنہائے قرض امداد باہمی۔ کاشتکار کی مشکل اس وقت آسان ہوگی جبکہ ایک طرف تو اس کو سہولت سے کمتر سود پر قرض ملنے لگے۔ اور دوسری طرف اس کو فضول اور ناعاقبت اندیشی کے قرضوں سے روک دیا جائے۔ رفیزن اور

شولز کے اثر سے جرمنی اور دیگر ممالک یورپ میں قرض کی جو انجمنیں جاری ہوئیں اور جن کے نمونے پر ہندوستان میں انجمن قرض امداد باہمی قائم ہو رہی ہیں۔ ان میں یہ دونوں خوبیاں موجود ہیں۔ قرض سستا ملتا ہے مگر فضول قرض نہیں ملتا۔ یہ انجمنیں چند خاص اصولوں پر کاربند ہیں۔ مثلاً خود امدادی۔ امداد باہمی، اتحاد، دوراندیشی، کفایت شعاری اور عام سرگرمی۔

ایک تجویز یہ بھی تھی کہ رباخواری کو بذریعۂ قانون روکنا چاہیئے۔ چنانچہ سرکار ہند نے مقامی حکومتوں سے مشورہ کرنے کے بعد ۱۹۱۸ء میں قانون رباخواری پاس کر دیا۔ جس سے عدالتوں کو یہ اختیار حاصل ہو گیا کہ وہ رحم اور انصاف کی رو سے جس قدر سود مناسب سمجھیں قرض خواہ کو دلا دیں خواہ مخواہ فریقین کے معاہدے کا پاس نہ کریں۔ امید ہے کہ اب ملک کو رباخواری سے بہت امن مل جائیگا۔ رباخواری

بنگال میں چند صاحبوں نے جن کو خدمت عامہ کا شوق ہے امداد باہمی کے اصول پر دیہات میں غلوں کے بنک کھولے ہیں۔ جو دھرم گولے کھلاتے ہیں۔ ان میں سے بعض بعض بہت اچھی طرح چل رہے ہیں۔ کاشتکار اپنے اپنے ہاں کی پیداوار کا ایک حصہ ان بنکوں میں جمع کر دیتے ہیں اور ضرورت کے وقت نکال لیتے ہیں بنکوں کے ذخیرے سے حاجتمند کاشتکاروں کو غلہ قرض بھی ملجاتا ہے۔ اس طریق میں بڑی خوبی یہ ہے کہ بہت سیدھا سادا ہے۔ اور لوگوں کے معاشرتی خیال اس کے موافق ہیں۔ تیسرا فائدہ یہ ہے کہ قلت کے زمانے میں غلے کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ البتہ یہ وقت ہے کہ غلے سے کوئی کام نہیں لے سکتے اس سلئے اس پر سود اور منافع نہیں ملتا۔ پھر غلے کے گلنے سڑنے کا بھی اندیشہ رہتا ہے۔ لیکن پھر بھی سوجھی خوب۔ اس کا اچھی طرح پر تجربہ ضرور کرنا چاہیئے۔ غلو بنک

ہر ملک میں زراعت کے مقابل صنعت کا منافع بڑھا ہوا رہتا ہے بالفاظ دیگر روپیہ پیدا کرتے ہیں۔ زراعت اس قدر مفید نہیں جسقدر کہ صنعت و حرفت۔ مزید براں زراعت چند غیر اختیاری حالات کے زیر اثر رہتی ہے مثلاً خشک سالی یا کثرت بارش۔ پس اس کا منافع بھی صنعت کے مقابل بہت غیر معین رہتا ہے صنعت کا کام بہت سے حصوں میں منقسم ہوتا ہے اور زیادہ لوگوں کو منافع حاصل صنعت اور زراعت کے منافع کا مقابلہ

کرنے کا موقع ملتا ہے۔

اعداد و شمار

ہندوستان میں جو مختلف صنعتیں ہیں ان کے منافعوں کی تفصیل تو دستیاب ہوتی نہیں۔ البتہ بڑے بڑے کارخانوں کی جو رپورٹیں شایع ہوتی ہیں ان سے عام شرح کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے۔ منافع تقریباً ۸ اور ۱۵ فیصدی کے درمیان رہتا ہے بعض بعض صنعتوں کا منافع ۳۰۔ ۴۰ فیصدی تک بڑھ جاتا ہے لیکن ایسا بہت خاص صورتوں میں ہوتا ہے کالوں اور جوٹ کے کام میں منافع بالعموم بہت بڑھا ہوا ہے چھوٹی چھوٹی صنعتوں کے منافع کے متعلق اعداد و شمار ملنے بہت دشوار ہیں۔ لیکن یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بالعموم ان میں منافع کی شرح نسبتہً ادنیٰ ہے۔

اس بحث کے سلسلے میں ان لوگوں کا منافع بھی دیکھنا چاہیئے۔ جو خود تو صنعتوں کا انتظام کرتے نہیں لیکن مال بنانے والوں اور تاجروں کے درمیان واسطہ بنے ہوئے ہیں۔ یہ کبھی کبھی بہت منافع کما لیتے ہیں۔ دیہات میں تو بالعموم یہ کام ساہوکار کرتے ہیں۔ جسقدر پیداوار مقامی ضرورت سے زاید ہوتی ہے کاشتکاروں سے تھوک فروشی کے نرخ پر خرید کر ملک کے دوسرے مقاموں میں روانہ کر دیتے ہیں۔

تقسیم پیداوار کی مختصر کیفیت اوپر بیان ہوئی لیکن واضح ہو کہ ان قسمتوں کا یعنی لگان، اجرت، سود، اور منافع کا مختلف لوگوں کی جیب میں جانا لازمی نہیں بالفاظ دیگر ایک ہی شخص کئی قسمتوں کا مالک رہ سکتا ہے۔ مثلاً ایک ہی شخص تینوں طرح سے عوامل پیدایش یعنی زمین، محنت اور اصل مہیا کرتا ہے اپنا ہی انتظام رکھتا ہے ایسی حالت میں پیداوار کے سب حصے یعنی لگان، اجرت، سود، اور منافع اسی کے پاس رہے گا چنانچہ اکثر ایسا واقع ہوتا ہے۔ ہندوستان میں چھوٹی چھوٹی صنعتوں کا زیادہ رواج ہے اور کاریگر اپنے اپنے طور پر کام چلاتے ہیں۔ خود ہی کام کرتے ہیں۔ اپنی گرہ سے تھوڑا اصل لگاتے ہیں اور اپنا ہی انتظام رکھتے ہیں پس بہت سی صورتوں میں کل پیداوار ایک ہی شخص کی ملک ہوتی ہے اور وہاں تقسیم کی کوئی نوبت نہیں آتی۔ یوں ہی ملکی کاشتکاروں کی پیداوار بھی کم تقسیم ہوتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اس وقت جو حل طلب معاشی مسئلہ

ہندوستان کے روبرو پیش ہے وہ پیدائش دولت کا ہے نہ کہ تقسیم دولت کا، لیکن پیدائش بر پیمانہ کبیر کا طریق جوں جوں رائج ہوگا۔ تقسیم کے مسائل بھی زیادہ قابل توجہ ہوتے جائیں گے۔

مغرب میں دولت کی غیر تقسیم مساوی اور خلاف انصافہ ہونے کی وجہ سے جسقدر اصل اور محنت ضائع ہورہی ہے۔ مسٹر شیوزامنی نے اس کا خاکہ یوں کھینچا ہے۔ قومی آمدنی کا بہت بڑا حصہ جو دولتمندوں کی چھوٹی سی جماعت کے قبضے میں چلا جاتا ہے اس سے تو انکے چال چلن اور اغراض ومقاصد میں بڑے بڑے عیب پیدا ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اصل کے انتظام میں وہ بہت بے پروائی کرتے ہیں۔ اور اصل کے بغیر محنت بالکل بیکار ہے اس کے ساتھ ہی مفلسوں کی بڑی جماعت کو قومی آمدنی کا بہت ہی تھوڑا حصہ ملتا ہے اس وجہ سے ان میں بھی طرح طرح کی اخلاقی اور جسمانی خرابیاں پھیل جاتی ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ دولتمند عیش وعشرت کے ہاتھوں تباہ ہوتے ہیں اور غریب تنگدستی سے پسے جاتے ہیں۔ اور ان دونوں انتہائی حالتوں کے یکجا ہونے سے جو نتائج پیدا ہورہے ہیں ان پر اس وقت تک یونہی پردہ پڑا رہے گا جب تک کہ ہم طریق تقسیم دولت کی خرابی بغور مطالعہ نہ کریں۔ الغرض یورپ اور امریکہ میں دولت بڑھنے کے ساتھ ہی اس کی تقسیم میں بہت خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں جن کے سبب سے چند افراد کے سوا قوم کو کبھی آرام واطمینان نصیب نہیں ہوسکتا۔

# دسواں باب

## مبادلۂ دولت

## تجارت

ہندوستان کی تجارت خارجہ کی مختصر سرگزشت

بہت قدیم زمانے سے ہندوستان اور اُس کے آس پاس ملکوں کے درمیان بری اور بحری راستوں سے تجارت جاری تھی۔ کسی زمانے میں ہندوستان تجارت کا بڑا مرکز بنا ہوا تھا۔

عیسیٰ علیہ السلام سے بھی چھ سات صدی قبل۔ اٹلی۔ یونان، مصر، عرب، فارس، چین، جزیرہ نمائے ملایا اور بحر ہند کے مجمع الجزائر سے ہندوستان کے تجارتی تعلقات قائم تھے۔ جس زمانے میں منو کا دھرم شاستر تیار ہوا اسوقت ہندو لوگ جہاز بنا کر بحری سفر کرتے تھے۔ اس کے بعد تجارت بین الاقوام کے کل بری اور بحری سلسلے اہل ہنود کے ہاتھ میں آگئے۔ سیاحت بحر ہند ایک مشہور قدیم یونانی کتاب ہے جسکے مصنف کا تو ٹھیک پتہ چلتا نہیں۔ لیکن اسمیں ہندوستان کی قدیم تجارت کا حال بالتفصیل مذکور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں ہندوستان کے جہاز بحر عرب۔ بحر احمر۔ آبنائے فارس اور بحر ہند میں پھرا کرتے تھے۔ دوسرے قدیم مورخ اور جغرافیہ نویس بھی مثلاً پلینی ایرین اسٹریبو اور بطلیموس بھی اس کے بیانات کی تصدیق کرتے ہیں۔ اس زمانے میں بڑے بڑے بندرگاہ یہ تھے۔ بری گازا جس کو اب بروچ کہتے ہیں۔ سوراسترا جو اب سورت کہلاتا ہے مسولی پٹن۔ بربریکن۔ موزیرس۔ نیلکنڈا۔ اندرون ملک بھی بعض بعض تجارتی شہر اور قصبے خوب آباد تھے۔ اس بحری تجارت کی مقدار غالباً بہت زیادہ ہوتی ہوگی۔ سوتی اور ریشمیں بیش قیمت پارچے اور لباس ہوتی، ہیرے، اور دوسرے قیمتی جواہرات ہاتھی دانت۔ گرم مسالے ادویات

اورخوشبوئیں یہ چیزیں خاص طور پر برآمد ہوتی تھیں۔ سامان درآمد میں سونا، چاندی، پیتل، تانبا اور ٹین شامل تھا۔ ساحل کے کنارے کنارے بھی بندرگاہوں کے درمیان تجارت خوب جاری رہتی تھی۔

کاروانوں کے ذریعے سے وسط ایشیا، چین، ایشیا کے دوسرے حصوں اور بعض ممالک یورپ سے بھی بری تجارت کا سلسلہ قائم تھا۔ تجارت کے کئی راستے تھے جن پر تاجروں کی آمدورفت رہتی تھی۔ علاوہ ازیں خود اندرون ملک مختلف حصوں میں تجارت کی خوب گرم بازاری تھی۔ بڑے بڑے دریا تجارتی راستے بنے ہوئے تھے اور خاص خاص شہروں کو شاہراہ جاتے تھے۔

زمانۂ وسطیٰ میں تجارت کی حالت

غرض دسویں صدی عیسوی تک تو تجارت کا خوب زور رہا۔ مسلمانوں کے عہد میں بحری تجارت ختم ہوگئی۔ البتہ بری تجارت جاری رہی۔ ۱۴۹۸ء میں جب پرتگالی سیاح واسکوڈی گاما افریقہ کے راس امید سے ہوتا ہوا ہندوستان پہنچا تو ہندوستان اور یورپ کے درمیان تجارت کا ایک نیا راستہ کھل گیا جو کہ تمام قدیم راستوں سے کہیں زیادہ سہل، کم خرچ اور محفوظ تھا۔ اور جس نے آخر میں ملک کی حالت کو کایا پلٹ کردیا۔ عالمگیر معاملات ہندوستان سے اسکے نئے نئے تعلق قائم ہوگئے۔ اس طرح بحری تجارت خارجہ میں از سر نو یورپ والوں کے ہاتھ سے جان پڑی۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں ڈچ، پرتگالی، فرانسیسی۔ اور انگریزی کمپنیاں ہندوستان کی تجارت میں سب سے زیادہ حصہ لینے کے واسطے آپس میں مسابقت کرتی رہیں۔

انجام کار انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی غالب آئی۔ اور اس نے سب کو بحر ہند سے نکال باہر کیا۔ دخانی جہاز ایجاد ہونے سے بحری تجارت اور بھی بڑھ گئی۔ اور جب نہر سوئز کھلی تو ہندوستان یورپ سے بہت ہی قریب ہوگیا اور ملک میں ترقی تجارت کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

یوں تو ہندوستان کی تجارت خارجہ برابر بڑھ رہی ہے لیکن ہندوستانیوں کا اس میں بہت کم حصہ ہے۔ البتہ تجارت داخلہ اب بھی زیادہ تر ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس میں بھی وہ کوئی اولوالعزمی

جرأت۔ پیش بینی اور خوش تدبیری نہیں دکھاتے اور یہی باتیں کاروبار کی جان ہیں۔

قدیم تجارت کا حال

ہر گاؤں میں کچھ تاجر رہتے ہیں اکثر گاؤں کا بڑا تاجر ساہوکاری بھی کرتا ہے یعنی کاشتکاروں کو بعض قرض دیتا ہے اور غلّے کی دوکان بھی کھولتا ہے۔ بڑے بڑے دیہات کے بازاروں میں تو غلہ روز خرید و فروخت ہوتا رہتا ہے لیکن چھوٹے گاؤں میں ہر ہفتہ ایک دو ہاٹ لگتے ہیں۔ دکانداروں کے علاوہ دیہات میں بیوپاری بھی آتے رہتے ہیں جو تجارتی چیزیں لا لاکر فروخت کرتے ہیں جب مذہبی تہوار اور میلے ہوتے ہیں تو کہیں کہیں جاتری اور تماشائی بہت کثرت سے آتے ہیں اور ایسے موقعوں پر خوب مال نکلتا ہے الہ آباد۔ ہردوار اور دیگر مقامات میں کنبھ کے بڑے بڑے میلے لگتے ہیں۔ پوری اور ہری ہر چھتر کے میلوں میں بھی دور دور سے ہزارہا لوگ آتے ہیں ایسے موقعوں پر بازاروں میں اچھی خاصی صنعتی نمائش بھی ہو جاتی ہے۔

کچھ پیداوار تو مقامی صرف کے واسطے گاؤں کی گاؤں میں فروخت ہو جاتی ہے اور باقی کو قصبات میں آڑھتیوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ جو اسے یا تو دیگر حصص ملک میں بڑے بڑے تجارتی مرکزوں کو روانہ کر دیتے ہیں یا بلاواسطہ باہر جانے کے لئے بار کر دیتے ہیں۔ سامان درآمد بھی اسی طریق پر ملک میں پھیلتا ہے۔ صرف عمل برعکس ہوتا ہے تجارت داخلہ کے بھی دو شعبے ہیں۔ ایک تو بندرگاہوں سے مال کی آمد و رفت رہتی ہے اور دوسرے مختلف حصص ملک میں باہم تجارت چلتی ہے۔ بصورت اول تو تیار مال برآمد کے واسطے فراہم کیا جاتا ہے اور درآمد کا مال ملک میں پھیلتا ہے یعنی ایک حصہ کی زاید پیداوار دوسرے حصوں میں پہنچتی رہتی ہے تجارت میں بہت سے وسطا ہوتے ہیں۔ اور اس وجہ سے اس میں بہت رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔

جہاں تجارت کی گرم بازاری بڑھی، شہر اور قصبے آباد ہونے لگے۔ اور تجارت گھٹنے سے کیسے کیسے تاریخی شہر بے رونق ہو گئے۔

تجارت میں بھی فرقہ بندی ہنود کی تفریق لگی ہوئی ہے قدیم تجارتی فرقوں کا

زور پہلا سا تو نہیں رہا۔ لیکن پھر بھی ان میں بہت کچھ انتظام قائم ہے۔ اور تجارت کا اچھا خاصا حصہ ان کے ہاتھ میں ہے وہ کونسا صوبہ ہے جہاں راجپوتانے کے مارواڑی نہ ہوں۔ مدراس میں سب سے بڑی تجارتی جماعت چھتی لوگ ہیں۔ احاطۂ بمبئی میں تجارت کا سب سے بڑا حصہ پارسیوں اور بھٹیوں کے ہاتھ میں ہے اور شمالی ہندوستان کی تجارت بنیوں نے سنگوار رکھی ہے مسلمانوں میں بمبئی اور گجرات کے بوہرے اور خوجے سب سے بڑے تجارتی فرقے ہیں۔

نقل وحمل

تجارت خواہ داخلہ ہو یا خارجہ دونوں کی ترقی کے واسطے تیز رفتار اور کم خرچ نقل وحمل کے ذرائع ناگزیر ہیں۔ یعنی مال جلد اور کم خرچ سے جا بجا پہنچنا ضروری ہے۔ گزشتہ صدی کے وسط تک لدو جانور مثلاً بیل، بھینسے، گھوڑے گدھے اور اونٹ یا تو مال ڈھوتے تھے یا مال کی گاڑیاں کھینچتے تھے۔ بری نقل وحمل کا بس یہی ذریعہ تھا۔ دریاؤں میں دیسی کشتیاں چلتی تھیں۔ انھیں میں مال آتا جاتا تھا۔ جب سے ریلیں نکلیں لدو جانور اور چھکڑوں کی قدر جاتی رہی لیکن اب بھی شہروں میں اور اسٹیشنوں پر مال ڈھونے میں یہی کام آتے ہیں۔

قدیم ذرائع آمدورفت

ہمیشہ سے سڑک اور نہر بنانا ہندوستان میں بادشاہ کا خاص فرض مانا گیا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے عہد میں بھی نہریں اور سڑکیں بنی تھیں۔ جن کے ذریعے سے دارالسلطنت اور باقی اضلاع کے درمیان آمدورفت ہوتی تھی جمنا کو کاٹ کر سلاطین اسلام نے جو نہر نکالی ہے وہ اس زمانے کی ہنرمندی کا نمونہ ہے۔ سڑکوں کے متعلق میجر برگس کا مقولہ ہے کہ ان کی تعمیر میں فن انجنیری کی مشاقی نظر آتی ہے۔ اور بڑی بڑی دشوار گزاریوں کو جس طرح ان لوگوں نے بے حقیقت سمجھا قابل حیرت ہے۔ اس لحاظ سے ان کو قدیم رومیوں کی عمارتوں کے ہم پلہ سمجھنا حق بجانب ہوگا۔ لیکن ایسی سڑکیں معدودے چند نظر آتی ہیں۔ اور ان کی بھی حالت خراب ہے بڑے بڑے دریاؤں سے آمدورفت اور نقل وحمل میں ضرور مدد ملتی تھی۔ لیکن ملک کے مختلف حصوں میں مستقل طور پر ان سے یہ کام چلنا دشوار ثابت ہوا۔

ریلیں

ایسٹ انڈیا کمپنی کے شروع عہد میں تعمیرات کا کام سرکار اپنے ذمے نہیں

سمجھتی تھی۔ لیکن بعد کو تعمیرات کی بہتر صورت نکل آئی۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد جب حکومت ہند خود بادشاہ کے تحت میں آئی۔ تعمیرات کا کام بسرعت بڑھنا شروع ہوا۔ تمام شہر اور اضلاع کے درمیان ریل کا سلسلہ جاری ہوگئے۔ بڑے بڑے دریاؤں پر پل بندھ گئے ہیں۔ ملک بھر میں سڑکیں پھیلی ہوئی ہیں دریا اور نہریں بھی اب نقل و حمل کا زیادہ کام دیتی ہیں۔ چونتیس ہزار میل سے بھی زیادہ ریلوے لائن کھلی ہوئی ہے اور سڑکوں کا مجموعی طول تو حد و شمار سے باہر ہے۔

ریل نے سڑکوں کی جگہ نہیں لی بلکہ اُس سے سڑکوں پر آمد و رفت اور بڑھ گئی چنانچہ ریلوے لائن پھیلنے کے ساتھ ساتھ نئی نئی سڑکیں بھی نکلتی رہیں۔ تقریباً تمام بڑے بڑے مرکزوں کو شاہراہیں جاتی ہیں۔ اور بے شمار چھوٹی چھوٹی سڑکیں ان سب کو باہم ملائے ہوئے ہیں۔

جہاں دریاؤں میں بڑی کشتیوں کی گنجایش ہے وہاں اگن بوٹ چلنے لگے ہیں۔ نہروں سے بھی آمد و رفت اور نقل و حمل میں مدد ملتی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ ترقی جو ہوئی وہ بحری آمد و رفت میں ہوئی۔

سب ترقیوں کے علاوہ ڈاک۔ تار اور ٹیلیفون سے خبر رسانی میں جسقدر سہولت پیدا ہوگئی ہے وہ بھی کچھ کم عجیب نہیں۔ چنانچہ انھیں کی بدولت اگر کہیں تجارت کی حالت میں ذرا سا بھی تغیر ہوتا ہے تو فی الفور دور دراز حصوں اور ملکوں میں اس کا اثر پہنچ جاتا ہے گویا کسی نے عکس ڈالدیا۔

تجارت داخلہ اور خارجہ کی موجودہ حالت

ہندوستان جیسے وسیع ملک میں آپ ہی تجارت داخلہ کا بہت زیادہ ہونا ضرور ہے۔ اور اس کی مقدار روز بروز بڑھ رہی ہے لیکن صحیح مقدار بتانی مشکل ہے۔ ریل اور دریاؤں کے ذریعے سے ۱۹۱۳-۱۴ء میں یہاں جسقدر تجارت ہوئی اسکی مقدار سرکاری نیلی کتاب میں چھ کرور ساٹھ لاکھ ٹن دکھائی ہے۔ جس کی قیمت نو ارب روپے تخمینہ کی جاتی ہے۔

تجارت داخلہ

تجارت داخلہ کی بڑی مقدار یعنی تقریباً دو ثلث کی تو بڑے بندرگاہوں میں آ کر جا ہر رہتی ہے۔ اور باقی یک ثلث تجارت برطانوی ہندوستان اور دیسی

ریاستوں کے درمیان چلتی ہے، بندرگاہوں سے جو سامان اندرون ملک جاتا ہے وہ بیرونی مصنوعات ہوتے ہیں جو بحری راستے سے آتے ہیں - اور اندرون ملک سے جو سامان بندرگاہوں میں پہنچتا ہے وہ سامان خوراک اور سامان خام ہوتا ہے جو دوسرے ملکوں کو روانہ کردیا جاتا ہے - بنگال میں جوٹ - چاول - غلے - روغنی تخم - کوئلہ اور چاء جو پیدا ہوتی ہے تو وہاں کی تجارت داخلہ بہت بڑھی ہوئی ہے - بہار اور اوڑیسہ میں کوئلہ بکثرت نکلتا ہے اور اسی کی بدولت اس صوبہ کو تجارتی امتیاز حاصل ہے - چاء آسام کی خاص پیداوار ہے احاطۂ بمبئی اور سندھ کی کپاس - گیہوں اور روغنی تخم - احاطۂ مدراس کی کپاس اور مونگ پھلی - صوبۂ متحدہ اور پنجاب کی فصل ربیع و خریف کی پیداوار خاص کر کے گیہوں - جو - چنا - چاول اور السی وغیرہ - یہی چیزیں بمقدار کثیر کلکتہ، بمبئی مدراس اور کراچی بندر کو روانہ ہوتی ہیں صوبۂ متحدہ میں ریلیں سب جگہ سے زیادہ جاری ہیں اسی لئے تجارت داخلہ جسقدر یہاں چلتی ہے کسی دوسرے صوبے میں نہیں چلتی -

تجارت داخلہ بحری تجارت خارجہ سے تقریباً دوچند ہے اور اگر تجارت داخلہ میں وہ تجارت بھی شامل کرلی جائے جو ہر صوبے کے اندر اندر اور ہندوستان کے ساحل ساحل چلتی ہے تو تجارت داخلہ کی مقدار تجارت خارجہ سے سہ چند ہوجاتی ہے -

تجارت خارجہ

ہندوستان کی تجارت خارجہ گو مجموعی تجارت کا صرف ایک جزو ہے - لیکن اس سے تجارت کی مجموعی قیمت کا پتا ضرور چل جاتا ہے - تجارتی اعداد و شمار جو برابر شائع ہوتے رہتے ہیں ان کی تازہ ترین فہرست پر نظر ڈالنے سے تجارت خارجہ کی موجودہ حالت آئینہ ہوجاتی ہے - ۱۹۱۳-۱۴ء میں درآمد کی مجموعی قیمت دو ارب پونے پینتیس کرور روپے تھی اس میں سے ایک ارب اکیانوے کرور کا تو تجارتی مال تھا اور ساڑھے تینتالیس کرور کی بدکڑ جنہیں سے کچھ کم سات کرور سرکاری حساب کی تھی -

ملبوسات

درآمد میں سب سے زیادہ مقدار مصنوعات کی رہتی ہے یعنی کوئی ۲۲ء۹

فیصدی کے قریب۔ صرف سوتی کپڑے کی قیمت ۶۶ کروڑ روپے سے زیادہ تھی یعنی درآمد کی مجموعی قیمت کے ۳۴ فیصدی۔ سوتی کپڑے میں ۹۰ فیصدی مال سلطنت متحدہ سے آیا۔ اونی کپڑے کی قیمت پونے چار کروڑ روپے تھی۔ اور ریشمیں سامان کی تین کروڑ۔ اونی مال میں سے ۴۰ فیصدی جرمنی سے آیا۔ لیکن کانپور۔ اور بنگلور نے بھی اچھی مسابقت کی اور ہندوستانی اون کی بنی ہوئی شالیں باہر کی آئی ہوئی شالوں سے بہتر تسلیم کی گئیں۔ ریشمیں مال ۹۱ فیصدی سے زیادہ چین و جاپان سے آیا۔

مختلف سامان کی درآمد۔ درآمد شیشہ آلات اور چینی کے برتنوں کی قیمت ڈھائی کرور تھی۔ کاغذ اور خط لفافوں کی سوا دو کرور۔ فلزات اور ان کے مصنوعات کی ساڑھے بائیس کرور ریل کے سازوسامان کی ڈیڑھ کرور۔ مشین اور کلوں کی آٹھ کرور دوسرے آہنی اور فولادی سامان کی ساڑھے چھ کرور۔ سامان خوراک میں شکر سب سے بڑھی ہوئی نظر آتی ہے پندرہ کرور روپے کی شکر باہر سے آئی۔ نیشکر تو زیادہ تر جاوا ماریشس اور چین سے آئی ہے۔ اور چقندر کی شکر آسٹریا ہنگری۔ جرمنی اور بلجیم سے۔ کیا عجیب بات ہے کہ کسی ایک ملک میں اس قدر شکر تیار نہیں ہوتی جتنی کہ ہندوستان میں پھر بھی اس کی درآمد بڑھ رہی ہے۔ ستاسی لاکھ روپے کا نمک بھی باہر سے آیا بالخصوص سلطنت متحدہ سے۔ تھوڑا تھوڑا اسپین، جرمنی، ترکی، عدن اور مصر سے بھی آتا ہے۔ سامان خوراک میں شکر کے علاوہ اور چیزیں بھی باہر سے آئیں۔ مثلاً شراب۔ پھل اور ترکاریاں۔ خشک مچھلی۔ بسکٹ کھیا ہوا دودھ۔ مسالے اور چاء۔ تھوڑا سا سامان خام بھی آیا جس کی قیمت ساڑھے دس کرور تھی اور متفرق درآمد کی قیمت تین کرور رہی۔

برآمد۔ برآمد مجموعی تجارت خارجہ کے ۵۲ فیصدی رہی۔ اس کی قیمت دو ارب سوا چھپن کرور روپے تھی۔ اس میں سے دو ارب پونے پینتالیس کرور تو ہندوستانی مال کی قیمت تھی اور ساٹ کرور کی رد کرہ تھی۔ ساڑھے چار کرور کا سونا اور ڈھائی کرور کی چاندی۔

خام سامان۔ سامان خام اور بے بنی چیزیں بکثرت برآمد ہوئیں یعنی مجموعی برآمد کے

۴۷ فیصدی کے قریب ان کی مجموعی قیمت ایک ارب ساڑھے بائیس کروڑ روپے رہی - روئی کی قیمت اکتالیس کرور - روغنی تخموں کی پونے چھبیس کرور - جوٹ کی پونے اکتیس کرور - چمڑے کی ساڑھے گیارہ کرور - اون کی ڈھائی کرور - کوئلہ اور اس کی راکھ یعنی کوک کی ستر لاکھ -

خورونوش کا سامان مجموعی برآمد کے ۵ء ۲۰ فیصدی رہا - اس کی قیمت پونے پینسٹھ کرور تھی - گیہوں اور اس کے آٹے کی ساڑھے تیرہ کرور - اور چانول کی پونے ستائیس کرور - جرمنی نے چانول بہت زیادہ خریدا - لیکن سلطنت متحدہ اور آسٹریا کو بھی ایک بڑی مقدار گئی - گیہوں البتہ ۸۰ فیصدی کے قریب سلطنت متحدہ نے خریدا - باقی مقدار بلجیم - جرمنی اور فرانس پہنچی - کوئی پندرہ کرور روپے کی چاء برآمد ہوئی - اس کو بھی نکب سے زیادہ یعنی بقدر ۷۰ فیصدی سلطنت متحدہ نے خریدا - ڈیڑھ کرور کا قہوہ بھی باہر گیا -

مصنوعات

مصنوعات کی برآمد میں جوٹ کا سامان سب سے بڑھا رہا - اس کی قیمت سوا اٹھائیس کرور تھی - اس کے بعد سوتی چیزیں جن کی قیمت بارہ کرور رہی علاوہ ازیں ناریل کے رسے - دباغت کیا ہوا چمڑا - اور لاکھ بھی برآمد ہوا - ادویات اور کیمیائی چیزیں بقدر چار کرور روپے برآمد ہوئیں - کچھ کم ایک کرور کا تیل بھی باہر گیا - فلزات اور اُن کی مصنوعات کی برآمد ساڑھے چھ کرور روپے کے قریب رہی بالخصوص مینگنیز کی برآمد بہت ترقی کر رہی ہے - گزشتہ دس سال میں ۲۵ لاکھ سالانہ سے سوا کرور کے قریب پہنچ گئی -

باہر سے آیا ہوا مال بھی ساڑھے چار کرور روپے کے قریب پھر باہر کو روانہ ہوا -

تجارت خارجہ کی ترقی

گزشتہ پچاس سال کے اندر ہندوستان کی تجارت خارجہ کی مقدار بہت بڑھ گئی - تجارتی سامان کی مجموعی قیمت ایک ارب ستائیس کرور سالانہ سے چار ارب چالیس کرور ہو گئی - اس میں درآمد تو چوالیس کرور سے ایک ارب پونے اکیانوے کرور تک پہنچی - اور برآمد اکیاسی کرور سے

دو ارب سوا انچاس کروڑ تک بڑھ گئی۔ معلوم ہوا کہ برآمد کے مقابل درآمد میں زیادہ اضافہ ہو رہا ہے۔

خاص ملکو[ں] سے تجار[ت]

سلطنت متحدہ سے ۱۹۱۳-۱۴ء میں بقدر ایک ارب چھہتر کروڑ روپے کی تجارت ہوئی۔ برطانوی مقبوضات سے بقدر ساڑھے چھیالیس کروڑ کے اور باقی ممالک سے بقدر دو ارب دس کروڑ کے۔ ہندوستان میں درآمد تو بیشتر سلطنت متحدہ سے ہوتی ہے اور برآمد زیادہ تر دوسرے ملکوں کو جا رہی ہے۔

ہندوستان اور خاص ممالک کے درمیان جو درآمد و برآمد جاری ہے اس کی مختصر کیفیت ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

| ممالک | کو برآمد فی صدی | سے درآمد فی صدی |
|---|---|---|
| سلطنت متحدہ | ۲۳٫۷ | ۶۴٫۱ |
| برطانوی مقبوضات | ۱۴٫۱ | ۵٫۹ |
| جرمنی | ۱۰٫۳ | ۶٫۹ |
| چین | ۲٫۳ | ٫۹ |
| ریاستہائے متحدہ | ۸٫۹ | ۲٫۶ |
| جاپان | ۹٫۲ | ۲٫۶ |
| بلجیم | ۴٫۹ | ۲٫۳ |
| فرانس | ۷٫۱ | ۱٫۵ |
| جاوا | ٫۸ | ۵٫۸ |
| آسٹریا ہنگری | ۳٫۹ | ۲٫۳ |
| روس | ۱٫۶ | ٫۰۳ |

ذیل کے اعداد اس لحاظ سے بہت دلچسپ اور نتیجہ خیز ہیں کہ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے ملکوں کے مقابل ہندوستان میں تجارت کا اوسط فی کس کیا پڑتا ہے۔

| | پونڈ | شلنگ | پنس |
|---|---|---|---|
| ہندوستان | | ۱۷ | ۷ |

| | پونڈ | شلنگ | پنس |
| --- | --- | --- | --- |
| روس | ۱ | ۱۲ | ۱۰ |
| سلطنت متحدہ | ۲۵ | ۱۴ | ۱۰ |
| فرانس | ۱۵ | ۹ | ۷ |
| جرمنی | ۱۵ | ۷ | ۷ |
| اٹلی | ۷ | ۱ | ۹ |
| ریاستہائے متحدہ | ۹ | ۱ | ۷ |
| جاپان | ۲ | ۱۲ | ۷ |
| چین | ۰ | ۷ | ۴ |

**جہازرانی**

ہندوستان کی تجارت خارجہ بیشتر انگریزی جہازوں کے ذریعے سے چلتی ہے۔ ۱۴-۱۹۱۳ء میں تقریباً ۷۵ فیصدی مال ان جہازوں میں آیا گیا جن پر برطانوی جھنڈا لہراتا تھا۔ اور اگر ہندوستانی رجسٹر کے جہاز بھی شریک کر لئے جاویں تو ۷۷ فیصدی سمجھنا چاہیئے۔ غیر قوموں کے جہاز جو ہندوستان کے بندرگاہوں میں آئے گئے ان کی تعداد ۱۴۶۶ رہی۔ ان میں سے تقریباً دو تہائی جہاز جرمنی اور آسٹریا کے تھے۔ جاپان۔ ناروے۔ اٹلی۔ ہالینڈ۔ اور فرانس کے جہاز بھی ہندوستان کی تجارت کا مال ڈھوتے ہیں۔ غیر ملکوں کے جہازوں کا نقل و حمل میں دخل بڑھتا جاتا ہے۔ کیسے افسوس کی بات ہے کہ غریب ہندوستان کے جہازوں کا یہاں کی تجارت میں کوئی حصہ نہیں۔

**سرحدی تجارت**

ہندوستان کی سرحدوں پر ہو کر بری راستوں سے جو تجارت جاری ہے بحری تجارت کے مقابل ۵ فیصدی سے زیادہ نہیں۔ اس تجارت کے متعلق کچھ اعداد و شمار ملتے بھی ہیں تو نامکمل اور غیر معتبر ۱۴-۱۹۱۳ء میں سرحدی تجارت کی مقدار کا تخمینہ یہ تھا کہ درآمد کی قیمت بارہ کرور اور برآمد کی ساڑھے نو کرور۔ گزشتہ چند برس میں اس تجارت نے خاص ترقی کر لی ہے۔

**ساحلی تجارت**

۱۴-۱۹۱۳ء میں ساحلی تجارت کی قیمت ساڑھے اڑسٹھ کرور رہی۔ اور تجارتی مال کے سوا اس میں اور کوئی چیز شامل نہیں۔ زیادہ تر تجارت یا تو مشرقی

ساحل کے بندرگاہوں اور برما کے درمیان جاری ہے یا بمبئی اور کراچی کے درمیان -

۰۵-۱۹۰۴ء سے ۱۴-۱۹۱۳ء تک دس سال کے اندر ہندوستان میں دو ارب انیس کرور روپے کا سونا درآمد ہوا -

توازن تجارت

ہندوستان کی تجارت خارجہ کی جو کیفیت اوپر بیان ہوئی اس سے واضح ہوا کہ ہندوستان کی برآمد یہاں کی درآمد سے بڑھی رہتی ہے - ۱۴-۱۹۱۳ء میں زیادتی کی مقدار جس میں تجارتی مال اور روکڑ دونوں شامل ہیں اکیس کرور تیس لاکھ تھی - اس میں سرکاری کاروبار بھی داخل ہے - اگر اس کو شمار نہ کیجئے تو پھر مقدار چھتیس کرور قرار پاتی ہے - گزشتہ دو سال اس کا اوسط تیس کرور پندرہ لاکھ اور اکتالیس کرور دس لاکھ رہا - توازن تجارت کی کیفیت کے متعلق ایک دلچسپ تشریح درج کرتے ہیں - ہندوستان سے مال برآمد ہوتا ہے - ہندوستان میں اصل درآمد ہوتا ہے - دوسرے ملکوں کے لوگ جو یہاں رہتے یا سیر و تفریح کو آتے ہیں ان کے واسطے باہر سے خرچ آتا ہے - یہ وہ مدیں ہیں جن میں ہندوستان کو باہر سے رقم وصول ہوتی ہے - ساتھ ہی اس کے ہندوستان میں باہر کا مال درآمد ہوتا ہے - اوّل تو اس کی قیمت دوسرے وزیر ہند کی طرف سے خرچ کے واسطے جو ہنڈیاں جاری ہوتی رہتی ہیں - تیسرے یہاں کے کاروبار میں باہر کا اصل لگا ہوا ہے اس کا سود - چوتھے یورپین تاجر اور ملازم لوگ جو ہندوستان میں رہ کر اپنا اندوختہ دوسرے ملکوں کے کاروبار میں لگاتے ہیں یہ سب اصل - پانچویں ہندوستان کی بحری اور ساحلی تجارت میں جسقدر یورپ کے جہاز کام کرتے ہیں - ان کی کمائی - چھٹے ہندوستانی جو دوسرے ملکوں میں رہتے ہیں - اُن کو جس قدر خرچ بھیجا جائے - ساتویں باہر کی بیمہ کمپنیاں یہاں پر جسقدر بیمہ کریں اس کی مستقل فیس - یہ سب وہ مدیں ہیں جن میں ہندوستان دوسرے ملکوں کو رقم ادا کرتا ہے توازن تجارت تو ہندوستان کے بہت موافق ہے یعنی ہندوستان کا واجب الوصول اسکے واجب الادا سے بڑھا رہتا ہے - کیونکہ یہاں کی برآمد یہاں کی درآمد سے

زیادہ ہے۔ لیکن دوسری سیاسی مدون میں لئے سلطنت متحدہ کے علاوہ دوسرے ممالک کو بہت کچھ دینا پڑتا ہے اس لئے تجارت کی مدمیں جو کچھ اس کا زاید نکلتا ہے اس کا صرف ایک قلیل حصہ روکڑ کی شکل میں وصول ہوتا ہے۔ باقی کا کوئی بلاواسطہ معاوضہ نہیں ملتا۔ یہ حالت کہاں تک ذرائع ملک کی نقصان پہنچانے والی ہے۔ اس سے آیندہ بحث کی جاوے گی۔

قیمتیں

انیسویں صدی کے وسط سے قیمتیں بڑھنے کا رجحان نمایاں ہوا۔ گزشتہ پچیس سال میں اضافے کی رفتار تیز ہوئی اور پچھلے دس سال میں تو قیمتیں کہیں سے کہیں پہنچ گئیں۔ سنہ ۱۸۹۱ء و سنہ ۱۹۰۰ء کا دہ سالہ اوسط سابق اوسط سے بڑھا رہا۔ اور سنہ ۱۹۰۱ء و سنہ ۱۹۱۰ء کا اوسط اس سے بھی بڑھ گیا۔ گزشتہ چار یا پانچ سال کے اندر اندر قیمتیں اور بھی چڑھ گئیں۔ بالخصوص غلوں کی قیمت سب سے بڑھی نظر آتی ہے سنہ ۱۸۷۳ء میں غلوں کی جو قیمت تھی اس کو ۱۰۰ فرض کرکے سنہ ۱۹۰۹ء میں قیمتوں کی مقدار حسب ذیل تحقیق ہوئی۔

| | |
|---|---|
| چانول | ۲۲۲ |
| گیہوں | ۲۰۱ |
| جوار | ۱۷۶ |
| باجرا | ۱۶۸ |
| راگی | ۲۴۷ |
| چنا | ۱۸۵ |
| جو | ۱۶۵ |

ان سب غلوں کی مجموعی قیمت کا نمائندہ عدد ۱۹۵ نکلا۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں غلوں کی قیمت خاص طور پر چڑھی رہی۔ اس سال کا نمائندہ عدد ۲۳۱ تھا سنہ ۱۸۹۰ء سے سنہ ۱۸۹۴ء تک چار سال قیمتیں معمولی رہیں۔ ان کو ۱۰۰ فرض کرکے سنہ ۱۹۱۰ء و سنہ ۱۹۱۲ء تین سال خاص خاص چیزوں کی جو قیمتیں رہیں ان کا نقشہ ذیل میں درج کرتے ہیں۔

| | سنہ ۱۹۱۰ء | سنہ ۱۹۱۱ء | سنہ ۱۹۱۲ء |
|---|---|---|---|
| اناج | ۱۲۷ | ۱۲۶ | ۱۴۳ |

| | سنہ ۱۹۱۰ء | سنہ ۱۹۱۱ء | سنہ ۱۹۱۲ء |
|---|---|---|---|
| غلے میینا | ۱۲۴ | ۱۲۲ | ۱۴۲ |
| خوراک کی دوسری چیزیں | ۱۳۰ | ۱۲۳ | ۱۳۶ |
| روغن-روغنی تخم اور کھلی | ۱۴۳ | ۱۴۹ | ۱۵۶ |
| ریشے روئی | ۱۱۹ | ۱۴۴ | ۱۶۰ |
| چمڑا | ۱۶۴ | ۱۵۹ | ۱۷۲ |
| دوسرا خام مصنوعاتی سامان | ۱۲۷ | ۱۲۹ | ۱۳۲ |
| عماراتی سامان | ۱۴۲ | ۱۴۶ | ۱۴۹ |
| عام اوسط | ۱۳۲ | ۱۳۴ | ۱۴۱ |

اوپر جو سالوں کے نمائندہ عدد درج ہیں ان سے قیمتوں کی سطح کا سرسری اندازہ ہو جاتا ہے۔ ٹھیک ٹھیک پتہ چلنا دشوار ہے اوسط نکالنے میں طریق توازن بہت مفید ہے۔ یعنی نہ صرف ہر چیز کی قیمت بلکہ اُس قیمت پر جسقدر مقدار فروخت ہوئی ہو۔ مجموعی اوسط نکالنے میں ان مقداروں کا بھی لحاظ رکھا جائے۔ یہ ایک خاص طریق اوسط نکالنے کا ہے۔ لیکن دقتیں بھی اس کے عمل میں پیش آتی ہیں۔

گرانی کے اسبا

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر قیمتیں بڑھنے کے اسباب کیا ہیں۔ واضح ہو کہ سرکار ہند نے اپنے صیغہ مال کے ایک اعلیٰ عہدہ دار مسٹر کے ایل۔ دت کو اسباب گرانی کی تحقیقات کے واسطے مقرر کیا صاحب موصوف نے اس باب میں جو کیفیت شائع کی ہے وہ بہت دلچسپ اور نتیجہ خیز معلومات سے لبریز ہے اس رپورٹ کا مختصر سا خلاصہ ہم نے بھی اس کتاب میں بطور ضمیمہ شامل کر دیا ہے۔ قیمت سے کیا مراد ہے۔ یہی نہ کہ آلہ مبادلہ یعنی زر اور چیزوں کے باہم جو تعلق ہو اس کا اظہار قیمت کہلاتا ہے۔ جب اس تعلق میں کچھ تغیر تبدل ہوتا ہے تب ہی قیمتیں بھی کم و بیش ہوتی ہیں۔ اضافہ قیمت کے چار اسباب ہو سکتے ہیں۔ (۱) چیزوں کی طلب بڑھنا۔ (۲) چیزوں کی رسد گھٹنا۔ (۳) زر کی مقدار میں اضافہ ہونا (۴) یا زر کی رفتار گردش بڑھ جانا۔ یہ قرار دینا ذرا مشکل ہے کہ ان میں سے کون کون اسباب موجودہ اضافہ قیمت کے باعث ہوئے ہیں۔ آیا کوئی ایک خاص یا دو تین

یا سب ملکر یہ نتیجہ پیدا کر رہے ہیں۔ اور اگر ملے ہوئے ہیں تو ہر ایک کو نتیجہ میں کتنا کتنا دخل ہے۔ سنہ ۱۸۹۰ء سے لیکر اب تک آبادی میں تقریباً دس فیصدی اضافہ ہوچکا ہے۔ گرانی کا ایک سبب تو یہی ہے۔ مزید برآں معیار زندگی بھی کسی قدر بڑھ چلا ہے۔ اس وجہ سے بھی طلب میں اضافہ ہوا۔ اور سب سے بڑھکر یہ بات ہے کہ دوسرے ملکوں میں ہندوستان کی پیداوار خوراک بکثرت جانے لگی ہے اور مانگ روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اب رسد کو لیجئے۔ جو اعداد شمار سرکار کی طرف سے شائع ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوا کہ غلوں کی کاشت بعض صوبوں میں گھٹی اور بعض میں بڑھ گئی ہے۔ لیکن یہ اعداد و شمار کچھ زیادہ قابل اعتبار نہیں۔ اور ٹھیک معلوم نہیں ہوسکتا کہ ہر خاص خاص غلے کی مجموعی پیداوار میں کمی ہوئی یا بیشی۔ بہر حال یہ امر یقینی ہے کہ اگر ان کی پیداوار کچھ بڑھی بھی تو اتنی ہرگز نہیں بڑھی کہ اضافۂ طلب کا ساتھ دے سکے۔ بات یہ ہے کہ جب سے ملکوں میں یہاں کی روئی جوٹ اور دوسری تجارتی پیداوار کی مانگ بڑھی ان چیزوں کی کاشت بہت پھیل گئی اور غلوں کی کاشت کو نقصان پہنچا۔ چنانچہ مسٹر دت نے بھی اپنی مشہور کیفیت اسباب گرانی میں یہی رائے ظاہر کی ہے۔ گرچہ بعد کو سرکار ہند نے ایک خاص تحریک کی شکل میں اس رائے کی ترمیم کردی۔ اب آلۂ مبادلہ کو لیجئے۔ ہندوستان میں بھی جو اور ملکوں سے ترقی میں کمتر ہے۔ یہ بحث بہت پیچیدہ نظر آتی ہے۔ وقت یہ ہے کہ سکہ اور کرنسی نوٹ کے علاوہ ہنڈیاں چک اور رقعے بھی ترقی یافتہ کاروبار میں آلۂ مبادلہ کا کام دیتے ہیں اور ان سب کی ٹھیک مقدار معلوم ہونی محال ہے۔ دوسری دقت یہ کہ آلۂ مبادلہ کی رفتار گردش کی پیمائش ممکن نہیں۔ پس کوئی نہیں کہہ سکتا کہ طریق زر کو اضافۂ قیمت میں کہاں تک دخل ہے۔ تاہم یہ اغلب ہے کہ نقرئی زر کی جو اس طرح سرکار روک تھام رکھتی ہے اور اسی وجہ سے زر کی رسد طلب کا خود بخود ساتھ دینے سے معذور ہے اس انتظام کا اضافہ قیمت سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے۔ چنانچہ ایک صاحب نے ۲۸ اپریل سنہ ۱۹۱۱ء کے اخبار پائنیر میں بالتفصیل دکھایا ہے کہ جب کبھی دارالضرب سے نئے

تازہ روپیہ نکلا قیمتیں کچھ نہ کچھ ضرور بڑھ گئیں۔ گزشتہ چند سال سے تمام دنیا میں گرانی نمودار ہو رہی ہے۔ ہر جگہ قیمتیں کم و بیش بڑھ رہی ہیں۔ ہندوستان کی گرانی کسی قدر اس عالمگیر رجحان کا بھی نتیجہ ہو سکتی ہے۔ تمام عالم میں جو قیمتیں بڑھ رہی ہیں اس کے خاص خاص اسباب یہی معلوم ہوتے ہیں۔ تمام مہذب ممالک میں معیار زندگی کا اعلےٰ ہو جانا۔ کاروبار میں اعتبار بڑھ جانا۔ طلا کی رسد میں اضافہ ہونا اس آخری سبب کے متعلق پروفیسر سلگمین لکھتے ہیں کہ سونا اس قدر زیادہ نکل رہا ہے کہ اس کی قدر و قیمت خود گھٹتی جاتی ہے جب باقی چیزیں اپنی جگہ پر قائم رہیں اور سونے کی قیمت گھٹے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ سب چیزوں کی قیمتوں میں اضافہ ہوا۔

اب یہ سوال کہ آیا یہ قیمتوں کا اضافہ چند روزہ ہے یا مستقل۔ اس کے متعلق مسٹر وٹ کی رائے بہت قرین حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ ابھی مدت تک قیمتیں یونہی بڑھتی رہیں گی۔ کم سے کم ان کی تخفیف کی تو کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

گرانی کے نتائج

جہاں تک تجارت بین الاقوام کا تعلق ہے قیمتیں بڑھنے سے ہندوستان کو فائدہ پہونچا۔ کیونکہ دوسرے ملکوں سے اس کو اپنے سامان برآمد کی زیادہ قیمت وصول ہوئی لیکن اندرون ملک مختلف طبقوں پر گرانی کا مختلف اثر پڑا۔ غلے تو سب ہی خریدتے ہیں اس لیئے ان کی گرانی کا تو تقریباً سب پر اثر پڑا۔ طلب بڑھنے کی وجہ سے غلے کی قیمت میں جس قدر اضافہ ہوا اس سے کاشتکاروں کو بالخصوص جن کے لگان معین ہیں ضرور فائدہ پہنچتا ہے۔ گو بوجہ ان کی آزمودہ کاری بے خبری اور شدت احتیاج کے منافع کا بڑا حصہ درمیانی لوگ یعنی آڑھتیے اور تاجر ہضم کر لیتے ہیں۔ بہرحال ان کی حالت کسی قدر سدھر چلی ہے اور اب وہ زیادہ چیزیں برتنے لگے ہیں۔ قیمتیں بڑھنے سے تجارت میں جو چہل پہل بڑھی۔ اس حد تک تجارت پیشہ لوگوں کو بھی فائدہ حاصل ہوا جہاں جہاں زمیندار قیمتیں بڑھنے کے ساتھ ساتھ لگان میں اضافہ کر سکے وہاں کے زمیندار بھی نفع میں ہیں۔ لیکن اجرت پیشہ لوگ ہر طبقے کے نقصان میں رہے۔

وجہ یہ کہ اجرت میں اضافہ اس قدر نہ ہو سکا جتنا کہ قیمتوں میں ہو رہا ہے بالخصوص جن لوگوں کو رواجی اجرت ملتی ہے یا جن کی آمدنی کم و بیش معین ہے ان پر گرانی بہت زیادہ گراں گزر رہی ہے مصارف زندگی بڑھ جانے سے متوسط طبقے بھی اس گرانی کے ہاتھوں بہت زیر بار ہو رہے ہیں۔ یہ نکتہ خالی از دلچسپی نہیں کہ قیمتیں بڑھ جانے سے چونکہ زر کی قدر گھٹ گئی اس لیئے قرضدار فائدے میں ہیں۔ اور قرض خواہوں کا نقصان ہے۔ مثلاً اگر قیمتوں میں ۲۵ فیصدی اضافہ ہوا تو آجکل کے پانچ روپے بلحاظ قدر پہلے کے چار روپے کے برابر ہوں گے۔

# گیارہواں باب

## زر

**ہندوستان میں زر کی قدامت**

جہاں تک قدیم زمانے کی تحریرات دستیاب ہوئی ہیں اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں یہاں زر کا رواج ہو چکا تھا۔ جس عہد سے تاریخ کی ابتدا ہوتی ہے اس عہد تک ہندوستانی لوگوں نے تہذیب و تمدن میں بہت کچھ ترقی کر لی تھی۔ صنعت و تجارت کا دور شروع ہو گیا تھا تمدن و معاشرت کے اس درجہ ترقی پانے پر مبادلہ لازمی ہے اور مبادلے کے واسطے زر ضروری ہے۔

قدیم زمانے میں یہاں زر رائج ہونے کے بہت سے ثبوت ملتے ہیں جن میں سے خاص خاص یہ ہیں۔

(ا) یہاں کی آبادی اور معاشرت کے قدیم حالات۔

(ب) وید اور ان کے زمانے کی دوسری تحریرات۔

(د) منوجی کا شاستر (ہ) بدھ زمانے کی کتابیں

(و) آثار قدیمہ (ز) علم مقابلۂ السنہ۔ معلوم ہوا کہ سونے چاندی اور تانبے کے مختلف سکے رائج تھے۔ ان کے علاوہ کوڑی کے مثل کی چیزیں بھی مبادلے میں کام آتی تھیں۔ سونے چاندی کے سکے بنوانا خاص بادشاہ کا حق تھا۔ لیکن لوگ جو بطور خود سکے بناتے تو اس کی روک تھام کا بھی کوئی خاص اہتمام نہ تھا۔

**مسلمانوں کا عہد حکومت**

مسلمانوں کے عہد حکومت میں زر کی اصلاح شروع ہوئی اور اس کے متعلق چند دلچسپ تجربے عمل میں آئے۔ بادشاہوں کی طرف سے لوگوں کو بطور خود سکہ بنانے کی ممانعت ہو گئی۔ محمد تغلق نے زر کی ایک نئی ترکیب نکالی۔ پہلے تو اس نے سکوں کی چاندی کھوٹی کر دی۔ اور آخرکار تانبے کے سکے بنائے اور

اور ان کی قدر و قیمت وہی رکھنی چاہی جو چاندی کے سکوں کی تھی۔ اس ترکیب میں اس نے بیشک بڑی جرأت دکھائی اور اسی کو حال کے کاغذ زر کا پیش خیمہ سمجھنا چاہیئے۔ مگر وہ اس وقت نہ چل سکی۔ ادھر تو امریکہ دریافت ہوا۔ ادھر ہندوستان اور یورپ کے تجارتی تعلقات بڑھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چاندی اور مسالوں کے بدلے ہندوستان میں بہ کثرت سونا آنے لگا۔ اکبر نے بھی بہت چاہا کہ کوئی ایک معیاری زر رائج ہو جائے یعنی ایسا زر جو عام طور پر معیار قیمت کا کام دے۔ مثلاً آجکل یہاں روپیہ معیاری زر بنا ہوا ہے۔ مگر اکبر کو پوری کامیابی نہ ہوئی۔

سترہویں صدی میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی اپنے کارخانوں کے واسطے سکہ نکالا۔ باقی عہد مغلیہ میں جابجا مختلف وزن کے سکے ڈھلتے رہے۔

انیسویں صدی میں زر کا ردو بدل

انیسویں صدی کے شروع میں ہندوستان کے بعض حصوں مثلاً مدراس میں طلائی زر بطور معیار قیمت رائج تھا۔ اور بعض مثلاً بنگال میں نقرئی زر معیار قیمت تھا۔ لیکن ساتھ ہی طلائی سکے بھی چلتے تھے ہندوستان کے ضلع ضلع میں مختلف شکل، وزن اور قدر و قیمت کے طلائی و نقرئی سکے بطور زر استعمال ہوتے تھے۔ سنہ ۱۸۰۶ء کا ذکر ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹر یا ناظموں نے یہ مطالبہ منظور کیا کہ یہاں یکساں سکے رائج کیئے جائیں۔ پہلا کام یہ ہوا کہ قسم قسم کے سکوں کے بجائے صرف چار قسم کے روپے اور چند قسم کی طلائی مہریں جاری رکھی گئیں۔ کمپنی کے ناظموں نے بمبئی اور مدراس کی حکومتوں کو ولایت سے جو مراسلے بھیجے اس میں صاف طور پر لکھدیا کہ اگرچہ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ملک میں نقرئی روپیہ ہی معیار قدر و قیمت کا کام دیتا ہے۔ اور اسی زر کے حوالے سے حساب و کتاب چلتا ہے۔ تاہم وہ یہ نہیں چاہتے کہ طلائی سکوں کا چلن اٹھا دیا جائے۔ باایں ہمہ سنہ ۱۸۱۸ء میں مدراس کا طلائی پگوڈا خارج کر کے روپیہ جاری کر دیا گیا۔ سنہ ۱۸۳۵ء میں روپیہ بوزن ۱۸۰ گرین۔ جس میں ۱۶۵ گرین خالص چاندی شامل ہے۔ تمام برطانوی ہندوستان کے واسطے عام معیاری سکہ قرار پاگیا۔ ساتھ ہی یہ قانون پاس ہوا کہ کمپنی کے ملک میں طلائی سکہ

زر قانونی کے طور پر قبول نہیں کیا جائیگا - یعنی زر قانونی تو ہر چھوٹی بڑی رقم کی وصول یابی میں قبول کرنا قانوناً لازمی ہے - مثلاً ہندوستان کا زر قانونی روپیہ ہے کہ کوئی اس کے لینے سے انکار نہیں کر سکتا - لیکن اس زمانے میں طلائی سکوں کو زر قانونی سے خارج کر دیا یعنی کوئی اس کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا - ۱۸۳۵ء کے قانون نے طلائی مہریں (جو کہ اسوقت ۱۵ روپے کے ہمقدر ہے) جاری رکھیں - اور ۱۸۴۱ء میں باقاعدہ یہ بھی اعلان ہوگیا کہ سرکاری خزانوں میں یہ مہریں ۱۵ روپے کے حساب سے داخل ہونگی - لیکن جب آسٹریلیا میں بہ کثرت سونے کی کانیں نکلیں تو چاندی کے حساب سے اس کی قیمت اس قدر گھٹی کہ وہ اعلان سرکار ہند کے واسطے وبال جان ہوگیا - اور آخر کار ۱۸۵۲ء میں اسے منسوخ کرنا پڑا - ۱۸۶۴ء میں سرکار ہند نے یہ تجویز کیا کہ ساورن اور نصف ساورن جو انگلستان آسٹریلیا - اور ہندوستان کی شاہی ٹکسالوں میں ڈھلیں دس روپے فی ساورن کے حساب سے یہاں بھی زر قانونی قرار دے دی جائیں - اور سرکاری کرنسی نوٹ یعنی کاغذ زر - اسی حساب سے خواہ روپیوں سے بدلے جاویں یا ساورنوں سے - شہنشاہی حکومت یعنی سرکار برطانیہ ساورن کو یہاں زر قانونی بنانے پر تو رضامند نہ ہوئی لیکن کرنسی نوٹ بھنانے کے متعلق آخری تجویز منظور کر لی - یعنی یہ کہ ان کے مبادلے میں خواہ روپے لیئے جاویں یا دس روپیہ کے حساب سے ساورن -

چاندی کی قدر میں تخفیف اور ہرشل کمیٹی

اس طرح ہندوستان میں نقرئی معیار قائم رہا - یعنی زر نقرئی خاص کر معیار قیمت کا کام دیتا رہا - پہلے تو یہ قاعدہ تھا کہ لوگ بے روک ٹوک اپنی چاندی ٹکسال لے جاتے اور سکے ڈھلوا لاتے - پس روپے کی قدر و قیمت بحوالہ طلا وہی رہتی تھی جو چاندی کی اینٹ کی ہوتی - لیکن چاندی کی قیمت میں بڑا انقلاب پیدا ہوا - ادھر تو اس کی نئی نئی کانیں دریافت ہوئیں - اور ادھر اکثر مہذب ملکوں نے نقرئی زر قانونی خارج کر کے طلائی زر قانونی جاری کر دیا - اور نقرئی سکوں کی قیمت محض زر علامتی کی سی رہ گئی - یعنی کل

نقرئی سکے دوانی، اکنّی اور پیسوں کی طرح معمولی سودے سلف میں کام آنے لگے۔ بڑی رقموں کے لین دین کے واسطے طلائی سکے زر قانونی قرار پائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چاندی کی قدر و قیمت بہت گر گئی ۱۸۷۳ء سے روپے کی قدر مبادلہ برابر گھٹتی رہی۔ چنانچہ تنگ آکر ۱۸۷۸ء میں سرکار ہند نے یہ تجویز پیش کی کہ نقرئی زر رائج رہے تو رہے لیکن طلائی معیار بھی جاری کر دیا جائے۔ لیکن ایک مجلس محکمہ کے مشورے سے سرکار برطانیہ نے یہ تجویز بھی رد کر دی لیکن روپے کی قدر مبادلہ اس درجہ گھٹی کہ ۱۸۷۳ء میں ۲ شلنگ تھی اور ۱۸۹۲ء میں ایک شلنگ ۴ پنس رہ گئی۔ یعنی پہلے تو روپیہ دو شلنگ کے ہم قدر مانا جاتا تھا اور اب ایک شلنگ ۴ پنس پر نوبت آ گئی۔ گرچہ اندرون ملک کچھ مضائقہ نہ تھا۔ لیکن طلائی معیار والے ملکوں سے ہندوستان کے جو تجارتی تعلقات قائم تھے۔ ان پر اس تخفیف قدر کا بہت برا اثر پڑا۔ شرح مبادلہ میں اس قدر تغیر تبدل ہونے سے تجارتی حالات کایا پلٹ ہو گئے اور بیرونی اصل سے ہندوستان میں جو معاشی ترقی ہو رہی تھی وہ رک گئی چنانچہ ۱۸۹۲ء میں بنگال کے ایوان تجارت نے سرکار ہند سے فریاد کی کہ چونکہ کاروباری طبقوں کو روپے کی مستقل قدر و قیمت کے متعلق کوئی اطمینان نہیں رہا باہر کے لوگ اپنا اپنا اصل یہاں نہیں لگاتے اور بہت سے کاروبار رکے ہوئے ہیں۔ مزید براں سرکار ہند کو جو اپنے ذمے کی رقمیں انگلستان میں ادا کرنی پڑتی ہیں۔ ان کے ادا کرنے میں بہت نقصان اٹھانا پڑتا تھا۔ یعنی جوں جوں روپے کی شرح مبادلہ گھٹی طلائی زر کے حساب سے جس قدر رقم انگلستان میں خرچ ہوتی تھی۔ اس کو روپے کے حساب سے ادا کرنے میں روپے کی زیادہ زیادہ مقدار درکار ہونے لگی اس کے علاوہ روپے کی قدر گھٹنے سے برطانوی عہدہ داروں کو جو نقصان پہنچا تو سرکار اس کی تلافی میں بھتہ الگ دیتی تھی۔ روپے کا خرچ بڑھنے سے محصول بڑھانے کی ضرورت پڑی اور روپے کی قدر و قیمت میں جو بڑے بڑے تغیر ہونے لگے تو سالانہ بجٹ یعنی موازنہ بنانا بہت ہی دشوار ہو گیا ان دقتوں سے تنگ آکر کتنے ہی سال تک سرکار ہند اسی کوشش میں

لگی رہی کہ کسی طرح بین الاقوام دو فلزی معیار رائج ہو جائے یعنی سب ملکوں میں چاندی سونے کے سکے بطور زر قانونی چلنے لگیں ۔ لیکن جب اس مقصد میں ناکامی ہوئی تو آخر کار ۱۸۹۲ء میں بصدارت لارڈ ہرشل ایک کمیٹی مقرر ہوئی تاکہ وہ سرکار ہند کی اس تجویز پر غور کرے کہ آزاد سکہ سازی بند کر دی جائے یعنی لوگ اپنے طور پر ٹکسالوں میں روپیہ نہ ڈھلوا سکیں ۔ اور ایک طلائی معیار جاری کر دیا جائے ۔ یعنی دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کی طرح یہاں بھی کوئی طلائی سکہ معیار قیمت کا کام دے چنانچہ اسی کمیٹی کی سفارش کے بموجب ۱۸۹۳ء میں ایک قانونِ سکہ پاس ہوا جس نے لوگوں کو طلائی اور نقرئی سکے ڈھلوانے سے روک دیا اور آئندہ روپے ڈھلوانا صرف سرکار کے اختیار میں چھوڑ دیا ۔ ساتھ ہی اعلان بھی شائع ہوا کہ سرکاری ٹکسالوں میں ۱۶ پنس فی روپے کے حساب سے سونا داخل ہو سکے گا اور پندرہ روپے فی ساوَرن کے حساب سے سرکاری رقمیں بشکل ساوَرن و نصف ساوَرن ادا ہو سکتی ہیں ۔ بشرح مذکورہ بالا سرکار کو روپیہ دینے یا ساوَرن لینے میں کوئی تامل نہ ہوگا ۔ ان انتظاموں کا نتیجہ یہ نکلا کہ روپے کی قدر مبادلہ چاندی کی قدر سے الگ ہو گئی اور اس لیے چاندی معیار قدر و قیمت نہیں رہی اگرچہ زیادہ تر نقرئی زر ہی جاری رہا ۔ اور طلا بھی اس وقت تک زر قانونی قرار نہیں پایا ۔

فاوُلر کمیٹی

۱۸۹۸ء میں بصدارت سر ہنری فاوُلر ایک دوسری کمیٹی اسی مسئلۂ زر کی تحقیقات کے واسطے مقرر ہوئی ۔ ۱۸۹۹ء میں فاوُلر کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوئی جس میں امور ذیل کی خاص طور پر سفارش کی گئی ہے ۔

(۱) برطانوی ساوَرن بھی ہندوستان میں بطور زر قانونی مروج ہو جائے ۔

(۲) ساتھ ہی ساتھ روپیہ بھی اسی طرح زر قانونی بنا رہے ۔

(۳) روپے کی طلائی قدر ایک شلنگ چار پنس مقرر کر دی جائے اس شرح کے متعلق کمیٹی میں کچھ اختلاف رائے بھی تھا ۔

(۴) ہندوستانی ٹکسالوں میں سونے کے سکے ڈھلوانے کی عام اجازت دیجائے یعنی لوگ چاہیں تو اپنے سونے کے ساوَرن ڈھلوالیں ۔

(۵) البتہ چاندی کے سکے ڈھلوانے کی دوبارہ اجازت نہ ہونی چاہیئے۔
(۶) گرچہ سرکار سونے کے بدلے عوام کو روپیہ دیتی رہے۔ تاہم اس وقت تک تازہ روپے نہ ڈھلنے چاہئیں جب تک کہ زر کی مد میں سونا عوام کی ضرورت سے زیادہ فراہم نہ ہو جائے۔
(۷) سکہ سازی میں جس قدر منافع ہو وہ نہ داخل محاصل کیا جائے اور نہ سرکار ہند کی معمولی فاضلات کا جزو شمار ہو۔ بلکہ زر کاغذی کے محفوظ ذخیرے اور خزانہ کی معمولی فاضلات سے جداگانہ ایک خاص محفوظ ذخیرے کے طور پر جمع ہوتا رہے۔

سرکار ہند کا طرز عمل

سرکار ہند نے یہ تجاویز پسند کیں اور ان پر عمل بھی شروع کر دیا۔ ستمبر ۱۸۹۹ء میں ساورن کے زر قانونی ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ یعنی روپے کی طرح لین دین میں ساورن قبول کرنا بھی لوگوں پر قانوناً لازمی ہو گیا۔ لیکن ساتھ ہی روپیہ بھی اسی طرح زر قانونی بنا رہا۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں اس وقت کے وزیر مال نے شاہی مجلس وضع قوانین میں اعلان کر دیا کہ یہ امر قرار پا گیا کہ سونے کے سکے ڈھالنے کے واسطے شاہی ٹکسال کی ایک شاخ ہندوستان میں کھول دی جاوے۔ لیکن سب انتظام ہو ہوا کر سنہ ۱۹۰۶ء میں یہ تجویز پھر ترک کر دی گئی۔ یہاں کے موجودہ معیار قدر و قیمت کو معیار مبادلۂ طلائی کہتے ہیں۔ گویا زر طلائی کے بغیر ایک طلائی معیار قدر قائم ہے۔ حاصل کلام یہ کہ گو یہاں ساورن نہیں ڈھلتی اور عام طور پر روپیہ رائج ہے تاہم ساورن بھی زر قانونی کی حیثیت رکھتی ہے اور کم از کم تجارت خارجہ میں بھی ساورن معیاری زر کا کام دیتی ہے۔ یعنی اس کے حساب سے قدر و قیمت قرار پاتی ہے اور جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔ ساورن اور روپے کی شرح مبادلہ سرکار کی طرف سے مقرر ہے۔ یعنی فی روپیہ ایک شلنگ چار پنس۔ روزمرہ کے لین دین میں لوگ سونا استعمال نہیں کرتے۔ یعنی سکے کی شکل میں سونا زیادہ رائج نہیں ہے۔ یہاں روپے کا زیادہ رواج ہے اور وہ ایک طرح کا زر علامتی رائج ہے کہ اس کی مصنوعی یا قانونی قدر۔ اس کی قدر فلزاتی سے کہیں بڑھی رہتی ہے۔ بین الاقوامی بازار زر میں سرکار نے ساورن

کی وساطت سے روپے کو بھی سونے کے ساتھ قابل مبادلہ بنا دیا ہے۔ یعنی شرح مبادلہ فی روپیہ ایک شلنگ چار پنس معین ہے۔ یہ طریق اوّل اوّل مسٹر لنڈسے نے بنایا تھا۔ لیکن سرکار نے اس کو ایک ہی دفعہ پورے طور پر جاری نہیں کر دیا بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے بہت سے تجربوں کے بعد اس کو اختیار کیا۔

ٹکسالوں میں آزاد سکہ سازی بند کرنے کی صاف صاف غرض تو یہ تھی کہ روپے کی رسد روک کر اس کی قدر میں اضافہ کیا جائے۔ ۱۸۹۳ء میں روپے کی قدر مبادلہ ایک شلنگ ڈھائی پنس تھی۔ سرکار نے اس کی قدر بڑھانے کا بیڑا اُٹھایا۔ لیکن مایوسی کا سامنا ہوا۔ روپے کی رسد محدود ہونے سے لوگوں کے دلوں میں شبہے اور خطرے پیدا ہوئے۔ اور بہت سا روپیہ جو بطور اندوختہ پڑا ہوا تھا نکل آیا اور چلنے لگا۔ اور جو روپیہ کہ بحالت سابق شاید آرائش اور زیورات کے طور پر استعمال ہوتا وہ بھی زر میں شریک رہا۔ اس وجہ سے زر کی مقدار اور بھی بڑھ گئی جو روپیہ کہ ہندوستان سے باہر تھا وہ بھی ہندوستان کے بازاروں میں واپس آ گیا۔ پس ٹکسال بند کرنے کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ روپے کی قدر میں اُلٹی تخفیف ہو گئی۔ کچھ عرصے تک تو سرکار سنبھلی رہی لیکن آخر کار اس نے ایک شلنگ ڈیڑھ پنس کے حساب سے روپے نکالنے شروع کر دیے۔ گو کئی سال بعد تک روپیہ ڈھالنا بالکل بند رہا۔ تاہم روپے کی قدر برابر گھٹتی رہی حتیٰ کہ ۱۸۹۵ء میں کمی حد کو پہنچ گئی یعنی روپیہ صرف ساڑھے بارہ پنس کا رہ گیا۔ لیکن اس کے بعد پھر روپے کی قدر بتدریج بڑھنی شروع ہوئی یہاں تک کہ ۱۸۹۸ء میں وہ مساوات کے درجے پر پہونچ گئی یعنی شرح مبادلہ وہی ایک شلنگ چار پنس قرار پا گئی۔ اس کے بعد سے اب تک روپے کی قدر میں کوئی نمایاں فرق پیدا نہیں ہوا۔ البتہ ۱۹۰۷ء کے نازک موقع پر جب کہ ہندوستان میں قحط نمودار ہوا اور امریکہ کو اپنے زر کے انتظام میں سخت وقت پیش آئی تو روپے کی قدر میں کچھ دنوں کے واسطے بہت کمی ہو گئی تھی یعنی مرتبہ زر سے اتر گئی۔ اس آخری فقرے کی تشریح طولانی ہے۔

اس کا مفہوم اکثر اصول معاشیات کی کتابوں میں بعنوان مبادلات خارجہ مذکور ہے۔

زر کا تجربہ

زر کے اس تجربے کے متعلق طرح طرح کی رائیں پائی جاتی ہیں۔ اس کے مداح تو اس کو ایک بڑی خالص کامیابی قرار دیتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ تجربے سے یہ طریق زر بالکل پائدار اور مستحکم ثابت ہوا۔ حتیٰ کہ اس نے ۱۹۰۷ء کا سا نازک وقت گزار دیا۔ اس طریق کے ساتھ ساتھ صنعت اور تجارت میں بہت ترقی ہوئی۔ سرکار ہند کے نظام مال نے قرار پکڑا۔ اور سرکار اس قابل ہوئی کہ کچھ محصول واگذاشت کر دیا۔ اور اس طریق کی خوبی تو اسی سے ثابت ہے کہ ہندوستان کی دیکھا دیکھی بعض دوسرے ملکوں نے بھی اسی کو اختیار کر لیا۔ چنانچہ روس، جاپان، ہالینڈ اور آسٹریا ہنگری کا طریق زر بھی ہندوستان سے ملتا جلتا ہے۔ وہاں بھی طلائی زر تو کم استعمال ہوتا ہے۔ لیکن معیار مبادلہ طلائی قائم ہے۔ وہاں بھی ذخیرہ ہائے معیار طلائی قائم ہیں اور ہندوستان کی طرح ان کے یہ ذخیرے بھی لندن، پیرس وغیرہ زر کے مرکزوں میں رہتے ہیں۔ واضح ہو کہ ذخیرۂ معیار طلائی ایک ذخیرۂ طلا ہوتا ہے جو کہ طلائی اور نقرئی زر کی شرح مبادلہ معین رکھنے کی غرض سے قائم کیا جاتا ہے۔ اس کا مختصر بیان آگے درج ہے رہے وہ لوگ جو اس طریق زر کے مخالف ہیں سب سے اول تو اس میں یہ عیب نکالتے ہیں کہ اس میں گھٹ بڑھ ذرا سی بھی ممکن نہیں۔ جب تجارت کی گرم بازاری ہوتی ہے تو زیادہ زیادہ زر درکار ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ اس طریق میں خود اصلاحی کی صلاحیت نہیں۔ سرد بازاری کے زمانے میں وہی زر زائد از ضرورت ہونیکی وجہ سے قیمتیں چڑھا دیتا ہے۔ ان کی رائے یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے زر کے انتظام میں سرکار کم دخل دے۔ ان کا قول ہے کہ سنہ ۱۹۰۸ء کے نازک زمانے میں قریب تھا کہ یہ نظام زر ٹوٹ پھوٹ جائے لیکن بال بال بچ گیا اور اگر زیادہ دباؤ پڑتا تو یقیناً یہ نظام نہ رہ سکتا واگزاشت محصول کی بابت وہ کہتے ہیں کہ کچھ بھی محصول نہیں چھوٹا۔ جو رقم سرکار نے چھوڑی وہ

درحقیقت وہی مقدار ہے جو مصنوعی طریق پر روپے کی قدر بڑھنے کی وجہ سے محصول و ہنڈوں سے وصول ہو گئی - چنانچہ ایک صاحب رقم طراز ہیں کہ اس وقت جو طرز عمل ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ سرکار کو مستقل کامیابی کے واسطے انتظام کرنے کے بجائے ترکیبوں سے فائدہ اٹھانے کی خواہش زیادہ ہے -

خیر- اگر یہ مان بھی لیں کہ موجودہ طریق زر مکمل نہیں تو اب دوسری صورت کیا ہو سکتی ہے - کچھ لوگ ایسے بھی ہیں گو ان کی تعداد نہایت قلیل ہے کہ اسی آزاد سکہ سازی کے قدیم طریق کو چاہتے ہیں - لیکن اس صورت میں پھر وہی حالات پیش آدیں گے جن سے مجبور ہو کر معیار مبادلہ طلائی قائم کرنا پڑا - دوسری سبیل یہ ہے کہ دو فلزی طریق جاری ہو لیکن یہ طریق اس وقت تک چل نہیں سکتا جب تک کہ اکثر مہذب قومیں ملکر اس کو جاری نہ کریں اور اس بات کی امید کم ہے -

واضح ہو کہ دو فلزی طریق سے مراد یہ ہے کہ طلائی و نقرئی سکے دونوں ساتھ ساتھ زر قانونی اور زر معیاری کے طور پر استعمال ہوں -

تیسرا طریق یہ ہے کہ بالکلیہ معیار طلائی اختیار کر لیا جائے - اور اس تحریک کے حامی چاہتے ہیں کہ سرکار ساورن کے رواج کو سرگرمی سے ترقی دے - مال وزر کے کمیشن نے اس طریق کی تائید میں وجوہات ذیل پیش کی ہیں

(۱) روپے کے مقابل طلائی سکے برتنے اور لانے لے جانے میں زیادہ سہولت ہے

(۲) طلائی زر بہترین طریق زر کا پیش خیمہ ہے - یعنی یہ کہ ذخیرۂ طلا کی بنا پر کاغذ زر جاری ہو -

(۳) طلائی زر سے شان بھی پیدا ہوتی ہے - کیونکہ نقرئی زر پس ماندہ قوموں کی علامت سمجھا جاتا ہے -

(۴) طلا کی بڑی مقدار بطور زر استعمال ہونے لگے تو مبادلات خارجہ میں بہت استحکام پیدا ہو جاتا ہے - بعض کے نزدیک تو اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں -

(۵) روپیوں کا آئے دن ٹکسال میں ڈھلنا قابل اعتراض ہے۔ ساورن کا رواج بڑھنے سے پھر اس کی ضرورت نہ رہے گی۔

(۶) جب تک ہندوستان میں طلائی زر رائج نہ ہوگا یہاں کا طریق زر بالکل مصنوعی اور پابند انتظام رہے گا۔

(۷) ہندوستان میں زیادہ سونا کھپنا چاہیئے تاکہ سونے کی جو بڑی بڑی مقدار کانوں سے نکل رہی ہے اس کی وجہ سے قیمتوں میں اضافہ نہونے پائے گویا اس طرح دنیا گرانی سے محفوظ رہے گی۔

وجوہات مذکورۂ بالا کے معترضین جن میں بیشتر اراکین کمیشن بھی شامل ہیں حسب ذیل جواب دیتے ہیں:۔

(۱) پہلی وجہ اس حالت میں بالکل معقول ہے جبکہ بڑی بڑی رقموں سے کام لینا پڑے۔ لیکن اس صورت میں تو نوٹ طلائی زر سے بھی بہتر ہیں۔

(۲) دوسری وجہ کی تاریخ سے کوئی تائید نہیں نکلتی۔ اور یہ کیا ناممکن ہے کہ طلائی زر کا مرحلہ طے کیئے بغیر مذکورۂ بالا بہترین طریق زر جاری کر دیا جائے۔ یعنی ذخیرۂ طلا کی بنا پر کاغذ زر چلے۔

(۳) تیسری وجہ کی اصلیت یہ ہے کہ بعض لوگ زر طلائی اور معیار طلائی میں کچھ فرق نہیں سمجھتے اور اسی سبب سے ان کو یہ وجہ موجہ نظر آتی ہے۔ اندرون ملک تو چیکیں زیادہ چلتی ہیں۔ اور یہی طریق سب سے زیادہ ترقی یافتہ مانا جاتا ہے۔ کیونکہ جس چیز سے زر بنتا ہے وہ جسقدر زیادہ سستی ہوگی اس قدر قیمتی دھاتوں کے استعمال میں کفایت رہے گی۔

(۴) رہی چوتھی وجہ سو مستند معاشیئین اور ماہرین حال کی رائیں۔ اور ترقی یافتہ ممالک کے تجربے اس خیال کے مخالف ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جب زر پر کوئی نازک دقت آتا ہے تو اس وقت مبادلات خارجہ کو یہی ذخائر طلا بہت سنبھالتے ہیں۔ جو بنکوں میں جمع ہوں نہ وہ

کہ جو لوگوں کے گھروں میں ہوں۔

(۵) پانچویں وجہ کا جواب یہ ہے کہ روپیہ تو چھوٹی چھوٹی رقمیں ادا کرنے کے واسطے درکار ہوتا ہے۔ پس اگر ساورن چلے بھی تو نئے روپے ڈھالنے کی ضرورت میں کوئی قابل لحاظ کمی نہو گی البتہ یہ خطرہ ضرور ہے کہ طلائی سکے نوٹوں کے رواج کی بہت مزاحمت کریں گے اور یہ بات سراسر نامناسب ہے۔

(۶) چھٹی وجہ کا جواب یہ ہے کہ زر کے پابند انتظام رہنے میں خواہ مخواہ کوئی برائی نہیں۔ اور سرکار ہند اپنی غرض سے تو زر بڑھاتی نہیں بلکہ جب عوام کی طرف سے مانگ ہوتی ہے تو روپیہ نکالتی ہے۔

(۷) آخری وجہ کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ ہندوستان میں کس قدر سونا استعمال ہو۔ یہ امر خود ہندوستان کی ضرورت اور خواہش پر منحصر ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ہندوستان میں طلائی سکے خاص اسی مطلب سے جاری کئے جائیں کہ دوسرے سونا برتنے والے ملکوں کو فائدہ پہنچے۔ یعنی اس ترکیب سے سونے کی اس قدر کثرت نہ ہونے پاوے کہ قیمتیں بڑھ جاویں۔

اوپر کے بحث مباحثے سے کمیشن نے یہ نتیجہ نکالا کہ طلائی سکے چلانے میں ہیچ نہیں ہے۔ اور ان کا رواج ہندوستان کے حق میں مفید نہیں۔ تاہم اس رائے سے طلائی معیار کا مسئلہ طے نہیں ہوا صرف طلائی زر ناموزوں قرار پایا۔

ہندوستان میں طلائی ٹکسال

طلائی زر کے موئید چاہتے ہیں کہ ہندوستان ہی میں طلائی سکے ڈھالنے کے واسطے ایک ٹکسال کھلے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۱۲ء میں سر تھیکرسے نے شاہی مجلس وضع قوانین میں ایک تحریک پیش کی کہ ہندوستان کی ٹکسالوں میں سونے کی آزاد سکہ سازی شروع ہونی چاہیئے یعنی یہ کہ لوگ چاہیں تو اپنا سونا لاکر سکے ڈھلوالیں۔ اور ہندوستان کے واسطے ایک جداگانہ قسم کے طلائی سکے ڈھلیں۔ اس وقت کے وزیر مال مسٹر فلیٹ ووڈ ولسن نے اس خواہش

سے تو ہمدردی ظاہر کی لیکن اس باب میں سرکار ہند کو کسی طرز عمل کا پابند
کرنے سے انکار کر دیا۔ مسٹر ویب اور ان کے ہم خیال اور موئید بھی اس مقصد
کو حاصل کرنے کے واسطے بہت ایجل مچا رہے ہیں چنانچہ مسٹر ویب نے اپنی ایک
کتاب ترقی ہند میں زر کو بطریق موجودہ سرکاری انتظام کا پابند رکھنے کی
خرابیاں بڑے شد و مد سے بیان کی ہیں۔ چیمبرلین کمیشن نے اس مسئلے سے
پوری بحث کرنے کے بعد یہ رائے تحریر کی ہے کہ فی نفسہٖ اس تجویز میں کوئی
ایسی خوبی نہیں کہ جس کی بنا پر ہم ہندوستان میں سونے کی ٹکسال کھولنے کی
سفارش کر سکیں۔ لیکن اگر ہندوستانیوں کی دلی خوشی اور تمنا یہی ہے کہ یہاں
سونے کی ٹکسال کھلے اور سرکار بھی اس کے اخراجات برداشت کرنے کو
آمادہ ہو تو ہندوستانی یا شاہی اعتبار سے اس تجویز میں اصولاً کوئی پہلو
قابل اعتراض نہیں ہے۔ بشرطیکہ طلائی سکے جو یہاں ڈھلیں ساورن
یا نصف ساورن ہی ہوں۔ بہر حال یہ تجویز ایسی ہے کہ اس میں ہندوستانیوں
کے خیال اور خوشی کا لحاظ سب باتوں پر مقدم ہے۔ تاہم اگر سرکار
سونے کی ٹکسال کھولنے کے خلاف فیصلہ کرے۔ تو ہماری سفارش یہ ہے
کہ سرکار اپنی اس آمادگی کا اعلان کر دے کہ مناسب شرائط پر بمبئی ٹکسال
میں صاف کیا ہوا سونا بلا تامل لیا جاتا رہے گا۔ کمیشن کی رائے کا خلاصہ
تو معلوم ہو گیا لیکن اصل بات یہ ہے کہ اگر سونے کی ٹکسال کھل جائے تو
جو لوگ ہندوستان کے واسطے معیار طلائی کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں۔ وہ خوش
اور مطمئن ہو جائیں گے۔ اس سے زیادہ کسی کو کچھ مطلوب نہیں یہاں سونے
کی ٹکسال کھلنے سے ہندوستان کا طریق زر بھی دوسرے ترقی یافتہ ممالک
سے مماثل ہو جاوے گا۔ اور آئندہ جو جو حالات پیش آویں گے۔
انھیں کے مطابق یہ طریق بھی شکل اختیار کرے گا۔ سردست کوئی انقلاب
مطلوب نہیں۔

معیار مبادلہ طلائی برقرار رکھنے اور روپے کی قدر مبادلہ میں کوئی بڑی
تبدیلی نہ ہونے دینے کے لئے دو باتیں لابد ہیں۔ اول تو یہ کہ جو لوگ باہر سے

باب ۱۱

سونا منگائیں ان کے سونے کے بدلے روپے مل سکیں۔ دوسرے جب لوگوں کو باہر سونا بھیجنے کی ضرورت ہو تو چاندی کے بدلے سونا مل جا دے۔ ان دونوں ضرورتوں کو پورا کرنے کے واسطے سرکار نے یہ انتظام اپنے ذمے لیا ہے کہ ایک شلنگ چار پنس فی روپے کے حساب سے روپیہ لندن اور ہندوستان میں خرید و فروخت کرتی ہے۔ البتہ حسب صورت حال مصارف ارسال اس شرح میں گھٹا بڑھا دیتی ہے اس اجمال کی تفصیل بھی مبادلات خارجہ کی بحث سے متعلق ہے۔ یہاں تشریح کی گنجائش نہیں۔ بہر حال سرکار جو اس طرح روپے کا کاروبار کرتی ہے تو اس کے سلسلے میں ایک محفوظ ذخیرہ لندن میں رہتا ہے اور اس کا ایک حصہ ہندوستان میں۔

ذخیرۂ معیار طلائی۔

فاؤلر کمیٹی کی سفارش کے بموجب یہ قرار پایا کہ یکم اپریل ۱۹۰۰ء سے روپیہ ڈھالنے کا جو خالص منافع ہو وہ شامل محاصل نہ کیا جائے۔ بلکہ اس کا ایک خاص محفوظ ذخیرہ بنے ۱۹۰۶ء تک تو سرکار ہند تقریباً کل منافع انگلستان بھیجکر برطانوی سرکاری تمسکات خرید لیتی تھی اور جو سود وصول ہوتا تھا اس کو بھی فنڈ میں شامل کر کے اسی طرح تمسکات میں لگا دیتی تھی۔ لیکن اسی سال یہ قرار پایا کہ اس ذخیرے کا ایک حصہ ہندوستان میں بھی بہ شکل نقرہ موجود رہنا چاہیئے۔ ۱۹۰۷-۹ء میں ایک نئے فیصلے کی رو سے سکہ سازی کا نصف منافع ریلوں کی تیاری میں صرف ہونے لگا چنانچہ تقریباً گیارہ لاکھ پونڈ اس طرح کام بھی آئے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد یہ فیصلہ مسترد ہوگیا۔

۳۱ رمارچ ۱۹۱۳ء کو ذخیرۂ معیار طلائی کا حساب حسب ذیل تھا۔

| | | |
|---|---|---|
| سرکاری تمسکات (نرخ بازار) | تقریباً | ۲۴ کرور روپے |
| قلیل المدت قرض | تقریباً | ۱½ کرور روپے |
| طلا بامانت بنک انگلستان میں | تقریباً | ۲½ کرور روپے |
| نقرہ ہندوستان کی شاخ میں | تقریباً | ۶ کرور روپے |
| میزان کل | تقریباً | ۳۴ کرور روپے |

۳۰ رمارچ ۱۹۱۳ء اور ۳۱ راکتوبر ۱۹۱۴ء کے درمیان ذخیرے کی مقدار

۳۸ ½ کرور سے بھی بڑھ گئی اور اگر سکہ سازی کا کل منافع جمع ہوتا رہے تو دس سال کے اندر اس کی مقدار تخمیناً چار کرور پونڈ یا ساٹھ کرور روپے تک پہنچ جاوے گی۔

**ذخیرۂ معیار طلائی کا مقام اور ترکیب**

ذخیرۂ معیار طلائی کے مقام اور ترکیب پر بھی بہت کچھ نکتہ چینی ہوئی ہے۔ ایک تجویز تو یہ پیش ہوئی کہ کل کا کل ذخیرہ لندن کے بجائے ہندوستان میں جمع رہنا چاہیئے۔ تاکہ اگر انگلستان میں کبھی زر پر نازک وقت آئے تو ہندوستان کے مالی مفاد خطرے میں نہ پڑجائیں۔ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اس ذخیرے سے لندن ہی میں کام پڑتا ہے۔ پس اس کو یہاں رکھنے سے وقتاً فوقتاً لندن بھیجنے کے مصارف عائد ہونگے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ذخیرے کا ایک بڑا حصہ سرکاری تمسکات کی شکل میں رہتا ہے۔ اور ضرورت کے وقت تمسکات فروخت کرنے میں اکثر بہت نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کے یہ بات بھی ہے کہ اس طرح شغل اصل سے اس قدر سود ملتا رہتا ہے کہ اگر تمسکات کی قیمت کسی نازک وقت گھٹے بھی تو وہ اسکی پوری تلافی کردے گا۔ تیسرا اعتراض یہ ہے کہ اس ذخیرے کی بڑی بڑی رقمیں لندن میں لوگوں کو قرض دیدی جاتی ہیں۔ اگر تھوڑے عرصے کے واسطے ذخیرے کا کوئی حصہ معتبر لوگوں کو قرض دیا جاسکے تو ہندوستان میں دینا چاہیئے جہاں اصل کا اس قدر کال ہے۔ یہ جو فریاد ہے کہ ہندوستان کا روپیہ ہندوستان میں کام آئے ہر طرح پر معقول ہے۔ اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کرسکتا۔ ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ذخیرے کا ایک حصہ بہ شکل نقرہ رکھنے کی کوئی معقول وجہ نہیں۔ کیونکہ ذخیرے کا اصلی اور متفرد منشا یہ ہے کہ روپے کی طلائی قدر معین رہے۔ یعنی ایک شلنگ چار پنس۔

چیمبرلین کمیشن نے تجویز کی کہ اس ذخیرے کا طلائی حصہ فوراً ایک کرور پونڈ یعنی پندرہ کرور روپے تک بڑھا دینا چاہیئے۔ اور یہ کہ تمسکات بیشتر اس قسم کے ہوں کہ ان کے ادا کرنے کا زمانہ قریب ہو۔ ۳۱ اکتوبر سنہ ۱۹۱۴ء تک اس ذخیرے کی ترکیب میں بہت کچھ تغیر و تبدل ہوا۔ اس تاریخ

کو لندن کی شاخ میں ۳۲ لاکھ پونڈ سونا جمع تھا ہندوستان کی شاخ میں ۶۲ لاکھ ۲۳ ہزار پونڈ اور تمسکات کی میزان ایک کرور ۳۴ لاکھ ۱۷ ہزار پونڈ تھی۔

لابد مقدار ذخیرہ

ذخیرے کی ایسی مقدار صحیح صحیح بتانی دشوار ہے کہ اس کے جمع ہوئے بعد پھر کیسا ہی نازک وقت آئے روپے کی قدر مبادلہ کو ٹھیس نہ لگے۔ کمیشن نے بھی صاف بتا دیا ہے کہ ذخیرہ نہ صرف یہ کام دیتا ہے کہ جب مخالف شرح مبادلہ کی وجہ سے کونسل بل اور رقعے بہ سہولت فروخت نہ ہوں تو مطالبات وطن اس سے ادا ہو جاتے ہیں۔ بلکہ انگلستان کے ذمے بہ سلسلۂ تجارت جو کچھ فاضلات نکلتی ہیں۔ وہ بھی اس حد تک کہ مبادلہ مرتبہ زر سے نیچے نہ گرنے پائے اسی سے بیباق ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس ذخیرے کی اسلیئے کبھی ضرورت نہیں پڑتی کہ ہندوستان میں جو روپیہ چل رہا ہے اس کے ساورن بنائے جاویں۔ طلا عالمگیر زر ہے اور دوسرے بڑے بڑے ملکوں کی طرح ہندوستان کو اندرون ملک کے واسطے طلائی زر اتنا درکار نہیں۔ جتنا کہ دوسرے ملکوں کے فاضلات ادا کرنے کے واسطے بحالیکہ تجارت نے حساب بے باق ہو جب صورت حال یہ ہے تو پھر جس قدر کہ روپیہ چل رہا ہے۔ اس کی مقدار کا معیار طلائی کے ذخیرے سے ایک دور کا تعلق رہ جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ روپے ڈھالنے کے منافع سے یہ کل ذخیرہ جمع ہوا ہے۔ لیکن اس کا مقصد یہ نہیں کہ جس قدر روپیہ چل رہا ہے۔ وہ سب بوقت مطالبہ ساورن میں تبدیل ہو سکے۔ بلکہ صرف یہ کہ جس قدر روپیہ باہر بھیجنا مقصود ہو اس کے مبادلے میں بہ شرح معین بلا وقت سونا مل جائے۔ یا یوں کہیئے کہ روپے کی وہ مقدار سونے میں تبدیل ہو سکے جو کہ لوگ اپنے طلائی قرضے ادا کرنے کے واسطے تبدیل کرنا چاہیں۔ جب ذخیرے کا مقصد یہ ٹھیرا تو اس کی مقدار کو اس سے کچھ سروکار نہیں کہ ہندوستان میں کس قدر روپیہ چل رہا ہے بلکہ اس کا تعلق ہندوستان کی تجارت خارجہ سے ہے اور اس کمی کی مقدار سے جو کچھ خرابی موسم یا کسی اور وجہ سے ملک کی استطاعت

پس اس لحاظ سے پیدا ہونے کا معقول اندیشہ ہو کہ وہ دوسرے ملکوں کی فاضلات جو اس کے ذمے ہوں ادا کرنے سے قاصر ہو جائے۔ چونکہ اس معاملے میں کوئی تعین ممکن نہیں۔ پس جو کچھ کہہ سکتے ہیں وہ یہ کہ مناسب ہوگا اگر سرکار ابھی کچھ عرصے تک سکہ سازی کے منافع کا اس طرح ذخیرہ جمع کرتی رہے۔

اصلاح سکہ

سنہ ۱۸۹۶ء میں سکہ سازی میں اصلاح ہوئی۔ سنہ ۱۸۳۵ء کا روپیہ خزانے سے نکلنا بند ہو گیا۔ اور سنہ ۰۲-۱۹۰۱ء میں سنہ ۱۸۴۵ء کے روپے کی بابت بھی یہی حکم صادر ہوا۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں کانسی کے پیسے زر علامتی کے طور پر جاری ہوئے تاکہ روزمرہ کے سودے سلف میں کام آئیں اور اب وہ بتدریج قدیم تانبے کے پیسوں کے جانشین بن رہے ہیں۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں نکل کی اکنی نکلی اور اب نکل کی دوانی بھی چل رہی ہے۔

کاغذی زر

سنہ ۱۸۳۹ء سنہ ۱۸۴۰ء اور سنہ ۱۸۴۳ء کے قوانین کی رو سے بنگال۔ بمبئی اور مدراس کی پریزیڈنسی بنک عندالطلب نوٹ جاری کرنے کے مجاز تھے یعنی ایسے نوٹ کہ وقت طلب فوراً ان کے بدلے روپیہ دیدیا جائے۔ لیکن نوٹوں کا رواج انھی پریزیڈنسی شہروں تک محدود تھا۔ سنہ ۱۸۶۱ء میں ایک نیا قانون پاس ہوا جس نے پہلے قانون کو منسوخ کر کے ایک سرکاری محکمہ قائم کیا جس کی طرف سے سرکاری نوٹ بطور کاغذ زر جاری ہوئے۔ اس کے بعد سے پھر بنک نوٹ نظر نہیں آئے۔ اور اب نوٹوں کا اجرا بہ تمام وکمال سرکار کے ہاتھ میں ہے۔ سنہ ۱۹۱۰ء قانون زر کاغذ زر کے مطابق ان ان رقموں کے نوٹ نکلے ۵-۱۰-۵۰-۱۰۰-۵۰۰-۱۰۰۰ اور ۱۰۰۰۰ روپے کاغذی زر کے ہر دفتر سے روپے یا سونے کے بعوض نوٹ جس قدر مطلوب ہوں مل سکتے ہیں۔ اجراء نوٹ کے آٹھ حلقے ہیں جن کے صدر مقام یہ ہیں۔ کلکتہ۔ کانپور۔ لاہور بمبئی۔ کراچی۔ مدراس۔ کالی کٹ اور رنگون۔ سنہ ۱۹۱۰ء تک تو نوٹ صرف اپنے اپنے حلقوں میں زر قانونی شمار ہوتے تھے۔ یوں تو سرکار حلقہ اجراء کے باہر کسی نوٹ کا روپیہ دینے کی ذمہ دار نہ تھی۔ لیکن معمولاً ہر سرکاری خزانے میں نوٹ بھن جاتے تھے۔ بشرطیکہ ان کی رقم بہت زیادہ نہ ہو۔ اس کے

علاوہ پریزیڈنسی بنکوں سے بھی ان کا روپیہ مل جاتا تھا۔ اس قید لگانے کی اصل وجہ یہ تھی کہ اگر نوٹ ہر کسی حلقے میں بھن سکتے تو ملک کے حصے حصے میں روپیہ لانے لیجانے کا خرچ سرکار کے ذمے رہتا۔ اور ہر مرکز میں روپے کا بڑا ذخیرہ رکھنا پڑتا تاکہ لوگوں کو نوٹ کے بدلے روپیہ دینے میں معذوری پیش نہ آسکے۔

نوٹ کو عام کرنے کا طریق

۱۹۰۹ء میں پانچ روپے والا نوٹ جو کہ پہلے سے کل ہندوستان میں زر قانونی بنا ہوا تھا برما میں بھی زر قانونی بن گیا یہ پانچ روپے کا عام نوٹ جو کہ بھنانے کے معاملے میں حلقۂ اجرا کی قید سے آزاد تھا۔ اور ہر جگہ زر قانونی کی طرح چلتا تھا روز بروز ہر دلعزیز ہوتا گیا۔ سرکار نے عام پسندیدگی کا رجحان دیکھکر ۱۰۔ اور ۵۰ روپے کے نوٹ بھی عام قرار دیدیے۔ یعنی وہ بھی پانچ روپے والے نوٹ کے مانند حلقوں کی قید سے آزاد ہو گئے۔ زر قانونی کی طرح ہر جگہ چلنے لگے۔ ان کا روپیہ ہر جگہ مل سکتا ہے۔ ۱۹۱۱ء میں اسی طرح ۱۰۰ روپے کا نوٹ بھی عام قرار دے دیا گیا۔ بلکہ چیمبرلین کمیشن نے ۵۰۰ روپے کے نوٹ کو بھی عام کر دینے کی سفارش کی ہے۔ مگر ابھی اس پر عمل کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ قانون نے یہ لازم قرار دیدیا ہے کہ جس رقم کے نوٹ جاری ہوں۔ اسی قدر رقم ذخیرۂ کاغذ زر کے نام سے جمع رہے۔ اس میں زیادہ سے زیادہ ۱۴ کرور روپے کے سرکار ہند و سرکار برطانیہ کے تمسکات بطور جزو ذخیرہ شامل رہ سکتے ہیں۔ بشرطیکہ سرکار برطانیہ کے تمسکات ۴ کرور سے زیادہ کے نہوں۔ جو رقم باقی رہے اس کا سونے یا روپے کی شکل میں موجود رہنا ضرور ہے ۳۱ مارچ ۱۹۱۳ء کو ۶۸ کرور ۹۷ لاکھ روپے کے نوٹ موجود تھے جن میں سے ۵۶ کرور ۲۹ لاکھ کے نوٹ چل رہے تھے۔

اس تاریخ کو ذخیرۂ کاغذ زر کی ترکیب حسب ذیل تھی۔

| | |
|---|---|
| لندن میں سونا | ۹ کرور ۱۵ لاکھ |
| ہندوستان میں سونا | ۲۹ کرور ۳۷ لاکھ |
| ہندوستان میں چاندی | ۱۶ کرور ۴۵ لاکھ۔ |

| | |
|---|---|
| سرکار ہند کے تمسکات | ۱۰ کرور |
| سرکار برطانیہ کے تمسکات | ۴ کرور |
| میزان | ۶۸ کروڑ، ۹۰ لاکھ |

مجوزہ تبدیلیاں

۱۸۴۴ء کے قانون منشور بنک کے بموجب جس طرح انگلستان بنک نوٹ جاری کرتا ہے۔ اسی کے نمونے پر ہندوستانی نوٹ کا طریق بھی قرار پایا اور بہ شکل نقرہ وطلا ذخیرہ نہ رکھنے سے نوٹ جاری کرنے میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ انھی کی روک تھام کی غرض سے یہ سب قواعد و ضوابط بنے۔ لیکن تجارت بڑھنے کی وجہ سے اب اور بھی زیادہ تغیر پذیر طریق زر کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے چنانچہ چیمبرلین کمیشن کی تجویز ہے کہ سرکاری خزانوں میں بمد ذخیرہ جس قدر نوٹ جمع ہوں وہ کل اور جس قدر نوٹ جاری ہوں ان کا ایک ثلث بس زیادہ سے زیادہ اتنی رقم ذخیرے کا امانتی حصہ ہو سکتی ہے۔ یعنی اس کے تمسکات وغیرہ خریدے جا سکتے ہیں۔ یہ بھی تجویز کیا ہے کہ سرکار چاہے تو ذخیرے میں سے تھوڑے دنوں کے لئے قرض دے دیا کرے یا عارضی طور پر اس کو اور طرح مشغول رکھے بشرطیکہ ذخیرے کا نقد حصہ جاری شدہ نوٹوں کے دو ثلث سے کم نہ ہونے پاوے۔ کاغذ زر کے ذخیرے کا ایک حصہ جو لندن میں رہتا ہے تو اس پر بہت مخالفت اور نکتہ چینی ہوتی ہے۔ جب ذخیرے کا مقصد یہ ہے کہ جو نوٹ ہندوستان میں جاری ہیں بوقت مطالبہ ان کا روپیہ وہیں دیدیا جائے تو پھر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ وہ کل کا کل ہندوستان میں کیوں نہ رہے۔ یہ جو کہتے ہیں کہ اس ذخیرے سے شرح مبادلہ قائم رکھنے میں دوسری حصار کا کام لینا چاہیئے۔ کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔

بارہا یہ بھی تجویز ہوئی کہ ذخیرہ معیار طلائی اور ذخیرۂ کاغذ زر کو ملا دیا جائے۔ لیکن جب دونوں ذخیروں کی غرض و غایت مختلف ہیں تو قرین عقل یہی ہے کہ وہ جدا جدا رہیں۔

کونسل بل

یہاں مختصر طور پر یہ بیان کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ ہندوستان سے ولایت کو کیوں کر رقم جاتی ہے وزیر ہند کو اپنے دفتر کے اخراجات اور دوسرے

مصارف کے واسطے لندن میں کچھ رقم کی ضرورت پڑتی ہے اور بہت سے انگلستان کے تاجر ہندوستان سے مال منگانے کے واسطے وہاں کو رقم بھیجنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ کونسل بل یعنی وزیر ہند کی ہنڈی کے ذریعے سے یہ لین دین بآسانی انجام پا جاتا ہے۔ پھر یہ ضرورت نہیں رہتی کہ وہاں سے یہاں کو اور یہاں سے وہاں کو سونا آئے جائے۔ پس مصارف نقل وحمل اور فیس بیمہ سب کی کفایت ہو جاتی ہے۔ ہر چہار شنبے کو وزیر ہند انگلستان بنک کی معرفت سرکار ہند کے نام کلکتہ، بمبئی، اور مدراس کے پیٹے سے فروخت کرنے کے واسطے بل یعنی ہنڈیاں نکالتا ہے۔ اور جو لوگ ہندوستان کو رقم بھیجنا چاہیں ان سے تخمینے طلب ہوتے ہیں۔ یہ بھی اعلان کر دیا جاتا ہے کہ اس مرتبہ زیادہ سے زیادہ اتنی رقم کے بل فروخت کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن وزیر ہند پابند نہیں ہوتا کہ جس قدر رقم کا اعلان کرے اتنے ہی بل فروخت کرے۔ معمول یہ ہے کہ اگر بل کی قیمت ایک شلنگ ۳ $\frac{۲۹}{۳۲}$ پنس فی روپے سے گر جاے تو پھر وہ بل فروخت نہیں کرتا۔ اگر بلوں کی مانگ زیادہ ہوئی تو ان کی قیمت چڑھ گئی۔ اور کم ہوئی تو اتر گئی گویا ایک شلنگ چار پنس جو معین شرح مبادلہ ہے۔ اس کے قریب ادھر ادھر رہتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ قیمت مقام مرتبۂ زر تک چڑھتی ہے یعنی اس حد تک کہ سونا بھیجنے کے مقابل کونسل بل خریدنے میں کفایت ہو۔ یہ بل تاجر لوگ خرید کر ہندوستان بھیج دیتے ہیں اور سرکار ہند ان کا روپیہ ادا کر دیتی ہے۔ اگر تاجر چاہیں کہ بلوں کے پہنچنے میں جو سولہ سترہ روز کا عرصہ لگتا ہے۔ اتنی بھی دیر نہ لگے تو انتقالات برقی خرید سکتے ہیں۔ البتہ ان کی قیمت بل کے مقابل کسی قدر زیادہ ہوتی ہے روز مقررہ کے علاوہ ہفتہ کے اور دنوں میں بھی درمیانی یا خاص بل اور انتقالات برقی خرید سکتے ہیں۔ لیکن پیوستہ گذشتہ چہار شنبے کو جو نرخ رہا ہو۔ اس سے ان کی قیمت کم از کم $\frac{۱}{۳۲}$ پنس زیادہ دینی پڑتی ہے۔

ہندوستان کے نام بل یا ہنڈی فروخت کر کے مطالبات انگلستان

باب ۱۱
بلوں کے طریق کی ابتدا اور موجودہ ترقی

کے واسطے ہندوستان سے رقم منگانا - یہ طریق وزیر ہند نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے لیا ہے۔ اور چونکہ ہندوستان کی برآمد یہاں کی درآمد سے بہت بڑھی رہتی ہے۔ اس لئے یہ طریق چل سکا اور فائدہ مند بھی بن گیا۔ ۱۸۹۳ء سے جو یہاں آزاد سکہ سازی بند ہوئی۔ تو اس طریق کو مزید اہمیت حاصل ہوگئی۔ ہندوستان میں مال وزر کا انتظام جس ترکیب سے چل رہا ہے اس کی مرکزی خصوصیت یہی طریق ہے جو اوپر بیان ہوا۔ چنانچہ شروع میں ایسا ہوا کہ کونسل بلوں کی فروخت روک کر روپے کی قدر مبادلہ ایک شلنگ ۴ پنس تک بڑھادی گئی۔ اس کے بعد سے تو اس طریق کا کاروبار کئی طرف پھیل گیا۔ اور اس کے ذریعے سے سرکار ہند کے ذخائر مال کے قیام اور صرف میں تبدیلیاں عمل میں آنے لگیں۔ اس طریق میں جو یوں کاروباری وسعت پیدا ہوئی۔ ہندوستان کے حق میں کس حد تک مفید رہی یا مضر۔ یہ بحث آئندہ باب میں پیش ہوگی۔ یہاں صرف اس قدر بتانا کافی ہے کہ ۱۹۱۳-۱۴ء میں وزیر ہند نے ۴۵ کروڑ سے زیادہ کے بل فروخت کئے۔ گرچہ اس کو اپنے اخراجات کے واسطے ۲۱ کروڑ سے زیادہ روپیہ درکار نہ تھا۔ واضح ہو کہ مذکورۂ بالا بحث بوجہ اختصار بہت دقیق معلوم ہوتی ہے۔ مبادلات خارجہ کے اصول ذہن نشیں ہونے کے بعد اس کا سمجھنا آسان ہوگا۔

اعتبار

کاروبار میں اعتبار بغیر گزر نہیں۔ قصبوں میں بالعموم ساہوکار اور صراف بنکوں کی طرح لین دین کا کام کرتے ہیں۔ ہندوستان کی تجارت داخلہ میں بیشتر انھی کا روپیہ لگتا ہے۔ لیکن یہ لوگ شاذونادر یورپ کے رقعے اور تمسک خریدتے ہیں۔ اور دوسرے ملکوں کی طلائی ہنڈی کو تو ہاتھ نہیں لگاتے۔ سرکاری تمسکات اور اسی قسم کی دوسری ضمانتوں پر وہ روپیہ قرض دیتے تو ہیں۔ لیکن ان کا کاروبار زیادہ تر یہ ہے کہ اپنے ہاں کے تاجروں کی ہنڈیاں خریدیں یا کاشتکاروں کو روپیہ قرض دیں۔ دیہات میں تو یہی چھوٹے ساہوکار مہاجن کاشتکاروں اور آس پاس کے لوگوں کو قرض دیتے ہیں۔ ان لوگوں کو اپنی اپنی اسامیوں کا پورا حال معلوم رہتا ہے۔ اور

اس لحاظ سے بڑے بنکوں کے مقابل ان کو بہت سہولت اور فوقیت حاصل ہے۔ قرض خواہ یا تو رقعے لکھ دیتے ہیں یا زیور گرو رکھ دیتے ہیں یا بعض اوقات املاک و جائداد رہن کر دیتے ہیں۔ ان ساہوکاروں اور صرافوں کا کاروبار کچھ کم نہیں سمجھنا چاہیئے بہت کچھ پھیلا ہوا ہے۔

پریزیڈنسی بنک

کچھ لین دین کی دکانیں اور بنک یورپ کے طرز کے بھی موجود ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم تینوں پریزیڈنسی بنک مانے جاتے ہیں۔ بنگال بنک تو سنہ ۱۸۰۶ء میں قائم ہوا۔ بمبئی بنک سنہ ۱۸۴۰ء میں اور مدراس بنک سنہ ۱۸۴۳ء میں دراصل یہ نیم سرکاری بنک تھے۔ ان کو سنہ ۱۸۶۱ء تک نوٹ چلانے کا بھی خاص حق حاصل رہا۔ اب سرکار کو ان بنکوں سے راست راست کوئی تعلق نہیں۔

ان پریزیڈنسی بنکوں کا دستور اور انتظام متعدد قوانین کے تابع ہے جن میں سے سنہ ۱۸۶۲ء سنہ ۱۸۷۶ء اور سنہ ۱۹۰۷ء کے قانون خاص سمجھے جاتے ہیں۔ جس جس قسم کا کاروبار یہ بنک کر سکتے ہیں۔ وہ سب قوانین میں بالتفصیل مذکور ہے۔ قوانین کی رو سے ان بنکوں پر جو قیود و شرائط عائد ہوتی ہیں ان کا نتیجہ صرف یہی نہیں کہ وہ قرض دہی کا کام زیادہ نہیں کر سکتے۔ بلکہ وہ مبادلات خارجہ کے کاروبار میں بھی شریک نہیں ہو سکتے۔ مثلاً کونسل بل نہیں خرید سکتے۔ تیسرے یہ کہ وہ اپنی اصل ہندوستان سے باہر کہیں نہیں لگا سکتے ہیں۔

سرکار ہند نے ان بنکوں سے جو معاہدہ کر لیا ہے اس کی بموجب یہ سرکار کے ساہو بنے ہوئے ہیں۔ سرکار کے حساب میں روپیہ لیتے دیتے ہیں۔ اور سرکاری قرضے کا انتظام بھی انھی کے سپرد ہے اس کام کے معاوضے میں ایک تو ان کو ہر سال مقررہ رقم ملتی ہے۔ دوسرے وہ جس قدر سرکاری قرضے کا انتظام کرتے ہیں۔ اس پر کمیشن پاتے ہیں۔ سرکار نے ہر حال میں تھوڑی تھوڑی مقررہ رقم ہر بنک میں امانتاً جمع رکھنے کا ذمہ لے لیا ہے اور اگر رقم میں کچھ کمی رہے تو اس کمی کا سود ادا کر دیا جاتا ہے۔ سنہ ۱۸۷۶ء تک

توکل سرکاری فاضلات اپنے بنکوں میں جمع رہتی تھیں۔ لیکن اس کے بعد خود سرکاری خزانہائے ذخیرہ قائم ہو گئے۔ تب سے ان بنکوں میں سرکار کی طرف سے وہی تھوڑی تھوڑی مقررہ رقمیں جمع رہنے لگیں۔

۳۱/ دسمبر ۱۹۱۳ء کو ان پریزیڈنسی بنکوں کے کاروبار کی تفصیل حسب ذیل دریافت ہوئی۔

| | بنگال بنک | مدراس بنک | بمبئی بنک |
|---|---|---|---|
| اداشدہ اصل | ۱۳۳۳۳۳۳ | ۵۰۰۰۰۰ | ۶۶۶۶۶۷ پونڈ |
| محفوظ ذخیرہ | ۱۲۷۳۳۳۳ | ۴۸۶۶۶۷ | ۷۰۶۶۶۷ |
| سرکاری امانت | ۲۰۰۹۸۳۰ | ۵۷۷۱۰۴ | ۱۳۳۷۴۴۸ |
| دیگر امانت | ۱۲۱۶۶۳۵۶ | ۵۳۷۳۱۰۷ | ۶۷۷۱۱۲۹ |

اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان بنکوں میں تقریباً ۶ کرور تو سرکاری روپیہ جمع ہے لیکن ان کے فنڈ کا بڑا حصہ لوگوں کی امانتیں ہیں۔ جنکی تعداد چھتیس کرور پچاس لاکھ روپے کے قریب پہنچتی ہے تینوں کے محفوظ ذخیرے مجموعی امانتوں کے بارھویں حصے کے قریب ہیں۔ یہی امانتیں جو ۱۹۱۳ء میں ساڑھے چھتیس کرور روپیہ نظر آتی ہیں۔ ۱۸۷۰ء میں انکی مقدار صرف چھ کرور چالیس لاکھ روپیہ تھی۔

ان پریزیڈنسی بنکوں کی شاخیں ملک کے مختلف حصوں میں کھلی ہوئی ہیں جو صدر دفاتر کی ماتحتی اور نگرانی میں کاروبار چلاتی ہیں۔ اور ان کے فنڈ بھی صدر دفاتر کے فنڈوں کا جزو شمار ہوتے ہیں۔

**مبادلہ بنک**

پریزیڈنسی بنکوں کے بعد بلحاظ اہمیت مبادلے کے بنکوں کا نمبر ہے۔ جن کا زیادہ تر تجارت خارجہ کے بڑے بڑے کاروبار سے تعلق رہتا ہے اور بالخصوص تجارت برآمد میں وہی روپیہ لگاتے ہیں۔ ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں ہنڈی خرید و فروخت کرتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے بعض بعض کے دفاتر دنیا کے مختلف حصوں میں قائم ہیں۔ ان بنکوں کے کل حصہ دار تقریباً یورپ کے لوگ ہیں۔ البتہ ہندوستانی لوگ ان میں اپنا

روپیہ امانت رکھتے ہیں جس پر ان کو اونی شرح سے سود ملتا ہے - ان میں خاص خاص بنک یہ ہیں :- چارٹرڈ بنک - نیشنل بنک آف انڈیا یا مرکنٹائل بنک - دہلی اینڈ لنڈن بنک - اور ایسٹرن بنک - ایشیا کے بعض دوسرے بڑے بنک بھی ہندوستان میں کاروبار کرتے ہیں مثلاً ہانگ کانگ و شنگھائی کارپوریشن یا کوہاما اسپیشی بنک - رشن چائینز بنک - انٹرنیشنل بنکنگ کارپوریشن - ڈیوش ایشیاٹک بنک وغیرہ -

ہندوستا... مشترک ... والے بنک...

جو مشترک سرمایہ والے ہندوستانی بنک ہیں وہ نسبتاً تھوڑے تھوڑے اصل سے کاروبار کرتے ہیں بعض بنکوں میں پوری نگرانی رہتی ہے لیکن اکثر بنکوں کا انتظام خود ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہے - ۱۹۰۶ء اور ۱۹۱۳ء کے درمیان ایسے بنکوں کی تعداد بہت بڑھ گئی - اور ان کا کاروبار بھی بہت پھیلا - آجکل ان کا کام زیادہ تر تجارت داخلہ میں روپیہ لگانا ہے - لیکن امید ہے کہ وہ مبادلات خارجہ میں بھی قدم بڑھائیں گے - اور اس طرح پر بیرونی اصل سے فائدہ اُٹھانے لگیں گے - ۳۱ مارچ ۱۹۱۳ء تک جس قدر بنک قانون بنک ہندوستان کے بموجب رجسٹری ہو چکے تھے ان کی تعداد کل ۵۱۳ تھی لیکن ان میں سے بہت تھوڑے ایسے تھے جو صحیح معنوں میں بنک کہلا سکیں - اور ابھی بہت سے بنکوں کی ضرورت باقی ہے - موجودہ بنکوں کا اصل یکجا فراہم رہنا بھی بہت ضروری ہے -

بنکوں کی ناکامیابی...

بدقسمتی سے حال میں جو کچھ بنک ٹوٹے تو اس سے ہندوستانی بنکوں کے کاروبار میں بہت رکاوٹ پیدا ہو گئی - وجہ یہ ہے کہ لوگ ہندوستانی بنکوں سے بدگمان ہو گئے - پنجاب کے پیپل بنک کا ٹوٹنا غضب ہوا کہ ملک میں جا بجا اس کی ۷۲ تو شاخیں قائم تھیں اور لوگوں کا سوا کروڑ روپیہ بمد امانت اس میں جمع تھا - اس کے بعد کریڈٹ بنک آف انڈیا بیٹھ گیا اور اس کے بعد ہی انڈین اسپیشی بنک بھی اس گرداب بلا میں ڈوب گیا - حالانکہ یہ ایک ہی ہندوستانی بنک تھا جس کی شاخ لنڈن میں بھی قائم تھی - ان کے بعد ۱۳ بنک اور ختم ہو گئے - بنکوں کا یوں جو بہ کثرت دوالہ نکلا -

اسکے بہت سے اسباب جمع ہو گئے تھے ۔ بعض بنکوں کے منیجر وہ لوگ تھے جن کو ایسے کاروبار کا کوئی تجربہ نہ تھا اور اس لئے انھوں نے تخمینی منصوبوں میں بے خطر روپیہ لگانا شروع کر دیا بعض بنکوں نے نام تو بہت ہی معزز اور شاندار رکھ لئے تھے لیکن ان کے پاس ادا شدہ اصل بہت کم تھا نا کافی ضمانت پر وہ روپیہ قرض دیتے تھے اور ان کے نقد ذخیرے کی مقدار بلحاظ ان کے دین یعنی واجب الادا رقموں کے بہت قلیل تھی ۔ ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ دباؤ پڑنے کے وقت دوسرے مستحکم بنکوں نے خلاف معمول امداد کرنے میں بخل کیا ۔ یہ بنک کیا ٹوٹے گویا ہزارہا غریب لوگوں اور بیواؤں پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ۔ موجودہ اور آیندہ بنکوں کو عبرت پکڑنی چاہیے اور وہ ان غلطیوں کا پورا پورا خیال رکھیں جن کی وجہ سے اتنے بنکوں کا صفایا ہو گیا لیکن اگر اس تلخ تجربے کا نتیجہ یہ ہو کہ لوگ ہندوستانی بنکوں سے بیزار ہو جائیں تو بڑی بدقسمتی کی بات ہے امریکہ کے مقنن مدبر ڈینیل وبسٹر کا مقولہ ہے کہ دنیا میں جسقدر معدنیات کی کانیں ہیں ان سے کہیں زیادہ دولت قوموں میں اعتبار نے پیدا کی ہے اور ایک نامور ماہر فن معاشیات مسٹر مکلوڈ فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں اگر دولت اور مرفہ الحالی بڑھی تو بنک کے کاروبار پھیلنے اور لوگوں میں اس کی عادت پیدا ہونے سے بڑھے گی ۔

بنکوں میں زرِ امانت کا اضافہ۔

تینوں پریزیڈنسی بنکوں میں ۱۹۰۴ء میں زر امانت کی تعداد ۲۵ کرور ۱۵ لاکھ تھی جو کہ ۱۹۱۳ء میں بڑھ کر ۴۲ کرور ۳۷ لاکھ ہو گئی ۔ اور نقد فاضلات ۱۰ کرور ۲۲ لاکھ سے ۱۵ کرور ۳۸ لاکھ تک پہنچیں ۔ اسی دوران میں یہاں کے مبادلہ بنکوں کا زر امانت ۱۶ کرور ۳۲ لاکھ سے ۳۱ کرور ۳ لاکھ ہو گیا اور ان کی نقد فاضلات بھی جو ۴ کرور ۹۴ لاکھ تھیں ۔ ۵ کرور ۸۸ لاکھ ہو گئیں ۔ ایسے مشترک سرمایہ والے ہندوستانی بنک جن کا اصل ۵-۵ لاکھ سے زیادہ تھا ان کا زر امانت بھی ۱۱ کرور ۵۱ لاکھ سے بڑھ کر ۲۲ کرور ۵۹ لاکھ ہو گیا ۔ اور نقد فاضلات ۱ کرور ۴۴ لاکھ سے ۴ کرور تک پہنچیں ۔ یہاں

ایک بات قابل توجہ ہے وہ یہ کہ ان مبادلہ بنکوں میں جسقدر زر امانت کی مقدار بڑھی ۔ اسی نسبت سے نقد فاضلات میں اضافہ نہیں ہوا۔ بلکہ کم ہوا۔ اس سے یہ شک پیدا ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض بعض بنکوں کا طرز کاروبار ضرور خلاف احتیاط ہے ۔ یہ نکتہ بنک کا طریق کاروبار سمجھنے کے بعد بخوبی واضح ہوجائے گا۔

سرکار خود بھ
بنک ح

سرکار خود بھی تو بنک کا بہت کام انجام دیتی ہے اپنے فاضلات اپنے پاس رکھتی ہے ۔ زر اور بیشتر مبادلات خارجہ بھی اسی کے ہاتھ میں ہیں ۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے ڈاکخانوں میں لوگوں کا روپیہ امانت رکھکر اس پر سود دیتی ہے ۔ ۳۱ ۔ مارچ سنہ ۱۹۱۱ع کو ڈاکخانے کے سیونگ بنکوں میں تقریبًا ۱۹ کرور روپیہ بمد امانت جمع تھا۔ سرکار ان امانتوں کے واسطے کوئی جداگانہ فاضلات نہیں رکھتی بلکہ کل امانت کو بے ننڈ قرضہ کا جزو سمجھے جاتی ہے ۔ زرعی ترقیوں اور اراضی و مویشی کی خرید کے واسطے سرکار کاشتکاروں کو قرض بھی دیتی ہے ۔ خصوصًا قحط اور خشک سالی میں اس قسم کی امداد بہت بڑھ جاتی ہے ۔ سرکاری سرپرستی میں جو قرض امداد باہمی کی انجمنیں قائم ہورہی ہیں۔ ان کا بھی وہی کام ہے جو یورپ میں زرعی بنک انجام دیتے ہیں ۔ بنک والے اپنے اصل اور اسکے ساتھ زر امانت کے بڑے حصے کو قرض پر چلاتے ہیں وہ اس طرح کہ یا تو امانت سے زیادہ روپیہ امانت رکھنے والے کو دیدیا۔ یا ضمانت لیکر باقاعدہ قرض دیدیا۔ ضمانت خواہ ذاتی ہو یا مالی ۔ یا کوئی رقعہ دستاویز لکھواکر قرض دیدیا ۔ اور بقدر مناسب متغیر فاضلات کی گنجایش رکھ لی ۔ اس کے علاوہ تجارتی ہنڈیاں بٹے سے خریدنا۔ دلالوں کو قرض دینا ۔ اور قابل بیع و شرئی تمسکات خریدنا یہ بھی روپیہ لگانے کے طریق ہیں ۔ مشترک سرمایہ والے ہندوستانی بنک زیادہ تر رہن اور ضمانت پر روپیہ قرض دینے کا کام کرتے ہیں ۔

اعتباری
دستاویزات

ہندوستان میں اعتباری دستاویزات پر قانون دستاویزات قابل بیع و شرئی نافذ ہے ۔ دستاویز قابل بیع و شرئی سے پرامیسری نوٹ ۔ ہنڈی

یا چک مراد ہوتی ہے۔ پرامیسری نوٹ تو یہ ہے کہ ایک شخص بلا کسی شرط کے ایک معین رقم دوسرے شخص کو ادا کرنے کا وعدہ تحریر کردے۔ ہنڈی ایک دستاویز ہوتی ہے جس میں ہنڈی جاری کرنے والا اپنی دستخط سے ایک دوسرے شخص کے نام ایک غیر مشروط حکم لکھتا ہے کہ وہ ایک معین رقم کسی ایک تیسرے شخص کو یا اس تیسرے شخص کے حکم کے مطابق۔ یا اس ہنڈی کے حامل کو ادا کرے۔ چک بھی گویا ایک ہنڈی ہے۔ جو بنک والے کے نام لکھی جاتی ہے۔ کہ وہ رقم مندرجہ عند الطلب ادا کردے۔ دستاویزات قابل بیع وشری یا تو داخلی ہوتی ہیں یا خارجی۔ یعنی یا تو وہ یہیں کی یہیں لکھی جائیں اور ادا ہوں یا وہ باہر لکھی جائیں یا باہر ادا ہوں ان کے علاوہ کچھ دستاویزات اور ہیں جو کہ دست بدست فروخت ہوتی ہیں اور تجارت میں انکی حیثیت بھی انھی قابل بیع وشری دستاویزات کی سی ہو گئی ہے۔

یہ تو پہلے ہی بیان ہو چکا ہے کہ ہندوستان میں بیشتر بھی شرح سود کی مقدار ہر سال بہت زیادہ رہتی ہے۔ کبھی کبھی ۱۱ - ۱۲ فی صدی تک نوبت آجاتی ہے۔ لیکن صرف چند ماہ تک شرح اس قدر بڑھی رہتی ہے یعنی جاڑے کے موسم میں جبکہ برآمد کے واسطے زرعی پیداوار خریدتے ہیں اور روپے کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے۔ یہ تجویز اکثر پیش کی جاتی ہے کہ ایسے موقعوں پر سرکار شرح سود گھٹانے میں مدد دے اور وہ چاہے تو ایسا کر بھی سکتی ہے۔ اکثر ایسا واقع ہوتا ہے کہ جب روپے کی بازار میں بہت قلت ہوتی ہے سرکاری خزانے روپے سے بھرے رہتے ہیں۔ اگر سرکار کاغذ زر کے محفوظ ذخیرے اور نقد فاضلات میں سے کچھ روپیہ قرض دے دیا کرے تو زر کے بازار میں ضرور بہت امن رہے۔

# بارھواں باب

## صرف دولت

دولت کے پیدا ہونے کی غرض و غایت یہی ہے کہ اس کو صرف میں لاویں۔ جب دولت کی پیدائش کا تصور کرتے ہیں تو پیدائش کا مقصد یہی ذہن میں آنا لازمی ہے۔ گویا پیدائش اور صرف میں لزوم ذہنی ہے۔ یہ لزوم ایک اور طرح پر بھی واضح ہوتا ہے۔ دولت صرف کئے بغیر اس کی پیدائش ممکن نہیں۔ پس پیداوار کی مقدار اور خوبی کا مدار بھی لزوماً دولت کے صرف پر ہے

معیار زندگی

لوگ جو اپنے واسطے معیار زندگی قرار دے لیتے ہیں یا یوں کہیئے کہ مقتضائے حال جو معیار ان کے واسطے مقرر کر دیتا ہے۔ اسی کے لحاظ سے چیزیں صرف میں آتی ہیں۔ یہ معیار زندگی نہ صرف افراد میں مختلف ہوتا ہے بلکہ پیشوں کے مطابق فرقے فرقے کا جداگانہ نظر آتا ہے۔ انگلستان اور ریاستہائے متحدہ کے سے ترقی یافتہ ممالک میں معیار زندگی، کے اختلافات بہت نمایاں ہو رہے ہیں۔ لیکن ابتدائی امور کے لحاظ سے سب فرقوں کا معیار یکساں نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس ہندوستان میں اس لحاظ سے بھی معیار زندگی میں بہت اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔

معیار زندگی میں نہ صرف مدارج بلکہ نوعیت کا بھی اختلاف ہوتا ہے مثلاً بعض چیزیں ہیں کہ ان کے کھانے سے جسم کو تو قوت پہنچتی ہے لیکن وہ اخلاقی بہبود کے واسطے مضر ہیں۔ معیار زندگی کو جسمانی ضروریات تک محدود کر دینے سے معاشیات میں بہت تنگی پیدا ہو جائے گی۔ بلکہ ہمارے نزدیک اس معیار میں اعلیٰ مقاصد بھی شامل رکھنے چاہئیں ہمکو پروفیسر مارشل کی تقلید کرنی مناسب ہے وہ فرماتے ہیں کہ معیار زندگی سے کوششوں اور ضروریات کا معیار مراد لینا

چاہیئے - پس معیار زندگی اعلیٰ ہونے سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ عقل و ذہانت - چستی اور خودداری میں بھی ترقی ہو - مصارف میں زیادہ احتیاط اور قوت فیصلہ سے کام لیا جائے - اور ایسے خوردونوش سے احتراز کیا جائے کہ جو پیٹ تو بھر دے لیکن قوت نہ پہنچائے اور ایسے طرز سکونت سے اجتناب کیا جائے جو صحت اور اخلاق کے واسطے مضر ہو -

اس نظر سے یہ ضروری نہیں رہا کہ جو معیار زندگی بیش خرچ ہو وہی اعلیٰ بھی ہو - اور اگر ہندوستانیوں کو وہ چیزیں میسر آنے لگیں جن کو لوگ غلطی سے نفائسات سمجھتے ہیں سو ہمارے نزدیک ان کی زندگی میں کوئی لطف یا بہتری پیدا نہ ہوگی - معیار زندگی اعلیٰ ہے یا ادنیٰ - اس کے فیصلے کے واسطے یہ دریافت کرنا چاہیئے کہ آیا جن لوگوں میں وہ رائج ہے - ان کی صحت اور اخلاقی و مالی حالت پر اس کا اثر مفید پڑ رہا ہے یا مضر دولت کا بہترین مصرف تو وہ ہے کہ جس سے افراد اور ان کی کل جماعت کو بیشتر فائدہ پہنچے - بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان میں جو رسم و رواج اور مذہبی و اخلاقی خیالات رائج ہیں وہ ادنیٰ معیار زندگی کے مؤید ہیں - ایک لحاظ سے یہ خیال صحیح بھی ہے - لیکن اس پر افسوس کرنے کی کوئی وجہ نہیں البتہ ہم کو ان دونوں معیاروں میں فرق کرنا چاہیئے - یعنی ایک تو وہ کہ جس کی مذہبی تعلیم اور اخلاقی اصول تائید کریں - اور دوسرے وہ کہ جو ان کے اثر سے بچکر معاشی حالات کی مجبوری سے قرار پائے -

اضافہ ضروریات

کچھ عرصے سے ہندوستان میں بہت سی بناوٹی ضروریات محسوس ہونے لگی ہیں - مقولہ ہے کہ ضروریات بڑھنے سے کوشش میں بھی اضافہ ہوتا ہے - لیکن یہ قول صرف تہذیب کے ابتدائی مراحل پر صادق آتا ہے - ایک حد کے بعد بناوٹی ضروریات بڑھنے سے زندگی میں کوئی خوبی پیدا نہیں ہوتی یہ سچ ہے کہ مایحتاج پوری کرنے کی کوشش جو ہر طرف جاری ہے یہی معاشیات کا اساسی بحث ہیں - لیکن اس سے یہ نتیجہ کہاں نکلتا ہے کہ انسان برابر اپنی ضروریات بڑھاتا رہے اور ان کے پورا ہونے سے جو لطف حاصل ہو -

اسی کے واسطے اپنی زندگی وقف کر دے۔ بعض احتیاجات تو وہ ہیں جو خود بخود انسان کو پیش آتی ہیں۔ اور ان کا پورا کرنا لابد ہے۔ لیکن رات دن ضروریات بڑھانا اور ان ہی کے حاصل کرنے میں لگے رہنا۔ یہ طریق زندگی افراد اور جماعت کسی کے حق میں بھی مفید نہیں۔ تہذیب کا صحیح معیار اضافۂ ضروریات نہیں بلکہ مفید کوششوں کی ترقی سمجھنا چاہیئے۔

صرف کی قس

جو چیزیں صرف میں آتی ہیں معاشیات کی رو سے ان کی دو قسمیں ہیں۔ ضروریات اور تنعمات۔ ضروریات کی بھی دو قسمیں قرار پائی ہیں ضروریات زندگی اور ضروریات کارگزاری بعض چیزیں وہ ہیں جو رواجی ضروریات شمار ہوتی ہیں گرچہ ان چیزوں میں پوری پوری تفریق کرنے کا کوئی قاعدہ موجود نہیں۔ تاہم یہ تقسیم مفید اور کارآمد ہے۔ البتہ یہ خیال رکھنا ضرور ہے کہ جو چیز ایک شخص کی ضروریات میں داخل ہے دوسرے کے حق میں وہ از قسم تنعمات شمار ہو سکتی ہے۔

صرف کے اع
و شمار

ہندوستان کے متعلق صرف دولت کے ٹھیک اعداد و شمار دستیاب نہیں ہوتے۔ البتہ جن چیزوں پر محصول قائم ہے ان کی مقدار درج رہتی ہے۔ کل مقدار کو مجموعی آبادی کی تعداد پر تقسیم کریں تو ایسی چیزوں کے صرف کا اوسط فی کس معلوم ہو سکتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ چیزیں صرف میں بہت زیادہ اہم نہیں اس لئے ان کا اوسط معلوم ہونے سے لوگوں کی حالت معیشت پر کافی روشنی نہیں پڑتی۔ علاوہ بریں اوسط فی کس گو دوسرے ملکوں سے مقابلہ کرنے میں کارآمد ہو۔ تاہم اس سے یہاں کے مختلف طبقوں کی حالت کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ضرورت ہے کہ چارلس بوتھ اور سیام راؤن ٹری صاحب کی طرح یہاں بھی کچھ جوشیلے لوگ نمونے کے قصبوں اور دیہات میں صرف دولت کے متعلق پوری پوری تحقیقات کر کے حالات اور نتایج شایع کریں۔ زندگی کو اعلیٰ سطح پر لانے سے قبل ضرور ہے کہ جسمانی ضروریات جن کو ابتدائی ضروریات بھی کہتے ہیں۔ پوری ہوں۔ بالفاظ دیگر کھانا، کپڑا، اور مکان میسر ہو۔ اس سے قبل بیان ہو چکا

ہے کہ ہندوستانیوں کی اوسط آمدنی بہت قلیل ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جماعت کثیر کو ناگزیر ضروریات بھی بہ مشکل میسر آتی ہیں۔ جیسا کہ عرصہ ہوا سر ولیم ہنٹر نے کہا تھا۔ چھٹے حصے سے زیادہ آبادی کو مدت العمر پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا۔ سرگائی فلیٹ وڈ ولسن جو کہ حال میں سرکار ہند کے وزیر مال تھے فرماتے ہیں۔ "لوگوں کی بڑی جماعت غریب ہے۔ اور ایک خاص جماعت بہت ہی غریب ہے۔" واقعہ یہ ہے کہ لوگوں کی ایک بڑی جماعت ابتدائی افلاس کی حد سے بھی گزر گئی ہے۔ اور ہزارہا لوگوں کو دن میں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا۔ بلکہ اس میں بھی شک ہے کہ آیا متوسط طبقے کے سب لوگوں کو تن پرور غذا کی کافی مقدار ملتی ہے یا نہیں؟

لباس کی مد ہندوستان میں اس درجہ ضروری نہیں ہے جتنی کہ یورپ یا امریکہ میں۔ گرمیوں میں تو بہت تھوڑے لباس سے کام چل جاتا ہے۔ البتہ جاڑوں میں گرم لباس بغیر گزر نہیں۔ خصوصاً شمالی ہندوستان میں جہاں بہت سخت سردی پڑتی ہے۔ لیکن غریب لوگوں کو گرم کپڑا کم میسر ہوتا ہے۔ اور بعض بعض سردی کے مارے مرجاتے ہیں۔ متوسط طبقے کے لوگ شاید لباس میں اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرتے ہیں۔ کپڑوں کی خاطر ان کو دوسرے ضروری اور مفید مصارف گھٹانے پڑتے ہیں۔ دولتمند لوگ البتہ چاہیں تو لباس کے معاملے میں دل کی حسرت نکالیں۔ لیکن کل آبادی کے مقابلے میں ان کی تعداد ہی کتنی ہے۔

رہے مکانات سو زیادہ تر لوگ تو کچے مٹی کے جھونپڑوں میں رہتے ہیں۔ جن پر پھونس کے چھپر پڑے ہوتے ہیں اور متوسط طبقے میں بھی بہت سے لوگوں کو ایسے مکانات میسر نہیں آتے جو یورپ اور امریکہ میں صاف ستھرے سمجھے جاسکیں۔

افلاس کا اثر

ابتدائی ضروریات تو وہی ہیں جن پر زندگی کا دارومدار ہو ــ ان کی ناکافی مقدار ملتی رہنے سے یہ تو ممکن ہے کہ کچھ دن جان بچی رہے لیکن جسمانی اور اخلاقی حالت خراب ہونی یقینی ہے۔ ناکافی صرف کا دولت کی پیدائش

پر از حد اثر پڑتا ہے۔ نہ پیٹ بھر کھانا نہ تن بھر کپڑا۔ نہ ڈھنگ کا مکان۔ ہندوستان میں خلقت ہے کہ مصیبت اور بیکاری میں دن کاٹتی ہے۔ کافی غذا نہ ملنے سے جسم کی طاقت اور چستی گھٹ رہی ہے اسی وجہ سے لوگ بہت جلد بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی وقت آپڑے مثلاً خشک سالی یا قحط تو چونکہ گرہ میں کچھ اندوختہ نہیں مصیبت کی کچھ انتہا نہیں رہتی۔ کمزور اور مریض والدین کی اولاد بھی نری مہمل ہوتی ہے۔ اور پھر جب کھانے پینے کو نہ ملے تو بس ناکارہ لوگوں کا ہر طرف ہجوم نظر آنے لگتا ہے۔ اس طرح جسمانی کمزوری نسلاً بعد نسل بڑھتی جاتی ہے اور ساتھ ہی اخلاقی قوت میں بھی ضعف آرہا ہے حاصل کلام یہ کہ کارگزاری محنت جو کہ پیدائش کا ایک زبردست آلہ ہے۔ بسرعت روز افزوں تنزل کر رہی ہے خدا خیر کرے۔

ضروریات کی کاٹ چھانٹ معاشیات کے لحاظ سے باعث نقصان ہے اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اگر یہاں کے لوگوں کو صرف کے واسطے زیادہ سامان میسر ہو تو دولت کی پیدائش میں بھی بہت کچھ اضافہ ہو سکتا ہے۔ البتہ سامان جو صرف میں آئے ایسا ہونا چاہیئے۔ کہ اس سے قوم کی صحت اور طاقت ترقی کرے۔ کھانے کی خاص خوبی یہ ہے کہ وہ تن پرور ہو۔ مقوی غذا پر لذیذ کھانوں کو ترجیح دینا بری عادت ہے۔ اس کو ترک کرنا چاہیے شراب و مسکرات کے استعمال کرنے میں نہ صرف روپیہ برباد ہوتا ہے بلکہ اس سے جسم اور دماغ کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔ رہا لباس، مکان اور سامان خانہ داری ان مصارف میں صحت، راحت، اور اخلاق کا خاص لحاظ رکھنا چاہیے اور عیش و عشرت سے جہاں تک الگ رہیں بہتر ہے۔ معاشیات کے لحاظ سے تنعم اور عشرت حاصل خیز نہیں ہے۔ تنعمات کی مانگ سے اصل اور محنت دونوں فضول کاموں میں لگ جاتے ہیں اور اس سے بہت نقصان پہنچتا ہے۔ بقول ایک مشہور ماہر فن کے تنعمات کے صرف کرنے سے۔ استعداد اور قابلیت بڑھنے کے بجائے ہماری دولت ہماری صحت اور عقل سب میں کمی آجاتی ہے۔

یہاں تک تو جسمانی ضروریات بیان ہوئیں۔ لیکن کچھ ضروریات اور اعلیٰ درجے کی بھی ہیں۔ جو اہمیت میں مذکورہ بالا ضروریات سے کسی طرح کم نہیں۔ اور انھی کا انتظام نہ ہونے سے اس وقت ہمارا ملک اس درجہ پس ماندہ نظر آتا ہے۔ یہ ضروریات کیا ہیں۔ تعلیم، صفائی، راحت اور تفریح۔ تعلیم کی معاشی قدر و قیمت معاشیات کے لحاظ سے سب کو تسلیم ہے۔ مزدور کی ذہانت بڑھانے سے اس کی پیدا آور حاصل خیز کارگزاری میں ترقی ہوتی ہے۔ ہندوستان سے ملک میں صفائی تو نہایت ضروری چیز ہے مزید کام کے واسطے جسم اور دماغ کو تیار کرنے کے لیئے کافی آرام ملتا رہنا ضروری ہے۔ چونکہ تفریح کا اخلاق اور لطف زندگی پر نہایت گہرا اثر پڑتا ہے۔ اہل فن کو اس کا بھی خاص خیال رہتا ہے ایک ماہر معاشیات کا قول ہے کہ قلت تفریح سے قوم سست اور پژمردہ ہو جاتی ہے۔ کثرت تفریح سے اس میں ضعف اور کمزوری بڑھتی ہے اور بری طرح کی تفریحوں سے اس میں زوال آجاتا ہے۔ ان تمام ضروریات کے اہتمام کے واسطے معقول آمدنی درکار ہے حالت یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کی آمدنی معمولی اور ناگزیر ضروریات کے واسطے بھی کافی نہیں ہوتی۔ اگر آمدنی بڑھنی بھی شروع ہو تو اول اول اضافے سے معمولی ضروریات کی کمی پوری ہو گی۔ البتہ اس کے بعد اعلیٰ ضروریات کے حاصل کرنے کی نوبت آئے تو آئے۔

# تیرھواں باب

## مالیات

تحصیل

سرکارِ ہند کے تحصیلِ مال کے مختلف ذرائع ہیں۔ ان ذرائع کو کئی طور پر ترتیب دے سکتے ہیں۔ سب سے سادہ طریق یہ ہے کہ سلطنت کی آمدنی چار مدوں میں تقسیم کی جائے۔(۱) سرکاری ملک و جائداد کی آمدنی مثلاً جنگلات (۲) تجارتی کاموں کا منافع۔ مثلاً تار و ڈاکخانہ (۳) محکموں کی اتفاقی آمدنی مثلاً محکمہ عدالت (۴) محصول۔ ایک تقسیم یوں بھی ہو سکتی ہے کہ پہلی تین مدوں کو غیر محصولی کہیں، اور چوتھی مد کو محصولی بات یہ ہے کہ بالکل منطقیانہ تو کوئی تقسیم بھی نہیں ہو سکتی۔ اور نہ ہو تو مضائقہ بھی نہیں۔ صرف اس قدر لحاظ ضروری ہے کہ جو تقسیم اختیار کی جائے اس میں کوئی پراگندگی خیالات میں نہ ہو۔

بعض دوسرے ملکوں کے طریق محصول کے برخلاف یہاں محصول کا صرف ایک ہی مقصد ہے وہ یہ کہ آمدنی حاصل ہو۔ مختلف طبقوں کی آمدنی میں جو فرق نظر آتے ہیں۔ ان کے گھٹانے یا رفع کرنے کی غرض سے دوسرے ملکوں کی طرح یہاں کوئی محصول قائم نہیں کیا جاتا۔ یعنی محصول کا منشا مالی حالت میں کوئی مساوات پیدا کرنا نہیں ہوتا۔

سرکارِ ہند اپنا سالانہ بجٹ یا موازنہ تیار کرتے وقت تعین محصول کے جو مختلف اصول فنِ معیشت رائج ہیں۔ ان کی پابندی کا کوئی خاص دعویٰ نہیں کرتی۔ البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بالعموم ترمیم یافتہ اصول متناسب کی پیروی کرتی ہے۔ اور خاص خاص حالتوں میں اصول متزائد پر عمل پیرا ہوتی ہے۔ محصول کے اصول اکثر معاشیات کی کتابوں میں بالتفصیل مذکور

ہیں۔ بغرض سہولت ناظرین ایک مختصر خلاصہ یہاں بھی پیش کرتے ہیں۔

بقول پروفیسر بسٹیبل۔ محصول سے کسی فرد یا جماعت کی دولت کا وہ حصہ مراد ہے جس کا سرکاری کاموں کے واسطے حکماً ادا کرنا لازمی ہو تعین محصول کا پہلا اور سب سے سادہ اصول تو یہ ہے کہ سرکاری خدمات کے حساب سے محصول لیا جائے۔ جو سرکار سے جسقدر خدمت لے اسی حساب سے محصول ادا کرے۔ لیکن اس اصول میں بڑی خامی یہ ہے کہ سرکاری خدمات میں ہر ہر شخص کا حصہ نکالنا اور اسی نسبت سے محصول لگانا ممکن نہیں۔ دوسرا اصول مساوات محصول کا ہے۔ سب کو سرکار سے یکساں آرام اور فائدہ پہنچتا ہے۔ پھر سب لوگ برابر محصول کیوں نہ دیں۔ لیکن اس اصول سے غربا پر جس قدر ظلم ہوگا۔ محتاج بیان نہیں مزید براں سیاسی لحاظ سے بھی یہ اصول ناقابل عمل ہے۔ تیسرا اصول جو زیادہ مقبول بھی ہے۔ قابلیت یا مالی حیثیت کو محصول کا معیار قرار دیتا ہے لیکن "قابلیت" کا مفہوم اس قدر مبہم ہے کہ اس کی تشخیص دشوار ہے۔ قابلیت سے یا تو ملک وجائداد یا آمدنی اخام۔ یا خالص آمدنی مراد ہو سکتی ہے۔ ایثار کا اصول بھی اصول قابلیت کے لگ بھگ ہے فرق اتنا ہے کہ قابلیت انفعال ہے۔ اور ایثار فعل۔ ان دونوں اصول سے تعین محصول کے دو طریقے نکلتے ہیں۔ (۱) محصول متناسب۔ اس میں آمدنی کو معیار قرار دیکر اس کے مطابق محصول کا بار ڈالتے ہیں۔ (۲) محصول متزائد۔ اس میں کم آمدنی والوں کے مقابل زیادہ آمدنی والوں سے محصول بقدر زائد وصول کیا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ آمدنی کے مقابل ادائے محصول کی قابلیت زیادہ سرعت سے بڑھتی ہے محصول متناسب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں سادگی بہت ہے قدیم فن معیشت کا تو یہی مستند اصول تھا۔ لیکن اب محصول متزائد کا طریق زیادہ رواج پا رہا ہے۔ اس پر چند اعتراض بھی عائد ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس طریق میں خود مختاری کی گنجائش زیادہ ہے۔ محصول سے بچنے کی صورتیں بھی نکل سکتی ہیں۔ اندیشہ ہے کہ غالباً تو فیر دولت پر بھی اس کا اثر برا پڑے۔ اور متقابلۃً اس طریق سے محصول کی مقدار

بھی کم رہتی ہے البتہ اس میں یہ خوبی ضرور بتاتے ہیں کہ محصول متناسب کے مقابل یہ زیادہ قرینِ انصاف ہے۔ اس معاملے میں بڑے بڑے ماہرین کی رائیں دونوں جانب برابر ہیں۔ محصول متزائد کی ایک انتہائی صورت یہ ہے کہ مساوات ایثار کے بجائے کمترین ایثار کی بنا پر محصول قرار پائے یہ طریق اشتراکی مساوات کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ محصول متناسب میں بھی طرح طرح کی ترمیمیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ایک حد کے بعد شرح محصول یکساں کر دی جاوے بسٹبل صاحب کی کتاب مالیات میں اصول محصول کے متعلق مفصل بحث موجود ہے۔

واضح ہو کہ سرکار ہند کا طریق محصول مفرد نہیں ہے۔ یعنی یہ نہیں کہ ملک جائداد یا لگان یا اصل یا آمدنی یا کسی اور چیز پر ایک محصول لگا دیا ہو۔ اس کے برعکس یہاں کا طریق مرکب ہے یعنی بہت سی چیزوں سے محصول وصول کیا جاتا ہے۔ واضح ہو کہ دونوں طریقوں میں کچھ کچھ خوبیاں اور نقص موجود ہیں۔ طریق مفرد میں خوبی تو یہ ہے کہ وہ سادہ ہے۔ مصارف تحصیل کم رہتے ہیں اور تادیہ محصول کا ٹھیک ٹھیک پتا چل جاتا ہے لیکن اس میں کچھ خرابیاں بھی ہیں۔ مثلاً کسی خاص مقام پر اس کا بار بہت بڑھ جاوے۔ لوگ اس سے بچے رہیں۔ حساب وغیرہ کی غلطی ہو تو درستی کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ اس میں بہت پیچیدگی اور دقت پیدا ہو سکتی ہے ایک رقم کی شکل میں کل مطلوبہ محصول وصول کرنے سے لوگوں میں ناراضی پھیلنے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ اس کے مقابل طریق مرکب میں یہ خوبیاں بتاتے ہیں کہ اس کا بہت سے مقامات پر ہلکا ہلکا بار پڑتا ہے۔ یہ نہیں کہ کل بار ایک مقام پر آن پڑتا ہے اور اس میں یہ خاصہ ہے کہ بحیثیت مجموعی لوگوں پر مساوی بار پڑتا ہے۔ ساتھ ہی اس طریق پر بھی یہ اعتراضات وارد ہوتے ہیں کہ تادیہ محصول کا بآسانی پتا نہیں چلتا۔ صنعت و حرفت کی ترقی پر اس کا مضر اثر پڑتا ہے۔ ادا کنندوں کو ناگوار اور دقت طلب محسوس ہوتا ہے اور مصارف تحصیل بہت بڑھ جاتے ہیں۔ آج کل ترقی یافتہ

ممالک میں طریق مجموعی رائج ہے جس میں ایک حد تک دونوں مذکورۂ بالا طریقوں کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔

محصول بلاواسطہ وبالواسطہ

محصول بلاواسطہ اور محصول بالواسطہ یہاں دونوں قسم کے محصول رائج ہیں مالگزاری کے ابواب اور محصول آمدنی تو پہلی قسم میں داخل ہے۔ کرور گیری اور چنگی کا محصول قسم دوم میں شمار ہوتا ہے۔ محصول افیون کو زیادہ تر تجارتی منافع سمجھنا چاہیئے۔ یہ بات ذہن نشین کرنی ضرور ہے کہ محصول بلاواسطہ اور محصول بالواسطہ کے درمیان کوئی بین حد بندی نہیں۔ چنانچہ بعض محصول ایسے ہیں کہ دونوں قسم کے بین بین نظر آتے ہیں۔ مثلاً فیس رجسٹری اور فیس اسٹامپ۔ واضح ہو کہ محصول بلاواسطہ سے وہ محصول مراد ہے کہ جس کا بار خود ادا کرنے والے پر پڑے۔ اگر اس کے بجائے بار کسی دوسرے شخص پر منتقل ہو جائے تو وہ محصول بالواسطہ شمار ہوگا۔ محصول بلاواسطہ میں ایک بڑی خوبی ہے وہ یہ کہ اس سے لوگوں کے دماغ پر تعلیمی اثر پڑتا ہے ہر شخص کو معلوم رہتا ہے کہ وہ سلطنت کے خزانے میں کس قدر رقم داخل کرتا ہے اگر کسی وقت سرکار ظلم کرے یا لوگوں کے بہبود اور مفاد کی طرف سے غفلت برتے تو لوگ محصول دینے سے انکار کر سکتے ہیں۔ اور اگر کسی پر بیجا بار رکھا جائے تو وہ چاہے تو حجت کرے۔ علاوہ بریں ایسے محصول کی تحصیل میں سہولت بہت ہے۔ اور مصارف تحصیل کم پڑتے ہیں۔ اس میں کچھ نقص بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ محصول طلب کرنا ادا کنندوں کو ناگوار گزرے اور اس کے اضافے سے ناراضی پھیلے۔ (۲) اس کی تشخیص دشوار ہے (۳) غریب طبقوں سے مناسب مقدار وصول کرنی مشکل ہے (۴) اور اس میں تغیر پذیری کی صلاحیت بھی کم ہے اس کے مقابل محصول بالواسطہ میں بھی کچھ خوبیاں نظر آتی ہیں (۱) ادا کنندوں کو اس کا پتا بھی نہیں چلتا اور اس وجہ سے یہ کبھی باعث ناراضی نہیں ہو سکتا (۲) تھوڑی تھوڑی مقدار میں بآسانی وصول ہو سکتی ہیں (۳) اس میں پیدا آوری زیادہ ہے۔ یعنی مرفہ الحالی کے زمانے میں خود بخود اس کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ کسی پر بیجا بار نہیں پڑتا

(۴) وہ ایسے وقت وصول کیا جاتا ہے کہ ادا کنندہ کو سہولت ہو۔ اب اس کی خرابیاں بھی ملاحظہ ہوں۔ اوّل تو محصول ٹالنے کی بہت گنجائش ہے۔ یعنی یہ کہ لوگ محصول ادا کرنے سے بچتے رہیں۔ دوسرے تنگی کے زمانے میں اس کی مقدار خود بخود گھٹ جاتی ہے تیسرے اس کا بار خوش حال لوگوں کے مقابل غربا پر زیادہ پڑتا ہے۔ چوتھے اسکے مصارف تحصیل بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ اور پانچویں اس سے صنعت وحرفت کی راہ ترقی میں بھی رکاوٹ پیدا ہونے کا اندیشہ ہوسکتا ہے۔ بہترین طریق یہی ہے کہ دونوں قسم کے محصول مناسب طور پر یکجا کردیئے جائیں۔

سرکاری تحصیل کے مختلف ذرائع بالتفصیل بیان کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عمدہ طریق محصول کی مسلمہ خصوصیات پیش کردیں تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ سرکار ہند کے مالی انتظام میں یہ خصوصیات کہاں تک موجود ہیں وہ خصوصیات یہ ہیں (۱) طریق تحصیل ترقی پذیر سلطنت کی واجبی ضروریات کا کفیل ہو (۲) محصول بخوبی پیدا آور ہوں۔ یعنی ان سے کافی آمدنی حاصل ہو۔ ورنہ پھر محصول بیکار ہیں۔ اپنی کارگزاری برقرار رکھتے ہوئے سرکار جس قدر بھی ہوسکے لوگوں سے محصول کم لے۔ بالفاظ مختصر مجموعی اعدام افادہ قلیل ترین ہونا چاہیئے (۴) مصارف تحصیل کم ہوں (۵) محصول توفیر دولت کی خواہش کو نہ روکے اور اضافۂ دولت میں مزاحم نہ ہو (۶) اس کی تقسیم منصفانہ ہو یعنی لوگوں پر مساوی بار پڑے یا یوں کہیئے کہ اعدام افادہ سب ادا کنندوں کے حق میں قلیل ترین رہے (۷) محصول معین اور معلوم رہنا چاہیئے (۸) اس میں تغیر پذیری کی صلاحیت ضروری ہے (۹) ایسی چیزوں پر محصول لگایا جائے اور ایسے وقت وصول کیا جائے کہ ادا کنندوں کو سہولت ہو اور حتی الامکان ان کو ناگوار نہ گزرے اور مخالفت کی نوبت نہ آئے (۱۰) طریق محصول لوگوں کی عادات اور خیالات کی مناسبت سے مرتب کرنا چاہیئے انھی خصوصیات سے دو نتائج اور اخذ کیئے ہیں۔ ایک یہ کہ ناگزیر ضروریات زندگی پر کوئی محصول نہ لگانا چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ کوئی

ایسا محصول مقرر نہ ہونا چاہیئے کہ لوگ فطرتاً اس کے ادا کرنے کے مقابل اس سے بچنے کی طرف زیادہ مائل ہوں۔

محاصل کی قسمیں

ہندوستان کی تحصیل کی مدیں حسب ذیل سمجھنی چاہیئیں - مالگزاری افیون نمک - اسٹامپ - چنگی - ابواب - ملکی - کروڑ گیری - محصول آمدنی - جنگلات - رجسٹری - دیسی ریاستوں کا خراج سود - ڈاکخانہ - تار - ٹکسال - دیوانی محکموں کی آمدنی - متفرق آمدنی - ریلوے - آبپاشی - تعمیرات - اور فوجی محکمے کی آمدنی غور کرنے سے واضح ہوگا کہ پہلی گیارہ مدیں تو کلاً یا جزءً محصولی آمدنی کے تحت میں آتی ہیں - اور باقی غیر محصولی کے تحت میں۔

مالگزاری

مالگزاری یعنی زمین مزروعہ کا محصول ہندوستان کے مالیات کا ہمیشہ سے بڑا سہارا ہے - سرکار اس بناء پر مالگزاری طلب کرتی ہے کہ یہاں ہمیشہ حکومتوں نے زراعت کی پیداوار میں سے حصہ لیا ہے - پہلے زمانے میں بھی سب حکومتیں بیشتر آمدنی زمین ہی سے حاصل کرتی رہیں - اس محصول میں ایک تو پیدا آوری کی خوبی موجود ہے - دوسرے وہ قدیم رواج کے مطابق بھی ہے۔ مالگزاری کی مجموعی سالانہ آمدنی ۲۱ کرور پچاس لاکھ روپے کے قریب ہے - یعنی محاصل خام کی ۲۶ فیصدی یا محاصل خالص کی ۴۰ فیصدی - گزشتہ پچیس تیس سال کے اندر مالگزاری میں دس کرور کے قریب اضافہ ہوا۔

واضح ہو کہ مالیات کے بیان میں جو اعداد و شمار جا بجا درج ہیں وہ سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء کے پختہ موازنے سے لیئے گئے ہیں - سالانہ موازنے کے پیش کرنے کا طریق مختصر طور پر بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا - ہر سال شروع مارچ میں وزیر مال شاہی مجلس وضع قوانین کے روبرو سال آئندہ کے متعلق جس کی ابتدا یکم اپریل سے شمار ہوتی ہے مداخل و مخارج کے تقدمے پیش کرتا ہے اس کے بعد دو ہفتے تک ان تقدموں پر غور و خوض اور بحث مباحثہ ہوتا رہتا ہے۔ تیسرے ہفتے میں موازنہ مکمل شکل میں پیش کیا جاتا ہے اور چوتھے ہفتے میں آخری بحث ہوتی ہے اس موقع پر اراکین مجلس محض اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر دیتے ہیں - رائیں شمار نہیں ہوتیں نئے سال کے متعلق تخمینی موازنہ

پیش کرنے کے وقت وزیر مال قریب الختم سال کا تخمینۂ موازنہ اور اس سے پہلے سال کے حسابات بھی ساتھ ہی پیش کر دیتا ہے۔ چیمبرلین کمیشن نے یہ رائے دی ہے کہ سرکاری سال یا تو یکم جنوری سے شروع ہوا کرے یا یکم نومبر سے۔

یہ سوال کہ مالگزاری محصول ہے یا لگان زیادہ تر ایک علمی بحث ہے عملی حیثیت سے کچھ اہم نہیں۔ سرکار کی رائے میں تو وہ لگان ہے لیکن مسٹر بیڈن پاول کو اس رائے سے اختلاف ہے۔ ان کا قول ہے۔ مالگزاری کو لگان نہ سمجھنا چاہیئے حتیٰ کہ رعیت واری علاقوں میں بھی وہ لگان شمار نہیں ہو سکتا۔ صاحب موصوف کا پختہ خیال ہے کہ مالگزاری بھی زرعی آمدنی پر ایک قسم کا محصول ہے۔

افیون افیون کی پیداوار برطانوی ہندوستان میں سرکاری اجارہ شمار ہوتی ہے۔ پوست کی کاشت صرف بہار اور صوبۂ متحدہ کے بعض حصوں میں بہ اجازت و نگرانی سرکار جاری ہے۔ اول تو پوست کاشت کرنے کی سرکار سے اجازت لینی ضرور ہے۔ دوسرے جس قدر بھی افیون خام پیدا ہو چھ روپے سیر کے حساب سے سرکار کے ہاتھ فروخت کرنا لازمی ہے۔ افیون جنگی جس سے وہ قلیل مقدار مراد ہے جو ہندوستان میں کام آئے۔ محکمۂ آبکاری کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ اور ساڑھے آٹھ روپے سیر کے حساب سے اس کی قیمت محصول افیون کی مد میں داخل ہو جاتی ہے۔ افیون کے ذخیرے سے اس کی وہ بڑی مقدار مراد ہے جو دوسرے ملکوں کو خصوصاً چین کو برآمد ہو۔ سرکار اس کو بطریق نیلام فروخت کرتی ہے۔ جو افیون نیم خود مختار دیسی ریاستوں میں پیدا ہوتی ہے۔ اور جس کو بالعموم افیون مالوہ کہتے ہیں۔ برطانوی حدود میں داخل ہوتے وقت اس پر بہت زیادہ محصول لیا جاتا ہے۔ یعنی بصورت تجارت برآمد ٦۰۰ روپے اور صرف کی حالت میں ۷۰۰ روپے فی پیٹی۔ چینی حکومت سے سرکار ہند نے ایک معاہدہ کر لیا ہے جس کے مطابق ہر سال افیون کا رقبۂ کاشت گھٹا دیا جاتا ہے محصول افیون جو کبھی ایک خاصا ذریعۂ مال شمار ہوتا تھا گھٹتے گھٹتے دو کروڑ روپے کے قریب رہ گیا ہے۔ چند سال میں یہ مد بالکل ہی بند ہو جائے گی۔

ہندوستان میں جسقدر نمک بنتا ہے یا درآمد ہوتا ہے اس پر ایک روپیہ من کے حساب سے محصول لیا جاتا ہے۔ سنہ ۱۹۰۳ء۔ سنہ ۱۹۰۵ء اور سنہ ۱۹۰۷ء میں محصول میں جو مسلسل تخفیف ہوئی تو اس سے آمدنی تو کم گھٹی اور نمک کے صرف میں بہت اضافہ ہوگیا۔ محصول نمک کی سالانہ مقدار ۵ کروڑ روپے سے کچھ ہی کم رہتی ہے۔

اسٹامپ محصول اسٹامپ کی دو مدیں ہیں۔ ایک تو کورٹ فی یا رسوم عدالت، دوسری وہ غیر عدالتی اسٹامپ جو کاروباری معاملات میں کام آتے ہیں۔ اس مد سے بھی تقریباً ۷½ کروڑ روپیہ وصول ہوتا ہے۔ اس کا بار زیادہ تر مقدمہ بازوں اور تجارت پیشہ لوگوں پر پڑتا ہے۔

اکسائز یا چنگی سے اصطلاحاً وہ محصول مراد ہے جو سودیشی مال پر وصول کیا جائے۔ خواہ تیار ہوتے وقت یا ملک میں فروخت ہونے سے قبل چنگی کے بھی چند ذرائع ہیں۔ اجازت نامے۔ شراب کشی کی فیس۔ فروخت مسکرات کا محصول۔ اور جس قدر افیون ملک میں خرچ ہو اس کا محصول ہے۔ سرکار کو ان مدوں سے اچھی خاصی رقم مل جاتی ہے۔ یعنی ۱۳ کروڑ روپے سے بھی زیادہ لیکن جو لوگ ترک مسکرات کی اصلاح کو پھیلانا چاہتے ہیں۔ وہ سرکار کو بہت مطعون کرتے ہیں کہ اس طرح سے مسکرات کا رواج اور بڑھتا ہے۔ سرکار کا یہ جواب ہے۔ کہ محصول سے تو مسکرات کا رواج رکتا ہے بڑھتا نہیں۔

ابواب ملکی ابواب ملکی سے وہ کل رقم مراد ہے، جو سڑکوں، پلوں، مدارس، دیہاتی انتظام اور پٹواری وغیرہ کے واسطے وصول کیجاتی ہے۔ اس طرح کی کئی مدیں شامل ہیں ان میں سے بعض بعض سنہ ۱۹۱۲ء میں منسوخ ہوگئیں، جو باقی ہیں ان کے ذریعے سے کل ۲۷ لاکھ روپیہ وصول ہوتا ہے۔

کروڑگیری کسٹمز یا کروڑگیری سے وہ محصول مراد ہے جو درآمد یا برآمد پر وصول کیا جائے کروڑگیری کی غرض و غایت یہاں صرف مالی آمدنی ہے تامین یا ترجیح نہیں۔ یعنی سودیشی پیداوار کو بیرونی مسابقت سے بچانا مقصود نہیں۔ نہ یہ کہ کسی ایک صنعت کو دوسرے پر ترجیح دیکر فائدہ پہنچایا جائے۔ کروڑگیری کی ایک لمبی چوڑی

فہرست ہے۔ اس میں خاص خاص چیزیں یہ ہیں ہتھیار اور اسلحہ۔ گولی، بارود،
فوجی سامان، شراب، افیون اس کے مرکبات مٹی کا تیل، نمک، خشک مچھلی
تمباکو اور چاندی۔ ان سب پر بشرح مختلف محصول درآمد قائم ہے۔

محصول
کرور گیری کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک تو وہ جو بحساب قیمت سامان وصول
کی جائے۔ مثلاً قیمت کی ۵ فیصدی۔ دوسرے وہ جو بلا لحاظ قیمت بحساب
پیمانہ وصول کی جائے۔ مثلاً ایک روپیہ من، ہندوستان میں بہت سی چیزوں
پر محصول درآمد ۵ فی صدی بحساب قیمت وصول کیا جاتا ہے۔ کرور گیری میں
جو چیزیں شامل ہیں ان کی مکمل فہرست ہر سال دسمبر میں شائع ہوتی ہے۔

تمام سوتی پارچے پر محصول درآمد ۳ ½ فی صدی بحساب قیمت وصول ہوتا
تھا۔ دوران جنگ میں اس کو بڑھا کر ۷ ½ فی صدی کر دیا۔ اسی طرح سرکہ اور
ناریل پر ۲ ½ فی صدی لوہے اور فولاد پر ایک فی صدی اور کیمیائی چیزوں
اور ادویات پر ۲ ½ سے ۵ فی صدی تک محصول درآمد قائم ہے اشیائے ذیل
معافی کی فہرست میں درج ہیں یعنی ان پر کرور گیری معاف ہے۔ ریل کا سامان
مشین اور کلیں، سونے کی اینٹ اور سکے، جانور، خورد و نوش کی بعض چیزیں،
اون خام، روئی خام۔ سوت، کتابیں، جہاز، کھاد، کوئلہ اور چند دوسری
چیزیں ارجنٹائن اور ڈنمارک سے جو شکر آتی ہے اس پر خاص بتوازن
محصول درآمد وصول کیا جاتا ہے۔

محصول
چانول پر ۳ آنے من کے حساب سے محصول برآمد قائم ہے اس طرح
جس قدر چاء ہندوستان سے باہر جاتی ہیں۔ اس پر ¼ پائی فی پونڈ محصول
لیا جاتا ہے، لیکن اس کی آمدنی مجلس چاء کے سپرد کر دی جاتی ہے تاکہ وہ
اس کو ہندوستانی چاء کی ترقی میں خرچ کرے۔ ان محصولوں میں ایک حد
تک یہ اصول بھی مضمر ہے کہ جن چیزوں کی پیدا وار ملک کے واسطے مخصوص
ہو ان ہی پر محصول برآمد لگانا مفید ہے۔ اس اصول کے مطابق جوٹ پر
بھی محصول برآمد ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۱۶ء سے جوٹ خام اور جوٹ
کی مصنوعات پر محصول برآمد قائم ہوگیا۔

سودیشی سوتی پارچے پر جنگی

ہندوستان کے کارخانوں میں جو سوتی کپڑا تیار ہوتا ہے اس پر بھی ۳ ½
فی صدی بحساب قیمت جنگی مقرر ہے۔ ولائیتی کپڑے پر جو ۳ ½ فی صدی
محصول درآمد قائم تھا اور اس سے جو تھوڑا بہت امن سودیشی کپڑے کو مل سکتا
تھا۔ اس جنگی نے وہ بھی نہ رکھا کہتے ہیں کہ لنکاشائر کے کارخانوں کے دباؤ سے
یہ محصول قائم کیا گیا تھا۔ اور یہاں کے کارخانے اس محصول سے بہت ناخوش
ہیں۔ دوران جنگ میں جو سوتی پارچے پر محصول درآمد ۷ ½ فی صدی کر دیا تھا
ولائیتی کارخانے بہت چراغ پا ہو رہے ہیں۔ اور اندیشہ ہے کہ سرکار ان کی خاطر
پھر محصول درآمد گھٹا دے۔

کروڑگیری کی حالت

ہندوستان میں کروڑگیری سے تقریباً ۱۱ کرور روپیہ وصول ہوتا ہے۔
درآمد میں سوتی پارچہ سب سے زیادہ آمدنی کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔ کروڑگیری
کی تحصیل تغیر پذیر ہے۔ اور صنعت و تجارت کی ترقی سے خود بخود بڑھ جاتی
ہے۔ محصول سوائے نمک اور مٹی کے تیل کا محصول ایسا ہے کہ ہر امیر اور
غریب طبقے پر اس کا بار پڑتا ہے سوتی پارچے کا محصول بھی آبادی کے بہت
بڑے حصے سے وصول ہوتا ہے۔ محصول شکر بیشتر متوسط طبقے کی جیب سے
آتا ہے۔ اور باقی محصول کا بار خاص خاص طبقوں پر رہتا ہے۔ محصول شراب
سے مے نوشی گھٹتی تو ہے لیکن برائے نام۔

محصول آمدنی

محصول آمدنی کے تعین میں محصول متزائد کے اصول پر عمل ہوتا ہے۔
ہزار روپے سالانہ سے کم آمدنی پر محصول معاف ہے۔ واضح ہو کہ انگلستان
میں معاف آمدنی کی مقدار تقریباً ڈھائی ہزار روپیہ سالانہ ہے جو آمدنی
تنخواہ پنشن یا تمسکات کے سود سے حاصل ہو اس پر دو ہزار روپے سالانہ
سے کم تک ۴ پائی فی روپیہ اور دو ہزار سے اوپر ۵ پائی فی روپیہ محصول لیا
جاتا ہے اور اس طرح آمدنی کی مقدار بڑھنے سے شرح بھی بڑھتی جاتی ہے۔
کمپنیاں اور کارخانے اپنے خالص منافع پر ۵ پائی فی روپے کے حساب
سے محصول ادا کرتے ہیں۔ جو آمدنیاں دوسرے ذرائع سے حاصل ہوں۔
ان کے محصول کا معیار کچھ اور ہے۔ لیکن اصول اس کا بھی وہی ہے مثلاً

ہزار روپے سے ایک کم دو ہزار تک محصول کی مقدار ۲۰ اور ۳۲ روپے کے درمیان رہتی ہے۔ زمین مزروعہ اور زراعت سے جو آمدنی حاصل ہو وہ محصول آمدنی سے الگ رہتی ہے۔ اس پر مالگزاری کے نام سے محصول لیا جاتا ہے۔

محصول آمدنی سے تقریباً ۲ ۳/۴ کرور روپیہ وصول ہوتا ہے۔ محصول کی اس قلیل مقدار سے صاف ظاہر ہے کہ خوش حال لوگ جن سے یہ محصول وصول ہوتا ہے ہندوستان میں بہت کم ہیں اس محصول کو ملک کی معیشت کا معیار سمجھنا چاہیئے۔ مرفہ الحالی بڑھنے سے اس میں بھی اضافہ ہوتا ہے ہندوستان میں اس مد کی آمدنی کچھ تیز رفتاری سے بڑھتی نظر نہیں آتی۔

رجسٹری — محصول رجسٹری دو قسم کی دستاویزوں سے وصول ہوتا ہے۔ اوّل وہ کہ جن کی رجسٹری قانوناً لازمی ہو۔ دوسری جن کی رجسٹری اختیاری ہو۔ فی الجملہ جسقدر دستاویزیں انتقال جائداد غیر منقولہ سے متعلق ہوں ضرور رجسٹری ہوتی ہیں۔ اس مد سے کوئی پچھتر لاکھ روپیہ سالانہ وصول ہوتا ہے فیس بحساب قیمت لگتی ہے۔

جنگلات — تحصیل جنگلات کی چند صورتیں ہیں۔ لکڑی اور دوسری پیداوار کا حق شاہی یا محصول جو دوسرے سے وصول کیا جائے یا اس کی قیمت جو فروخت سے حاصل ہو مویشی چرانے یا ایندھن کوئلہ، بانس، بینت، اور دوسری پیداوار نکالنے کے اجازت ناموں کی فیس، جنگلات کے محاصل خام کی مقدار سوا تین کرور روپے سے کچھ زیادہ رہی۔ جنگلات کی حفاظت اور نگہداشت ملک کے حق میں جس قدر مفید ہے۔ اس کی اہمیت اس سے قبل بیان ہو چکی ہے۔

غیر محصولی آمدنی — محصول کے علاوہ آمدنی کی جو دوسری صورتیں ہیں۔ ان میں ریل سب سے اوّل نمبر ہے۔ ریلوں کی سالانہ خالص آمدنی ۲۶ کرور روپے کے قریب ہے جس میں تخمیناً ۶ کرور خالص منافع سمجھنا چاہیئے۔ آبپاشی کی محض تحصیل ساڑھے پانچ کرور روپے کے قریب ہے۔ اس میں ڈیڑھ کرور خالص منافع شامل ہے۔ عدالتوں، ڈاک خانہ، اور تار سے بھی سرکار کو بچت ہوتی ہے۔ ۹۳ لاکھ روپے کے قریب سرکار ہند کو دیسی ریاستوں سے

خراج بھی ملتا ہے۔

محاصل کی مجموعی مقدار

تحصیل محض کی مجموعی مقدار ایک ارب چھبیس کرور کے قریب ہے۔ اور تحصیل خالص کی ۷۵ کرور۔ واضح ہو کہ مداخل و مخارج محض میں تو کل آمدنی اور اخراجات شامل رہتے ہیں۔ البتہ ریلوں کے چلانے کے اخراجات، مخارج میں شمار ہونے کے بجائے مداخل میں سے منہا ہو جاتے ہیں، اس کے برعکس مداخل اور مخارج خالص میں ریلوں کے اصل کا سود، ان کے چلانے کے اخراجات آبپاشی کے اصل کا سود اور اس کے محکمے کے اخراجات، افیون کی کاشت اور تیاری کے اخراجات، اور آمدنی اور محکموں کے یعنی جن سے مستقل آمدنی وصول ہوتی ہے۔ ان کے اخراجات۔ یہ سب کے سب مداخل میں سے منہا کر دیئے جاتے ہیں۔ اور ساتھ ہی خرچ کے محکموں میں اگر کچھ تھوڑی بہت آمدنی ہوتی ہے تو وہ مخارج میں سے منہا کر دیتے ہیں۔ گزشتہ نصف صدی کے اندر مداخل دو چند ہو گیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مداخل بڑھنے سے کہاں تک مرفہ الحالی کے اضافے کا ثبوت ملتا ہے۔ مختلف لوگ اور گروہ اس کے مختلف جواب دیتے ہیں۔ سرکاری حکام تو یہی کہیں گے کہ بے شک خوش حالی میں ترقی ہو رہی ہے۔ لیکن محبان وطن کو شکایت ہے کہ صرف سرکار کی طمع اور سخت گیری سے مداخل اس قدر بڑھ گیا ہے۔

بار محصول

سرکاری حساب سے تو محصول کا بار ۲ روپے ۱۱ آنے ۴ پائی فی کس پڑتا ہے۔ اور اگر مال گزاری نکال دو تو ایک روپیہ ۷ آنے ۲ پائی رہ جاتا ہے۔ ایک حساب سے اس بار کی مقدار علی الترتیب ۳ روپے ۳ آنے اور ایک روپیہ ۵ آنے قرار پاتی ہے۔ لیکن مالگزاری منہا کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ محصول دینے کی استطاعت جس قدر کم ہندوستانیوں میں ہے۔ دنیا کی کسی مہذب قوم میں نہیں۔ محصول کا بار اوسط آمدنی کے ۹ فی صدی رہتا ہے۔ محصول کی بحث درحقیقت بہت پیچیدہ ہے۔ خصوصاً تادیۂ محصول کی تحقیق نہایت نازک ہے یعنی یہ کہ محصول

کا بار ادا کرنے والے پر قائم رہتا ہے۔ یا دوسروں پر کلاً یا جزواً منتقل ہو جاتا ہے۔ البتہ اس قدر تحقیق ہے کہ جو محصول معاشی ما حصل زائد پر قائم ہوتا ہے وہ منتقل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ما حصل زائد مصارف پیدائش کا جزو نہیں ہوتا

ہندوستان کی مجموعی تحصیل سلطنت متحدہ جیسے دولت مند ملک کی نصف تحصیل سے بڑھی رہتی ہے اس قدر تحصیل ہندوستان کی مالی حالت کے لحاظ سے بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن سرکاری حکام کا عذر یہ ہے کہ ہندوستان کی آبادی بھی تو گھنی ہے اور یہاں سرکار کو بہت سے ایسے کام بھی انجام دینے پڑتے ہیں جن سے انگلستان میں سرکار کو کچھ تعلق نہیں۔ معترضین اس پر یہ جواب دیتے ہیں کہ یہاں آبادی گھنی سہی۔ لیکن قومی آمدنی کی تعداد تو سلطنت متحدہ ہی میں بہت زیادہ ہے۔ محصول کا بار تو آمدنی کے حساب سے قرار پاتا ہے۔ اور اس لحاظ سے انگلستان کے مقابل ہندوستان میں بار بڑھا ہوا ہے۔ اگر شرح یکساں بھی ہوتی تو انگلستان کے دولت مند لوگوں کے مقابل غریب ہندوستانیوں کو محصول زیادہ بار معلوم ہوتا۔ رہا۔ دوسرا عذر سو اس میں شک نہیں کہ یہاں سرکاری ریلوں وغیرہ کا انتظام خود سرکار کو کرنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ کام ایسے نہیں جو کسی طرح باعث زیر باری ہوں۔ بلکہ ان سے تو سرکار کو الٹا منافع ملتا ہے۔ ایک مزید اعتراض یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ سلطنت متحدہ میں سرکار اصلاح معاشرت کی کیسی کیسی تدابیر نکال رہی ہے مثلاً وظیفۂ پیری یا لازمی بیمہ۔ سرکار ہند اس طرف ذرا بھی توجہ نہیں کرتی۔ اس کے علاوہ یورپ و امریکہ میں تعلیم۔ صفائی ترقی علوم و فنون۔ اور ایسے ہی کاموں میں جس قدر بے حساب رقم خرچ ہو رہی ہے۔ ہندوستان میں اس کے عشر عشیر بھی خرچ نہیں ہوتی۔

مصارف عامہ کا بنیادی اصول بہبود عامہ ہونا چاہیئے۔ مصارف کو مختلف مدوں میں اس طرح تقسیم کرنا چاہیئے کہ عوام کو ہر مد کے مصارف سے بیشترین افادہ حاصل ہو۔

سالانہ مصارف میں محض کی مقدار ایک ارب ۲۴ کرور کے قریب ہے

اور خالص مصارف کی تقریباً ۴۷ کروڑ وزیر مال اپنی سالانہ مالی کیفیت میں بقدر چند کرور روپے بچت کی گنجائش چھوڑ دیتا ہے۔

مصارف کی خاص مدیں یہ ہیں (۱) سرکاری قرضہ (۲) فوجی انتظام (۳) تحصیل کے اخراجات (۴) سول یا دیوانی محکموں کی تنخواہیں اور اخراجات (۵) امداد قحط اور بیمہ (۶) تعمیرات کے اخراجات (۷) متفرق سول یا دیوانی اخراجات۔

سرکاری قرضے کے مصارف میں ذیل کی مدوں کا سود شامل ہے:۔ (۱) معمولی قرضہ (۲) ریلوے کا قرضہ (۳) آبپاشی کا قرضہ (۴) دوسری واجب الادا رقمیں۔ خالص مصارف کی مجموعی مقدار ڈیڑھ کرور روپے کے قریب رہتی ہے۔

۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء کو سرکاری قرضے کی مجموعی مقدار ۴ ارب ۱۲ کرور روپے کے قریب تھی۔ مسٹر گوکھلے آنجہانی کا قول ہے کہ سرکار ہند کی ریلیں نہریں مقامی جماعتوں دیسی ریاستوں اور کاشتکاروں کو سرکار جس قدر قرض دیتی ہے اور خود اس کے پاس جو نقد فاضلات رہتی ہیں۔ یہ سب گویا اس قرضے کی ضمانت ہیں۔ اس میں سے تقریباً دو ارب ۷۰ کرور روپیہ تو انگلستان نے دیا۔ اور ایک ارب ۴۲ کرور سے کچھ زیادہ ہندوستان سے ملا۔ ۳۱ مارچ ۱۹۱۳ء سرکاری قرضے کا حساب حسب ذیل تھا۔

(أ) مستقل قرضہ:۔

(۱) تعمیرات:۔

| | |
|---|---|
| ریلوے کا قرضہ | ۲۱۱۸۳۲۸۱۹ پونڈ |
| آبپاشی کا قرضہ | ۳۷۵۵۲۰۳۰ پونڈ |
| دارالسلطنت دہلی کا ابتدائی خرچ | ۱۱۹۸۸۶ پونڈ |
| میزان قرضہ تعمیرات | ۲۴۹۵۰۴۷۳۵ پونڈ |
| (۲) معمولی قرضہ | ۲۴۸۹۸۷۷ پونڈ |
| میزان قرضہ مستقل | ۲۷۴۴۰۳۵۱۲ پونڈ |

(ب) میعادی قرضہ۔

سرکاری قرضہ یا قومی قرضے کی دو قسمیں اور بھی ہیں۔ ذخیرہ دار یا فنڈ کا قرضہ اور بے ذخیرہ یا بے فنڈ قرضہ یہاں طلائی قرضہ یعنی جو انگلستان سے بشکل ساورن وصول ہوا۔ اور نیز روپے کا قرضہ ذخیرہ دار شمار ہوتا ہے۔ لیکن سیونگ بنک یا سروس فنڈ کا زر امانت قرضۂ بے ذخیرہ میں داخل ہے۔

بار قرض

ہندوستان جیسے غریب ملک کے واسطے اس قدر سرکاری قرضہ یوں تو گراں بار معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی پانچ چوتھائی مقدار ایسے کاموں میں لگی ہوئی ہے کہ اس سے سرکار کو معتدبہ آمدنی حاصل ہوتی ہے۔ پس اسکو بار کیونکر کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً ریل اور نہروں کی تیاری میں اس قرضے سے بہت مدد ملی ہے آیا سرکار بھی صنعتی کاروبار میں کچھ حصہ لے یا نہیں۔ اس معاملے میں بہت اختلاف رائے پھیلا ہوا ہے۔ لیکن ایک فائدہ تو صریح نظر آتا ہے۔ وہ یہ کہ دوسروں کے مقابل ایسے کاموں کے واسطے سرکار کو کمتر سود پر قرض ملسکتا ہے۔ چنانچہ اس وقت بھی ہندوستان کی ساکھ بہت اچھی بنی ہوئی ہے۔ اسکے بیشتر قرض کی شرح سود ۳½ فی صدی ہے۔ حالانکہ روس، جاپان، چین، ترکی، ان کو ۴ سے ۷ فی صدی تک سود پر قرض ملتا ہے۔

سرفلیٹ و... کی واسطے...

قرضے کی سرگزشت یہ ہے کہ ایک ارب ۷ کرور روپے کا قرضہ تو ایسٹ انڈیا کمپنی سے سرکار ہند کے ذمے منتقل ہوا۔ چنانچہ یہ اعتراض بھی ہوتا ہے کہ تجارتی کمپنی نے جو قرض لیا تھا اس کا بار غریب ہندوستانیوں کے گلے کیوں پڑا۔

بڑھتے بڑھتے قرضہ اس حد تک پہنچ گیا۔ سود کا بار بھی ساتھ ساتھ بڑھا۔ لیکن محصول دہندہ پر اس بار کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ کیونکہ جو قرضہ ریل اور آبپاشی جیسے منافع کے کاموں میں لگا ہوا ہے اس کی مقدار برابر بڑھ رہی ہے۔ پس منافع میں سے سود ادا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سر فلیٹ وڈ ولسن نے ۱۹۰۷ء میں یہ فرمایا تھا کہ بے منافع قرضہ جس کی مقدار اس وقت سے بیس سال قبل مجموعی قرضے کی نصف تھی۔ اس عرصے کے اندر اندر مجموعی قرضے کا ساتواں حصہ رہگئی۔ باقی کل قرضہ با منافع بن گیا۔ یعنی وہ ریل، آبپاشی، جیسے کاموں میں لگ کر

آمدنی کا ذریعہ بن گیا۔ لوگ تو قرض کی اسی مقدار کو بہت زیادہ خیال کرتے ہیں لیکن مسٹر گوکھلے آنجہانی کو اس کی مقدار اور بڑھانے میں بھی کوئی تامل نہ تھا بشرطیکہ قرضہ بہبود عامہ میں صرف کیا جاتا۔

**قرضہ اور چند اصول**

قرضے سے مصارف نکالنے میں سرکار کو چند اصول ملحوظ رکھنے ضروری ہیں، وہ یہ کہ (۱) معمولی مصارف معمولی آمدنی سے نکلنے چاہئیں (۲) جس ترقی کا فائدہ موجودہ نسل پر ختم ہو جائے۔ اس کے واسطے قرضے کا بار آیندہ نسلوں پر نہ ڈالنا چاہیئے (۳) البتہ جس کام کا فائدہ آیندہ نسلوں کو پہنچ سکے اس کے واسطے قرض لینے میں مضائقہ نہیں (۴) اگر کوئی کام خلاف توقع یکایک ایسا پیش آجائے کہ معمولی آمدنی سے اس کے مصارف پورے نہ ہوں، اور اضافۂ محصول کی گنجائش کم ہو تو مجبوراً قرض لے لینا چاہیئے بہرحال جہاں تک ہو سکے قرضے کی مقدار کم رکھیں۔

**امداد قحط اور بیمہ**

امداد قحط اور بیمے کی مد میں سرکار ہر سال ڈیڑھ کروڑ روپے لیکر قومی قرضہ ادا کر دیتی ہے دراصل اس رقم کا منشا یہ تھا کہ تعمیرات کے ایسے کاموں میں صرف کی جائے جن سے قحط کا خطرہ گھٹے۔ دوسرے اس سے قرض ستانی روکی جائے یا قرضہ ادا ہو۔ بعض ہندوستانی مدبرین کا خیال ہے کہ اس رقم کو حقیقی بہبود عامہ میں صرف کرنا چاہیئے مثلاً زراعتی تعلیم۔ دیہاتی قرضوں کا انتظام یا ایسے ہی دوسرے کام جن سے کاشتکاروں کا تمول بڑھے۔ نہ یہ کہ اس رقم سے قرضہ ادا ہوا کرے مگر سرکار ایسی باتوں پر کب توجہ کرتی ہے۔

مصارف کی دوسری مد فوجی انتظام ہے اس میں ہر سال تقریباً ۲۲ کروڑ روپیہ صرف ہوتا ہے یعنے مجموعی محاصل خالص کا ۳۴ فیصدی۔ ہندوستانی وطن پرست تو بہت کچھ شور مچاتے ہیں کہ فوجی اخراجات کا بار بہت زیادہ ہے لیکن سرکار اس کو ناگزیر قرار دیتی ہے یہ جو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہندوستان کو امن و امان کا بہت زیادہ معاوضہ تو ادا نہیں کرنا پڑتا۔ مختلف لوگ اس کے مختلف جواب دیتے ہیں معترضین کا تو خیال یہ ہے کہ بلا خوف و خطر فوجی انتظام کے مصارف میں اچھی خاصی تخفیف ہو سکتی ہے۔ اول تو

بات یہ ہے کہ ہندوستان کی فوجوں سے انگلستان کو بہت کچھ تقویت حاصل ہے۔ ہندوستانی فوجیں نہ صرف ایشیا بلکہ افریقہ اور یورپ تک میں انگلستان کی طرف سے جا جا کر لڑتی ہیں۔ پھر کیا یہ قرین انصاف نہ ہوگا کہ یہاں کے فوجی اخراجات کا کچھ حصہ انگلستان بھی دے۔ دوسرے زیادہ تر خرچ انگریزی فوجوں کا ہے۔ اگر ان کے بجائے ہندوستانیوں کی فوجیں بھرتی کرلی جاویں تو مصارف میں بہت تخفیف ہو سکتی ہے۔ مجموعی مصارف میں سے تقریباً ۳۰ کرور تو فوج پر خرچ ہوجاتا ہے اور باقی دو کرور روپیہ بیڑے، فوجی عمارتوں، اور مدافعت کے خاص خاص انتظاموں میں کام آتا ہے۔

تحصیل حسابات میں مصارف بلاواسطہ کے عنوان سے جو خرچ درج ہوتا ہے اس کا بڑا حصہ تحصیل کے اخراجات ہوتے ہیں۔ مصارف کی یہ سب سے ناگزیر مد ہے۔ اس کی مقدار ۱۴ کرور کے قریب رہتی ہے۔ یعنی مجموعی تحصیل خالص کے ۱۸ فی صدی اس مد میں تخفیف کی گنجایش ضرور موجود ہے۔

مصارف کی دوسری مد میں سول یا دیوانی محکموں کی تنخواہیں اور متفرق اخراجات شامل ہیں۔ مصارف کی مقدار تقریباً ۲۷ کرور رہتی ہے۔ سول محکموں کی مختصر تقسیم یہ ہے۔

(۱) عام انتظام (۲) عدالت (۳) پولس
(۴) بناور (۵) تعلیمات (۶) امور مذہبی
(۷) طبابت (۸) امور سیاسی (۹) سائینس کے اور متفرق چھوٹے چھوٹے محکمے۔ بہبود عامہ کے لحاظ سے ان میں تعلیمات اور طبابت سب سے زیادہ اہم ہیں۔ تعلیمات کے کل شاہی اور صوبہ وار مصارف کی مقدار پونے ۵ کرور روپیہ ہے۔ یعنی مجموعی مصارف کے ۴ فیصدی سے بھی کم۔ طبابت کے مصارف ۲ کرور کے قریب ہیں۔ گویا مجموعی مصارف کے $1\frac{3}{4}$ فی صدی۔ اول تو ان مدوں کے واسطے

یہ مصارف بہت کم ہیں۔ دوسرے ان کی بھی بیشتر مقدار گراں کار حاکموں کی بڑی بڑی تنخواہوں میں اڑ جاتی ہے۔ حالانکہ ملک کو ان کی خدمات سے کوئی بڑا فائدہ نہیں پہنچ رہا۔ گزشتہ ۱۵ سال کے اندر اندر سول مصارف میں ۵۰ فی صدی اضافہ ہو گیا۔ جہاں تک یہ رقم بہبود عامہ کے کاموں میں صرف ہوتی ہو، کسی کو چون و چرا کرنے کا حق نہیں لیکن خرابی تو یہ ہے کہ اس کا بڑا حصہ محکموں اور عہدوں کے فضول اضافے پر صرف ہوا۔ کچھ عرصے سے سرکار کا یہ رجحان بڑھ رہا ہے کہ بلا ضرورت بھی نمود و نمائش کی غرض سے نئے نئے عہدے اور محکمے مقرر کر دیتی ہے۔ حالانکہ موجودہ انتظام میں بھی تخفیف کی گنجائش باقی ہے۔ مثلاً قسمتوں کے کمشنر، انسپکٹر جنرل اکسائز یا صدر ناظم جنگی، سرکار ہند کا ناظم صفائی، یہ عہدے غیر ضروری سے ہیں۔ دوسرے اگر یورپ والوں کے بجائے ہندوستانی لوگ اعلیٰ عہدوں پر مقرر ہوں تو تنخواہوں میں معتد بہ کمی ہو سکتی ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء سے لے کر سنہ ۱۹۰۶ء تک سرکار کو ہر سال معتد بہ رقم بچتی رہی۔ اس کا اثر برا پڑا یعنی سرکار نے مصارف رجعی کی مقدار بہت بڑھا دی۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد حقیقت کھل گئی۔ یعنی جب شاخل افیون میں کمی ہوئی اور مشرقی بنگال اور آسام کا نیا صوبہ بنا (گو بعد کو ٹوٹ گیا) تو آخر سرکار کو جدید محصول قائم کرنا ہی پڑا۔

سرکار ہند کو جو تنگدستی پیش آئی تو اس کا ایک باعث صوبہ دار حکومتوں کی فضول خرچی بھی تھا۔ مجبور ہو کر سنہ ۱۹۱۰ء میں وزیر مال نے صوبہ دار حکومتوں سے بہ دلسوزی تمام استدعا کی کہ کفایت شعاری کرنا چاہیئے۔ سنہ ۱۹۱۱ء کا ذکر ہے کہ مسٹر گوکھلے آنجہانی نے شاہی مجلس وضع قوانین میں ایک تحریک پیش کی کہ اضافہ مصارف کی تحقیقات کے واسطے ایک کمیشن مقرر ہونا چاہیئے، اگرچہ تحریک مسترد ہو گئی تاہم اضافے کی واقعیت سے کوئی انکار نہ کر سکا۔ کمیشن مقرر کرنے کے بجائے وزیر مال نے صرف یہ وعدہ کر لیا کہ تمام اعلیٰ حکام اپنے اپنے محکموں کے مصارف کی پڑتال کر کے جہاں تک ہو سکے گا کفایت شعاری پر عمل کریں گے وزیر ہند نے بھی غیر ضروری مصارف گھٹانے کی سخت تاکید کر دی

باب ۱۳ متفرق سول اخراجات تعمیرات

متفرق سول مصارف کی اب ایک جداگانہ مد قرار پاگئی ہے، اس میں ملکی اور سیاسی وظیفے، سول کے رخصت اور غیر حاضری کے بھتے، پیرانہ سالی کے بھتے، اور وظیفے، کاغذ پتر اور طباعت، یہ سب اخراجات شامل ہیں، ان کی مجموعی مقدار ۷ ۱/۲ کرور ہے۔ بس یہاں سے تقریباً یک نصف انگلستان میں صرف ہوجاتی ہے، مصارف تعمیرات میں ریلوں، نہر نالوں، اور سول عمارتوں کی تیاری اور کارستانی کے اخراجات شامل ہیں۔ تقریباً ۲۷ کرور روپیہ تو ہر سال ریلوں پر خرچ ہوجاتا ہے۔ ۷ کرور ذرائع آبپاشی پر اور تقریباً ۵۰ لاکھ سول عمارتوں پر،

اگر بچت اور کفایت سرکار اپنا مقصد قرار دے لے۔ اور فضول اخراجات کو روکے تو بہبود عامہ کے کاموں کے واسطے کافی رقم مل سکتی ہے۔ مثلاً تعلیم ہے، صفائی ہے، اصلاح تمدن ہے۔

ولبی کمیشن اولبی کمیشن کے اراکین کی قلیل جماعت نے مصارف ہندوستان کی موجودہ حالت اور طریق اصلاح مفید عام کے متعلق ہندوستانی مدبرین کی راے کا خلاصہ حسب ذیل پیش کیا ہے۔

(۱) یہ کہ ہندوستان کے مصارف عموماً یا خصوصاً ہندوستان کی مصلحت اور مفاد پر مبنی نہیں۔ ذیل کی مثالوں سے اس قول کی پوری تصدیق ہوتی ہے،

(ا) اول تحفظ ہند کو لیجئے۔ ہندوستان کی سرحدی پالیسی کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالئے۔ اس کا مقصد زیادہ تر یہ ہے کہ سرحد کے دوسری طرف بھی سرکار کا قبضہ پھیلے۔ ورنہ تحفظ ہند کے واسطے اس قدر انتظام درکار نہیں، نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان پر مصارف کا بار بڑھ رہا ہے اور نہ معلوم کہاں تک بڑھے۔

(ب) ملک کی ضروریات اور ذرائع کا لحاظ کئے بغیر خواہ مخواہ ریلیں پھیلانا، بظاہر تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے ملک کی صنعتی ترقی مقصود ہے لیکن درحقیقت باقی انتظامات جن کے بغیر ریل سے یہ مقصد پورا نہیں ہوسکتا بالکل مفقود ہیں۔

(ج) تنخواہ۔ ترقی اور وظیفے کے باب میں یورپین ملازموں کے ساتھ

رعایت پر رعایت کرنا خواہ وہ سول عہدہ دار ہوں یا فوجی۔ ان رعایتوں سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ یہ ملک ملازموں کی پرورش کے واسطے ہے نہ کہ ملازم اسکی خدمت کے واسطے۔ گزشتہ چند سال کے اندر مصارف میں جس قدر اضافہ ہوا وہ زیادہ تر انھی مدوں میں نظر آتا ہے اسی بنا پر تو ہندوستانی لوگ شاکی ہیں کہ سرکار ہندوستان کی بہبود و مفاد کو توسیع سلطنت، برطانوی تجارت اہل یورپ کی ملازمت کے تابع کیوں رکھتی ہے۔

(۲) یہ کہ ہندوستان کا روپیہ خرچ کرنے میں نہ تو مناسب احتیاط کیجاتی ہے اور نہ پوری کفایت شعاری، چنانچہ ذیل کی مثالوں سے اس واقعے کی تائید ہوتی ہے۔

(ا) سول محکموں، مثلاً عدالت، پولس، طبابت، ڈاک، تار، وغیرہ میں بھی اب تک بہت کم ہندوستانی اعلیٰ عہدوں پر مقرر ہو سکے۔ حالانکہ اہتمام کرنے سے قابل ہندوستانی مل سکتے تھے۔

(ب) نگران کار مرکزی جماعتوں کی ضرورت سے زیادہ کثرت، صفائی۔ پولس۔ محبس۔ اسٹامپ۔ رجسٹری۔ سب محکموں میں یہی حال نظر آتا ہے۔

(ج) ہندوستان میں ہمیشہ جنگی پیمانے پر فوجیں تیار رکھی جاتی ہیں اور کمک اور ملیشیا یا ردیف کے طریق سے فائدہ نہیں اُٹھایا جاتا۔ یعنی یہ کہ لوگوں کو فوجی تربیت دیکر اس قابل بنادیں کہ وقت ضرورت ان سے فوجی امداد مل سکے۔ ہندوستان کا طریق تحفظ اس قدر فضول خرچ ہے کہ مدت ہوئی دوسرے ملکوں نے تو اس کو بالکل ترک کر دیا۔

(د) ہندوستانی رسالوں کے مقابل برطانوی رسالوں کی تعداد حد سے بڑھی نظر آتی ہے۔

(ہ) پھر ہندوستانی رسالوں پر بھی اکثر انگریزی افسر مقرر ہیں، ہندوستانی افسر خال خال نظر آتے ہیں، فرق تنخواہ کی وجہ سے ہندوستان کے مالیات پر اس کا بھی کچھ کم اثر نہیں پڑتا۔

(و) ریلوے کمپنیوں کے ساتھ شرائط معاہدہ بھی بہت زیادہ نرم ہیں اور

رہا نہیں الگ۔
(۳) یہ کہ ہندوستان کے اخراجات کی تقسیم ناقص ہے۔ مثلاً
(أ) ملک کے تحفظ کے نام پر تو اس قدر کثیر رقم صرف کی جاتی ہے اور ملک کی مالی اور اخلاقی ترقی اور سول حکومت کی اصلاح کے واسطے مقابلۃً بہت کم خرچ نکلتا ہے۔
(ب) ملک کی موجودہ حالت کے لحاظ سے جس قدر شاہی معاملات پر خرچ ہوتا ہے بہت زیادہ ہے اور جس قدر صوبہ دار کاموں پر وہ بہت کم۔ درحقیقت صوبہ دار کاموں کو لوگوں کی بہبود سے قریبی تعلق ہے اور شاہی معاملات کا ان پر اس قدر اثر نہیں پڑتا۔
(ج) لوگوں کے ذرایع آمدورفت کی توسیع اور درستی میں تو اس قدر دل کھولکر خرچ کرتے ہیں اور خود لوگوں کی حالت سدھارنے اور قابلیت بڑھانے کے واسطے روپیہ کم ملتا ہے۔
مذکورۂ بالا اعتراضات کے قطع نظر مصارف ہندوستان کی موجودہ مقدار پر ایک سب سے بڑا اعتراض یہ بھی وارد ہوتا ہے کہ وہ ملک کی حیثیت اور استطاعت سے بہت زیادہ ہے اور اس کا برداشت کرنا دشوار ہو رہا ہے حکومت کی طرف سے انگلستان میں جو کچھ صرف ہوتا ہے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے

مطالبات

(۱) سرکاری قرضے کا انتظام اور سود، ریلوے اور ذرایع آبپاشی پر سود اور سالیانہ ــــــــــ ۱۷ ½ کرور
(۲) ہندوستان کے سول محکموں کے متعلق ادائگی ــــــــــ ¼ کرور
(۳) دفتر وزیر ہند کا خرچ (بلا شمار وظیفہ جات) ــــــــــ ⅒ ״
(۴) فوجی اور بحری کار پرداز مصارف ــــــــــ ۱ ¾ ״
(۵) ہر قسم کا سامان جس کی قیمت مداخل سے وضع ہوئی ــــــــــ ۲ ¼ ״
(۶) رخصتی بھتے ــــــــــ ۱ ½ ״

(۷) غیر کارپرداز مصارف یعنی وظیفے اور انعام —— ۷ کروڑ

میزان تقریباً —— ۳۰ ۳/۴ کروڑ

حکومت ہند کی طرف سے جو رقم انگلستان میں صرف ہوتی ہے سنہ ۱۹۱۱-۱۲ء کے بعد سے وہ بقدر ۶ کروڑ روپیے سالانہ بڑھ گئی ہے۔

مدت سے مطالبات وطن پر نکتہ چینی اور اعتراض ہو رہے ہیں۔ نہ صرف ہندوستانی مدبّر بلکہ بہت سے انگریز بھی اس مد کو افلاس ہند کا خاص باعث قرار دیتے ہیں۔ اور بعض کا خیال ہے کہ مطالبات وطن ایک طرح کا خراج ہے جو انگریز ہندوستان سے وصول کرتے ہیں۔ مسٹر جے۔ ایس ل کا جو مشہور مقولہ ہے کہ بین الاقوامی لین دین میں اگر کسی رقم کا معاوضہ بشکل سامان یا زر وصول نہ ہو تو وہ خراج کا حکم رکھتی ہے۔ اس سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے اس کے علاوہ سر جارج اونگیٹ آج سے مدتوں پہلے فرما چکے ہیں کہ جو محصول کسی ملک سے وصول ہو کر اسی ملک میں صرف ہو اس کا اثر اس محصول سے بالکل مختلف ہوگا جو ایک ملک سے وصول ہوا اور دوسرے میں صرف کیا جاوے۔ آخری صورت میں یہ نہیں ہوتا کہ قومی آمدنی کا کوئی حصہ ایک جماعت سے دوسری جماعت کی طرف منتقل ہو جاوے بلکہ محصول کی کل رقم ملک کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ سر ٹامس منرو نے بھی اسی قسم کی رائے ظاہر کی ہے۔

سیاسی اور معاشی پہلو

معاشئین کی نظر میں مطالبات وطن کے دو پہلو قابل غور ہیں۔ ایک سیاسی اور دوسرا معاشی۔ جیسا کہ مندرجۂ بالا حساب سے واضح ہوتا ہے۔ ایک تہائی رقم تو انگلستان میں محض ان سیاسی تعلقات کی وجہ سے صرف ہوتی ہے جو اس ملک کے اور ہندوستان کے درمیان قائم ہیں۔ اور باقی دو تہائی رقم البتہ ایسے کاموں میں صرف ہوتی ہے۔ جن میں کچھ نہ کچھ معاشی کاروبار کی جھلک نظر آتی ہے۔ پس یہ خیال تو صحیح نہیں کہ مطالبات کی کل رقم ملک کی آمدنی میں چھیج کا حکم رکھتی ہے۔ لیکن پھر بھی بعض بعض مصارف فی نفسہ خواہ کیسے ہی جائز اور واجبی کیوں نہ ہوں، اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ہندوستان

کے مجموعی مداخل میں سے ۴۰ فی صدی سے زیادہ رقم بغیر کسی صاف صاف معاوضے کے ملک سے باہر چلی جاتی ہے کیا یہ حالت کچھ قابل اطمینان ہے۔ نہ صرف مطالبات وطن کا اضافہ روکنا ضروری ہے بلکہ ان کی اس مقدار میں بھی حتی التوسع تخفیف کرنی چاہیئے۔ بیسے سول مصارف مثلاً فوجی اور بحری اخراجات رخصتی بھتے، وظیفے، اور انعامات، سو ہندوستانی مدبرین کی رائے میں ان مصارف میں بھی بہت کچھ تخفیف ہو سکتی ہے اور ہونی چاہیئے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ملک کی حکومت اور حفاظت میں برطانوی لوگوں کے بجائے خود ہندوستانیوں کو خدمت کا موقع دیا جائے۔ اب سرکاری قرضے کو لیجیئے اسکے متعلق بھی ان کا یہ اصرار ہے کہ قرض لے لے کر ریل بنانے یا خریدنے کی کوئی ضرورت نہیں، اور اس وقت انگلستان کا جس قدر قرضہ ہندوستان پر ہے۔ اس کو بتدریج ادا کر دینا چاہیئے بلکہ ہو سکے تو ہندوستان سے قرض لیکر ادا کر دیا جائے۔ سرکار ہند کے واسطے ولایت میں جو کچھ سامان خریدا جاتا ہے اس کے متعلق بھی ہندوستان کی رائے یہ ہے کہ انگلستان میں جو اس کام کے واسطے ایک بڑا محکمہ قائم ہے اس کو توڑنا نہیں تو گھٹا دینا چاہیئے۔ تاکہ مطالبات وطن میں تخفیف ہو اور خود ہندوستانی صنعت و حرفت میں جان پڑے بالفاظ مختصر سرکار کے ہاں جس قسم کا سامان استعمال میں آئے حتی الامکان ہندوستان کا بنا ہوا ہو۔

نقد فاض — کام چلانے کے واسطے سرکار کچھ نقد رقم ہمیشہ اپنے پاس تیار رکھتی ہے۔ تجربے سے معلوم ہوا کہ کم سے کم ۴۰ لاکھ پونڈ یا ۶ کرور روپیہ بطور فاضلات لندن میں درکار ہوتا ہے۔ اور ایک کرور ۲۰ لاکھ پونڈ یا ۱۸ کرور روپیہ ہندوستان میں سنہ ۱۲-۱۹۱۱ء میں البتہ لندن میں فاضلات معمول سے بہت زیادہ بڑھی رہی۔ یعنی علی الترتیب ان کی مقدار لندن میں ایک کرور ۲۸ لاکھ ایک کرور ۶۷ لاکھ اور ایک کرور ۴۸ لاکھ پونڈ تھی، اور ہندوستان میں ایک کرور ۲۳ لاکھ ایک کرور ۳۵ لاکھ اور ایک کرور ۳۲ لاکھ پونڈ لندن میں اسقدر فاضلات رکھنے پر بہت اعتراض ہوئے۔ ایک تو یہ شکایت تھی کہ لندن کے

تاجروں کو مدد دینے کے واسطے بلا ضرورت بھی ہندوستان کا روپیہ ولایت میں روک رکھا ہے دوسرے یہ کہ گورنمنٹ بھی سخت تھی کہ سرکار ایک طرف تو خود قرض لیتی ہے اور دوسری طرف کمتر شرح سود پر لندن میں اپنے منظور نظر لوگوں کو قرض دے رہی ہے۔ معترضین نے دفتر وزیر ہند کے عہدہ داروں پر بدنیتی اور خود غرضی کے جو الزام لگائے گرچہ وہ مبالغہ آمیز ہیں، لیکن اسقدر مسلم ہے کہ وہاں کی حالت اچھی نہیں۔ اگر سرکار کے پاس ضرورت سے زیادہ روپیہ موجود ہو تو یا اس سے بہبود عامہ کے کام شروع کرنے چاہیئے، مثلاً عام تعلیم اور صفائی، یا قرض کے روکنے اور گھٹانے میں اس سے کام لینا جائے۔ اگر ایسا موقع ہو کہ سرکار تھوڑے عرصے کے واسطے روپیہ قرض دیسکے تو ہندوستانیوں کو بھی اس سے فائدہ پہنچنا چاہیئے، نہ یہ کہ صرف انگریز تاجروں کو قرض ملے اور ہندوستانی محروم رہیں۔

صوبہ وار مالیہ

اول اول تو یہ قاعدہ تھا کہ کل مداخل ایک مرکزی فنڈ میں جمع ہوتے اور اس میں سے صوبے صوبے کو حسب ضرورت تھوڑا تھوڑا حصہ مل جاتا تھا گو صوبہ وار حکومتیں خود ہی بیشتر مداخل تحصیل کرتیں اور خود ہی ان کا بڑا حصہ صرف میں لاتیں۔ لیکن چونکہ اس کارگزاری کی ترقی سے ان کو فائدہ اٹھانے کا اطمینان نہ تھا اضافہ تحصیل کی رفتار سست رہی۔ اور چونکہ کفایت شعاری سے بھی ان کو کچھ غرض نہ تھی، ان کے ہاں بہت فضول خرچی ہوتی رہی۔ مزید برآں مرکزی اور صوبہ وار حکومتوں میں برابر تکرار رہتی اور مصارف کی ذرا ذرا سی مدوں کے واسطے سرکار ہند سے منظوری لینی پڑتی تھی۔ ۱۸۷۱ء میں سر رچارڈ اسٹریچی کی تجویز پر عمل شروع ہوا بعض محکمے بالکل صوبہ وار حکومتوں کے اختیار میں دیدیئے گئے۔ ان محکموں سے جس قدر آمدنی ہو وہ اور اس کے علاوہ کچھ اور یکمشت رقم ان کو مصارف کے واسطے ملنے لگی۔ ۱۸۷۷ء میں سرکار ہند نے چند خاص خاص محکموں کے سوا جن کو اپنے ہاتھ میں رکھنا ضروری تھا۔ کل محکموں کا مالی انتظام صوبہ وار حکومتوں کے سپرد کردیا۔ ۱۸۸۲ء میں صوبہ وار انتظام کا طریق اور بھی بڑھ گیا۔

صوبہ دار معاہدے

اس وقت سے صوبہ دار حکومتوں اور سرکار ہند کے درمیان پانچ پانچ سال کے واسطے معاہدے ہونے لگے اس پنج سالہ طریق میں بھی فریقین کے درمیان بہت حجت جاری رہی - اور فضول خرچی میں بہت روپیہ ضائع ہوا۔ نہ صرف صوبہ وار حکومتیں اس طریق کے مخالف تھیں بلکہ انڈین نیشنل کانگریس تک میں اس پر اعتراض ہوئے - آخر سنہ ۱۹۰۴ء میں یہ قرار پایا کہ صوبہ دار حکومتوں کو مفوضہ محکموں کے مداخل اور مخارج پر مستقل اختیار دیدیا جائے چنانچہ اسی غرض کے واسطے ایک اسکیم مرتب کی گئی اس بندوبست کو "مثل مستقل" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں کہ سنہ ۱۹۰۷ء میں اسی قسم کے جدید مستقل بندوبست ہوئے اور تھوڑے ہی عرصے بعد نظر ثانی ہوئی اور ان میں پھر تغیر و تبدل ہو گیا۔

آخر سنہ ۱۹۱۱ء میں جتنے بڑے بڑے صوبے ہیں ان سے مال کے متعلق مستقل قرارداد ہو گئی - اب سرکار ہند کسی صوبے کو مالی امداد دیتی ہے تو صرف ایک حالت میں وہ یہ کہ قحط بہ شدت پھیل جاوے - ساتھ ہی سرکار صرف خاص خاص صورتوں میں صوبہ دار حکومتوں سے امداد کی خواہاں ہوتی ہے - مثلاً جنگ پیش آئے یا اس کے مالیات پر نازک وقت آپڑے، حاصل کلام یہ کہ خاص خاص صورتوں کے علاوہ مالیات کی قرارداد بالکل قطعی اور مستقل ہے اب اس میں ردوبدل نہیں ہوتا۔

صوبہ دار انتظام

آیندہ سے غیر معمولی حالت کے سوا کبھی کوئی صوبہ اپنے موازنے میں مداخل سے زائد مخارج شامل نہ کر سکے گا، نہ یہ اجازت ہے کہ کوئی صوبہ دار حکومت اپنے فاضلات اڑا کر سرکار ہند کی فاضلات پر "زیادہ ستانی" کا بار ڈالے، اور سرکار ہند کی دستگیری سے پھر اپنے قدموں پر کھڑی ہو اگر کسی خاص عارضی مجبوری کی وجہ سے صوبہ دار حکومت اپنے فاضلات خرچ کر بیٹھے اور سرکار ہند سے اجازت حاصل کرے تو اس کو شاہی خزانے سے مطلوبہ رقم قرض لے کر اس پر سود بھی ادا کرنا ہو گا - اگر صوبہ دار حکومت کا کسی طرح کام ہی نہ چلے تو پھر محصول بڑھانے

کی تجویز پر غور کرنا ہوگا - اس مستقل قرارداد کے ہوتے ہوئے بھی اگر سرکار ہند کے پاس کسی سال میں زائد رقم بچ رہے اور وہ چاہے تو صوبوں کو اس میں سے حصہ دے سکتی ہے - اس کے علاوہ اب سرکار ہند صوبوں کے سالانہ موازنوں پر پہلی سی نگرانی بھی نہیں رکھتی - زیادہ تر مالی انتظام صوبوں کے اختیار میں چھوڑ دیا ہے -

سرکار ہند کا موجودہ طریق عمل اوپر بیان ہوا - اب بعض بعض حلقوں میں یہ اصرار ہو رہا ہے کہ شاہی اور صوبہ دار ذرائع مداخل بالکل جدا کر دیئے جاویں - اور مالی معاملات میں صوبوں کو خود اختیاری ملنی چاہیئے -

سرکار ہند نے اپنے اور وزیر ہند کے مصارف کے واسطے جو مداخل بچا رکھے ہیں وہ تو شاہی کہلاتے ہیں اور جو صوبوں کے حوالے کر دیئے ہیں ان کو صوبہ دار مداخل کہتے ہیں - مصارف بھی اس طرح منقسم ہیں محاصل مداخل کے خالص شاہی مدیں ہیں :- افیون، نمک، کرور گیری، ڈاک، تار، ٹکسال مبادلہ اور سرکاری ریلیں، جن مدوں میں سرکار ہند اور صوبہ دار حکومتیں شریک رہتی ہیں وہ یہ ہیں :- مالگزاری، آبپاشی، اسٹامپ، چنگی - محصول آمدنی اور جنگلات، اب مصارف کو لیجیئے - فوجی اخراجات سرکاری قرضہ اور چند چھوٹی چھوٹی مدیں تو شاہی ہیں - عام انتظام حکومت کے مصارف میں سے کچھ شاہی اور کچھ صوبہ دار مصارف شمار ہوتے ہیں اور باقی اکثر ضروری مدیں صوبوں کے ذمے رہتی ہیں -

سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء میں مداخل و مخارج محض کی مقدار پختہ موازنے کی رو سے حسب ذیل تھی :-

| | شاہی | صوبہ دار | انگلستان |
|---|---|---|---|
| مداخل | ۷۹ کرور ۳۷ لاکھ | ۴۶ کرور ۶ لاکھ | ایک کرور ۲۰ لاکھ |
| مخارج | ۷۴ کرور ۸۷ لاکھ | ۴۶ کرور ۹۶ لاکھ | ۳۰ کرور ۵۷ لاکھ |

خالص آمدنی کی مقدار تقریباً ۵۷ ½ کرور روپے تھی اور خالص مصارف کی ۴۷ کرور روپے

باب ۱۳
مقامی مالیہ

مقامی خود اختیاری حکومت کے تین شعبے ہیں۔ بلدیات، مقامی مجالس اور مجالس اضلاع اور محکمہ جات بنادر۔ مقامی خود اختیاری حکومت کا طریق۔ لارڈ میو اور لارڈ رپن کے زمانے سے شروع ہوا۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں ہندوستان میں ۷۱۴ بلدیات قائم تھے۔ جن کے حدود میں ملک کی ۹ فیصدی آبادی بسی ہوئی تھی۔ ان کا کام بھی انگلستان کی شہری اور دیہاتی انجمنوں کا سا ہے۔ لیکن ان کو آزادی اور اختیار اُس سے کم ہے۔

سنہ ۱۹۱۱-۱۲ء میں تمام بلدیات کی مجموعی آمدنی ۷ ½ کرور روپیہ رہی۔ اس میں سے ۴۰ فی صدی رقم کلکتہ۔ بمبئی۔ مدراس اور رنگون سے وصول ہوئی۔ مداخل بلدیات کے مختلف ذرائع ہیں۔ مثلاً محصول خاص خاص قوانین کے تحت میں توفیر، بلدیہ کی ملک وجائداد کی آمدنی، اور سرکاری امداد۔ ان محصولوں میں مکان اور زمین کے محصول بہت خاص ہیں۔ محصول چنگی جو کبھی آمدنی کا خاص ذریعہ تھا اب اکثر صوبوں میں ترک کر دیا گیا اور اس کے بجائے کچھ بلا واسطہ محصول جاری ہو گئے۔ اس قسم کے محصول کا مفہوم اس سے قبل بیان ہو چکا ہے۔

ان کے علاوہ کچھ محصول اور بھی ہیں۔ مثلاً جانوروں، سواریوں، پیشوں، تجارتوں، راستوں، گھاٹوں، پانی، روشنی، صفائی اور اسی طرح کی دوسری چیزوں پر محصول لگا دیتے ہیں۔ خاص قوانین کے بموجب بلدیات کو مویشیوں کے رمنوں، گاڑیوں کے اڈوں۔ اور شراب و مسکرات فروخت کرنے کی اجازت یافتہ دکانوں سے بھی آمدنی ہوتی ہے۔ اکثر بلدیات کو اور بھی ذرائع آمدنی حاصل ہیں۔ مثلاً زمینوں کا لگان، مکانوں کا کرایہ، بلدیہ کی ملک و اسباب کی قیمت، بازاروں، مذبحوں کی آمدنی، مدارس کی فیس وغیرہ۔ اس آمدنی کے علاوہ ان کو سرکار سے بھی امداد ملتی رہتی ہے۔

بلدیات کا روپیہ خاص کر ان کاموں میں صرف ہوتا ہے۔ روشنی پولس، صحت و راحت عامہ، آبرسانی، آبیاری، صفائی۔ شفاخانے دواخانے، ٹیکہ، طاعون کی روک، بازار، باغات، سڑکوں، اور عمارات

کی تعمیر و داشت و تعلیم عامہ۔
مجموعی مصارف اکثر مداخل سے بڑھ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں بلدیات سرکار سے امداد کی خواہاں ہوتی ہیں۔
بلدیات کے محصول کا بار ۲ روپیہ ۱۵ آنہ فی کس تخمینہ کیا جاتا ہے۔

**مقامی مجالس اور مجالس ضلع**

شہروں میں جو کام بلدیات کے سپرد ہے دیہاتی خطوں میں وہی کام مجالس اضلاع اور مقامی مجالس انجام دیتی ہیں۔
مجالس ضلع اور مقامی مجالس کی آمدنی کا ذریعہ زیادہ تر وہ ابواب ہیں جو مال گزاری کے علاوہ وصول کئے جاتے ہیں۔ اپریل ۱۹۰۸ء سے مجالس کے حسابات صوبہ وار حسابات سے جدا کر دئے گئے، اور اب کی آمدنی بھی بلدیات کی آمدنی کی طرح الگ رہتی ہے۔ مجالس کو جس قدر آمدنی ان ابواب سے وصول ہوتی ہے اس کے ایک چوتھائی کے قریب سرکار امداد دیتی ہے مجالس کے ذرائع آمدنی اور بھی ہیں، مثلاً مویشیوں کے رمنے کی آمدنی، تعلیمی اور طبی فیس، پل اور گھاٹوں کا محصول خاص خاص کاموں کے واسطے صوبہ دار حکومتوں سے بھی امداد مل جاتی ہے۔ ان کی مجموعی آمدنی بلا شمار مد قرضہ ۵ ½ کرور روپیہ ہے۔
مجالس کے مصارف کی مدیں یہ ہیں۔ سڑک ریل، شفاخانے، ٹیکہ، صفائی، آبرسانی، آبیاری، ابتدائی تعلیم، بازار، مسافر خانے۔
مجالس کے محصول کا بار ۳ ½ آنے فی کس تخمینہ کیا جاتا ہے۔ متعدد قوانین کے بموجب بڑے بڑے بندرگاہوں کا انتظام محکمہ جات بنادر کے سپرد کر دیا ہے تاکہ وہ گھاٹ اور گودیاں بنائیں، اور جہازرانی کی دوسری ضرورتیں پوری کریں ان محکموں کے اراکین کو جو کہ کمشنران بنادر کہلاتے ہیں۔ یہ ماتحتی سرکار ہند بہت کچھ اختیارات حاصل ہیں۔ جہاز اور مال پر محصول لگانا، جہازوں کا جو کام کیا جائے اس کا معاوضہ وصول کرنا، بنادر کی درستی اور ترقی کے واسطے قرض لینا، بندرگاہ اور اس کے راستوں کو صاف اور درست رکھنا سال گودام، گھاٹ اور گودیاں، تیار کرانا، اور روشنی وغیرہ کا انتظام رکھنا۔

جہازوں اور تجارت کی سہولت کے واسطے طرح طرح کا انتظام کرتے ہیں۔ محکمۂ بنادر کے بیشتر رکن مقامی تجارتی جماعتوں کے نمایندے ہوتے ہیں جن کو اکثر مقامی حکومت خود نامزد کرتی ہے۔

ہندوستان کے خاص بندرگاہ پانچ ہیں، کلکتہ، بمبئی، کراچی، رنگون، اور مدراس، ان کی سالانہ آمدنی علی الترتیب تخمیناً ۱ ½ کرور، ۹۰ لاکھ، ½ کرور، ۴۵ لاکھ اور ۱۲ لاکھ رہتی ہے کچھ روز سے چٹگاؤں کا بندرگاہ بھی ترقی کر رہا ہے۔

# چودھواں باب

## حکومت و معاشیات

حکومت کے کچھ معاشی امور پیوستہ باب میں بیان ہو چکے ہیں لیکن انکی بھی غرض و غایت بہ نسبت معاشی ہونے کے زیادہ تر سیاسی ہے۔ اس باب میں مختصراً وہ تعلقات بیان کرنے مقصود ہیں جو معاشی معاملات اور حکومت ہند کے مابین بلاواسطہ قائم ہیں۔

سرکاری زمینداری

جیسا کہ اوپر واضح ہو چکا ہے۔ یہاں کے حکام کا یہ رجحان ہے کہ وہ سرکار کو آخری مالک زمین کا قرار دیتے ہیں۔ اور سرکار جو لوگوں سے مالگزاری کی تحصیل کرتی ہے اس کو ایک قسم کا لگان سمجھتے ہیں۔ اس رائے کے ثبوت میں تاریخی حوالے پیش کرتے ہیں۔ مثلاً امپیریل گزیٹیر میں لکھا ہے کہ دیسی حکومت کے زمانے میں جہاں تک تاریخی حالات سے پتہ چلتا ہے یہی رواج تھا کہ کاشتکار براہ راست سرکاری کارندے سے زمین کا معاملہ کرتا اور لگان بلاواسطہ سرکار کے پاس پہنچ جاتا تھا اگر کوئی تیسرا شخص ان کے درمیان متوسط ہوتا تھا۔ اور اس کو زمین میں کچھ حق مالکانہ بھی حاصل ہوتا تو منافع زراعت میں سے اس کو کوئی معتدبہ حصہ نہیں ملتا تھا اور جو کچھ وہ بچا لیتا ایک طرح کی فیس یا بالائی یافت ہوتی تھی جو لگان کے مفہوم میں داخل نہیں ہو سکتی۔ جب کچھ صوبے برطانوی عملداری میں آئے تو سرکار اول اول دیسی حکومت کے طریق کے مطابق مالگزاری کے نام سے تقریباً کل معاشی لگان سنگوالیتی تھی۔ جہاں متوسطین کم یا کمزور تھے! سرکار براہِ راست کاشتکاروں سے معاملہ کر لیتی تھی جیسا کہ رعیت داری خطوں کا حال ہے اس کے برعکس جہاں متوسطین کی بڑی بڑی زبردست جماعتیں موجود تھیں

مثلاً بنگال، بہار، یا صوبۂ متحدہ کے زمینداری خطوں میں۔ وہاں سرکار کو ان متوسطین سے معاملہ کرنا پڑا۔ وہ اس طرح کہ یہ لوگ کاشتکاروں سے لگان وصول کریں۔ اور تھوڑا سا حق الخدمت مثلاً دس فیصدی کاٹ کر باقی رقم سرکار میں داخل کریں۔ اسی مقدار نے بڑھتے بڑھتے اب خالص لگان کی شکل اختیار کر لی جو زمیندار اپنے واسطے وصول کرتا ہے۔ آگے چل کر تحریر ہے کہ ہندوستانی لگان کی خصوصیت یہ ہے کہ دوسرے ملکوں میں تو زمیندار اپنے لگان میں سے سرکار کو مالگزاری ادا کرتے ہیں اور ہندوستان میں خود سرکار نے کچھ لگان زمینداروں کے واسطے چھوڑ رکھا ہے۔

اگر سرکاری زمینداری کا مذکورۂ بالا طریق صحیح مان لیا جائے تو اس سے دو نتیجے نکلتے ہیں اول یہ کہ زمیندار کی حیثیت محض ایک اعلےٰ حقوق والے کاشتکار کی سی رہ جاتی ہے۔ دوسرے اگر سرکار چاہے تو کل کا کل لگان طلب کر سکتی ہے۔

تاریخی لحاظ سے یہ طریق صحیح ہو یا غلط سرکار نے زمین کے آخری مالک ہونے کا کبھی دعوی نہیں کیا اور نہ کبھی معاشی لگان کی طالب ہوئی مسٹر بیڈن پاول جو اس باب میں بڑی سند مانے جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ مالگزاری کا کہیں یہ طریق نہیں کہ کل ماحصل زائد لے لیا جائے۔ یعنی مصارف کاشت منہا کرنے کے بعد جو کچھ پیداوار بچے اس کو سرکار منگوا لے۔ بلکہ سرکار تو اس بنا پر مالگزاری تحصیل کرتی ہے کہ ہمیشہ سب بادشاہ ایسا کرتے رہے اور حکومت کی آمدنی کا بڑا ذریعہ یہی محصول زمین رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہندوؤں کے عہد میں مالگزاری پیداوار کی دس پندرہ فی صدی رہتی تھی، اکبر کے زمانے میں یک ثلث تک بڑھ گئی۔

مسٹر بیڈن پاول نے تاریخی موشگافیاں چھوڑ کر اس مسئلے کے عملی پہلو پر نظر ڈالی ہے۔ فرماتے ہیں کہ برطانوی حکومت نے خود ہر جگہ زمین کے متعلق کچھ کچھ ذاتی حقوق خود عطا کر دیئے ہیں یا تسلیم کیئے ہیں اور بنگال اودھ بلکہ تمام شمالی ہندوستان میں تو اس نے صاف صاف زمینداروں کے

مالکانہ حقوق مان لیئے ہیں بالعموم یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ سرکار زمینداروں کو اپنی اسامی سمجھ کر اُن سے مالگزاری بطور لگان وصول کرتی ہے۔ یہ تحقیق ہے کہ سرکار زمین کی مالک نہیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ زمین کو وصول مالگزاری کے واسطے ضمانت تصور کر سکتی ہے۔ آگے چل کر وہ پھر اسی سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں کہ جب اس قدر بدیہی اور قطعی طور پر سرکار لوگوں کے مالکانہ حقوق تسلیم کر چکی تو پھر سرکار کو عام زمیندار سے تعبیر کرنا محض ایک استعارہ ہے۔ سرکار اگر زمینداری کا کوئی کام کرتی ہے تو صرف یہ کہ اس کے ہاں سے کاشتکار کو کوئیں بنانے کھیت درست کرنے، یا دوسرے زراعتی ضروریات کے واسطے کچھ پیشگی رقم مل جاتی ہے۔ دوسرے وبا اور قحط میں مالگزاری ملتوی یا معاف ہو جاتی ہے اور یوں تو ملک کی کل ترقی حکومت کے دم قدم سے وابستہ ہے مسٹر بیڈن پاوُل کا آخری فیصلہ یہ ہے کہ مالگزاری کسی طرح لگان قرار نہیں پاسکتی۔ حتیٰ کہ رعیتواری خطوں میں بھی نہیں، بلکہ ان کی رائے میں یہ مطالبہ زرعی آمدنی پر ایک طرح کا محصول ہے نہ کہ لگان کا کوئی جزو۔

مسٹر بیڈن پاوُل کی رائے میں یہ مسئلہ غلط ہے کہ کل زمین کی آخری مالک سرکار ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا کوئی بھی ایسا فرقہ ہے جس کو زمین پر قطعی مالکانہ حقوق حاصل ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ زمین کا قطعی مالک کوئی بھی نہیں۔ بلکہ مالکانہ حقوق کے مختلف مدارج ہیں۔ اور چند فرقے ہیں جن میں سے ہر ایک کو تھوڑے بہت مالکانہ حقوق حاصل ہیں۔

مالکانہ حقوق کے حسب ذیل پانچ مدارج قرار پاسکتے ہیں:۔

(۱) سرکار خود بلا واسطہ زمین کی مالک ہو۔

(۲) کاشتکار یا مالک زمین عملی طور پر مالک سمجھا جاوے اور وہ سرکار کو مالگزاری ادا کرتا رہے۔ رعیتواری خطوں میں یہی طریق رائج ہے۔

(۳) سرکار اپنے اور کاشتکاروں کے درمیان مالکان زمین کا ایک تیسرا فرقہ تسلیم کرے۔ اس کی صریح مثال بنگال میں موجود ہے۔

(۴) سرکار اپنے اور کاشتکاروں کے درمیان مالکان زمین کے دو فرقے اور

تسلیم کرے۔ یہ صورت اس وقت پیش آتی ہے۔ جبکہ زمیندار کے حقوق اس درجہ نہ بڑھ سکے ہوں کہ وہ تو اعلیٰ زمیندار بن جائے اور باقی لوگ جن کا زمین سے تعلق ہو محض اسامی شمار ہونے لگیں۔

(۵) سرکار خاص خاص ادنیٰ مالکانہ حقوق تسلیم کرے۔ مثلاً ہٹی وغیرہ

ہندوستان میں حقیت اراضی بہت سی تبدیلیوں کے زیر اثر رہ کر بحالت موجودہ نمودار ہوئی ہے۔ اکثر ہوا یہ کہ کچھ حقوق دوسرے حقوق پر فوقیت پا گئے، اور اس طرح ان کے متعدد مدارج بن گئے۔

دوامی زمیند
بندوبست

ایسٹ انڈیا کمپنی کی ابتدائی حکومت میں مالگزاری کا بندوبست بہت تھوڑے تھوڑے عرصے بعد بلکہ اکثر سال بسال ہوتا تھا، اس طریق سے سرکار کو جس قدر دقت اور رعایا کو دشواری پیش آتی ہوگی۔ ظاہر ہے۔ کمپنی کے ڈائرکٹر یعنی منتظموں نے بالآخر اس طریق کی خرابیاں محسوس کر کے لارڈ کارن والس کو ایک چٹھی لکھی۔ جس میں نہ صرف جلد جلد بندوبست ہونے پر اظہار ناراضمندی کیا بلکہ مالگزاری کو یوں متواتر بڑھانے پر بھی نفریں کی۔ سنہ ۱۷۶۹-۷۰ء میں ایسا قحط پڑا کہ بنگال اور بہار کی ایک تہائی آبادی تلف ہو گئی۔ اور بڑے بڑے مزروعہ خطے ویران جنگل بن گئے۔ سخت ضرورت تھی کہ ایسے قحطوں کے دفع کا کوئی انتظام کیا جائے۔ لارڈ کارن والس نے فلپ فرانسس صاحب کا تجویز کیا ہوا دوامی بندوبست پسند کر لیا۔ سرکار اس وقت بنگال میں تین طرح پر بندوبست کر سکتی تھی، یا تو (۱) خود رعیت یعنی کاشتکاروں کے ساتھ یا (۲) مالگزاری کے ٹھیکہ داروں کے ساتھ اور یا (۳) زمینداروں کے ساتھ بندوبست کر لیتی سر جان شور نے آخری طریق کی تائید کی کیونکہ وہ اسی کو عمدہ حکومت اور ملکی ترقی کے واسطے موافق اور موزوں خیال کرتے تھے۔

دوامی بندوبست بنگال میں سنہ ۱۷۹۳ء میں شروع ہوا۔ اور سنہ ۱۷۹۵ء میں بنارس تک پھیل گیا۔ اس طریق کو جاری کرنے میں سرکار کے دو مقصد تھے ایک تو وصول مالگزاری کا اطمینان۔ دوسرے زمینوں کی درستی اور ترقی۔ امید یہ تھی کہ جب مالگزاری ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے معین ہو جائے گی تو زمینداروں کو اپنی

باب ۱۴

جائداد درست کرنے کا بہت شوق پیدا ہوگا۔ کیونکہ اسے اطمینان ہو جائے گا کہ آمدنی میں جس قدر بھی اضافہ ہو۔ مقررہ مالگزاری کے علاوہ سب اسی کی جیب میں رہے گا۔ اور سرکار اس میں سے کوئی حصہ نہ لیگی دوسرے یہ بھی توقع تھی کہ سرکار کی فیاضی دیکھکر زمیندار بھی کاشتکار کے ساتھ فیاضی برتیں گے۔

رائیں

انیسویں صدی شروع شروع میں تو حکام کی عام رائے یہ تھی کہ یہ طریق بندوبست بہت مفید اور کامیاب ثابت ہوا چنانچہ صوبۂ آگرہ کے کمشنروں نے ایک گشتی میں لکھا کہ صوبۂ بنگال میں دوامی بندوبست کو بہت حوصلہ افزا کامیابی حاصل ہوئی۔ وہاں جو راحت اور مرفہ الحالی پھیل رہی ہے وہ زیادہ تر اسی ناقلانہ اور فیاضانہ طریق کا نتیجہ ہے۔ اسی بنا پر ان کمشنروں نے سرکار سے سفارش کی کہ بندوبست کا یہی طریق صوبۂ آگرہ میں بھی جاری کرنا چاہیئے اور بہت سے حاکموں کی بھی یہی رائے تھی اور وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان بھر میں یہی طریق پھیل جائے۔

لیکن کچھ روز بعد سرکار کی رائے بدلنی شروع ہوئی اور اب تو سب حکام یکزبان ہیں کہ یہ طریق بالکل فضول اور ناکامیاب ثابت ہوا۔ مسٹر رومیش چندر دت آنجہانی نے جب سرکار ہند کی مالگزاری کی پالسی پر نکتہ چینی کی تو اس کے جواب میں سرکار ہند نے بھی سنہ ۱۹۰۲ء میں ایک نوٹ شائع کیا جس سے اس کا رجحان صاف ظاہر ہوتا ہے۔ نوٹ میں لکھا ہے کہ سرکار کو معلوم نہیں کس بنا پر لوگ کہتے ہیں کہ دوامی بندوبست نے بنگال کو قحط سے بچا لیا۔ تاریخ تو اس بیان کے خلاف میں ہے۔ پس لوگ جو پیشین گوئیاں کرتے ہیں کہ اگر دوسرے صوبوں میں بھی دوامی بندوبست ہوتا تو اس سے چنیں و چناں فوائد حاصل ہوتے سرکار ان اقوال کو کچھ قابل التفات نہیں سمجھتی۔ اب رہی بنگال میں زراعت کی حالت، اس لحاظ سے بھی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ دوامی بندوبست کی بدولت یہاں کے کاشتکاروں کو کوئی خاص راحت اور مرفہ الحالی میسر ہے۔ دوامی بندوبست سے یہی نتائج نہ پیدا نہ ہوئے جو اس کی تعریف میں بیان کیئے جاتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ زمیندار کاشتکاروں کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ

کرتے لگان بڑھا بڑھا کر کاشتکاروں کو دبا دبا کر انھوں نے اور افلاس بڑھا دیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ سرکار ہند کو کاشتکار کی طرف سے دخل دینا پڑا تاکہ کہیں وہ تباہ نہ ہو جائے۔

یہ جو کہا جاتا ہے کہ دوامی بندوبست کی برکت سے بنگال میں لوگ خیرات اور رفاہ عام کے کاموں میں بہ کثرت مالی امداد دیتے ہیں۔ بیشک سرکار ہند کو فخر ہے کہ بنگال میں اور اسی طرح دوسرے صوبوں میں بھی بڑے بڑے قابل احترام اور فیاض دل زمیندار بستے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی سرکار کو یہاں کی خرابیوں کا بھی حال معلوم ہے مثلاً زمینداروں کی غیر موجودگی۔ بے دردی مختارکاروں کی سخت گیری زمیندار اور کاشتکاروں کے ناگوار تعلقات۔ کاشتکار اور زمینداروں کے درمیان بیچ والوں کا اضافہ۔ یہ خرابیاں جس قدر کہیں اور نظر آتی ہیں اسی قدر یہاں بھی موجود ہیں اور اسی رفتار سے پھیل رہی ہیں۔ پس سرکار اس کو ایمان داری کے خلاف سمجھتی ہے کہ وہ اس رائے کی تصدیق کرے کہ کاشتکار کے حق میں یہی مروجہ طریق مفید ہے۔ حالانکہ کسی مہذب ملک کا تجربہ اس طریق کی تائید نہیں کرتا۔ نہ خود ہندوستان کا تجربہ اس کے موافق نکلا۔ بلکہ ثابت ہوا کہ غریب کاشتکار زمینداروں کے پنجے میں اس قدر بے بس اور ناچار ہو گئے کہ مجبور ہو کر سرکار کو ان کی حفاظت کے واسطے ایسے ایسے سخت قوانین نافذ کرنے پڑے جن کی اور صوبوں میں جہاں میعادی بندوبست کا رواج ہے کبھی ضرورت نہیں پڑتی۔

آیا دوامی بندوبست مفید ثابت ہوا یا مضر۔ اس کے متعلق رائیں مختلف ہیں۔ ایک رائے تو یہ ہے کہ اس سے لوگوں کی معاشی بہبود بہت کچھ محفوظ ہو گئی۔ چنانچہ مسٹر آر سی۔ دت تحریر فرماتے ہیں کہ اگر ۱۷۹۳ء کے دوامی بندوبست کا یہی مقصد تھا کہ بنگال میں وفادار زمینداروں اور خوش حال کاشتکاروں کی ایک جماعت تیار ہو جائے تو یہ مقصد توقع سے بڑھ کر پورا ہو گیا۔ اس زمانے کے ہندوستانی مدبروں کا تو عام طور پر ایسا ہی خیال تھا۔ لیکن ہندوستانی رائے کا آجکل رجحان یہ ہے کہ دوامی بندوبست ایک قسم کی

غلطی ہے جو سرکار سے سرزد ہو گئی ایک طرف تو سرکار آمدنی زمین کے غیر مکتسب اضافے سے محروم رہی۔ اور دوسری طرف کاشتکاروں کی بڑی جماعت کو بھی منافع میں ٹھیک ٹھیک حصہ نہیں ملا۔ بعض کا تو یہاں تک خیال ہے کہ اگر بندوبست میں زمینداروں کا کوئی دخل ہی نہ ہوتا تو بہت اچھا تھا۔

مسٹر جان اسٹوارٹ مل تحریر فرماتے ہیں کہ دوامی بندوبست کے نیک خیال حامیوں کو اس سے جو توقعات تھیں وہ پوری نہ ہو سکیں اور اس لحاظ سے یہ طریق سراسر ناکامیاب ثابت ہوا۔ ان کو بہت ناز تھا کہ انھوں نے بنگال میں ادھر سے ادھر تک انگریز جیسے عالی حوصلہ زمیندار پیدا کر دیئے مگر تجربے سے وہ آئرلینڈ کے جیسے بے پرواز زمیندار ثابت ہوئے۔ بنگال کے زمینداروں نے ترقی جائداد کی طرف تو توجہ کی نہیں۔ اپنے اپنی تباہی کے سامان پیدا کر لیئے۔ ایک ہی نسل کے بعد قدیم زمیندار تو ختم ہو گئے اور کلکتے کے ساہوکاران کے جانشین بن بیٹھے۔ اور لگے جائداد کی آمدنی پر بیکار زندگی بسر کرنے۔ سرکار نے ایسے زمینداروں کی جماعت تیار کرنے کی غرض سے جو کچھ بھی مالی ایثار برداشت کیا وہ سب ضائع گیا۔

مسٹر جیمس مل اپنی تاریخ ہند میں رقم طراز ہیں کہ بادشاہ کے بعد زمین میں سب سے زیادہ حق کاشتکار کا تھا۔ ترقی ملک کی خاطر نہایت فیاضی سے سرکار نے اپنے شاہی حقوق قربان کر دیئے۔ لیکن جب ملکیت سے ترقی کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ وہ حق کاشتکاروں کو ملنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ زمین اسی کے پاس رہتی ہے۔ زمینداروں کے جو کچھ حقوق تھے سرکار ان کا معاوضہ دے سکتی تھی۔

یہاں تک تو اس طریق کی خرابیاں بیان ہوئیں۔ لیکن اس میں کم سے کم ایک بڑی خوبی موجود ہے۔ مسٹر جان اسٹوارٹ مل کہتے ہیں کہ اس غلط انداز طریق میں کم سے کم ایک بات غنیمت تھی وہ یہ کہ رعیت کو زمینداروں کی اسامی قرار دینے کے ساتھ ہی ان کو زمین میں مستقل حقوق بھی دیدیئے ہندوستان کے جن حصوں میں برطانوی حکومت بعد کو قائم ہوئی وہاں کے

بندوبست میں یہ غلطی تو سرزد ہونے نہ پائی کہ بڑے بڑے زمینداروں کی ایک بیکار جماعت کو سرکاری محاصل میں سے عطیے مل جاتے لیکن اس خرابی کے ساتھ یہ خوبی بھی ترک ہوگئی کہ سب کاشتکاروں کو مستقل حقوق نہیں ملے۔

میعادی بند

خواہ دوامی بندوبست کتنا ہی قابل اعتراض کیوں نہ ہو۔ خرابیاں میعادی بندوبست میں بھی موجود ہیں۔ اس میں نہ صرف بہت دشواری اور زیادہ خرچ ہوتا ہے۔ بلکہ کاروبار میں بھی ابتری پھیل جاتی ہے۔ یہ بھی اس کا خاصہ ہے کہ ترقی زراعت کو روکتا ہے۔ بلکہ سرکار کے غیر معین اور روز افزوں مطالبات کے خوف سے زراعت بُرے حال کو پہنچ جاتی ہے۔ اور بندوبست کی میعاد جس قدر مختصر ہوتی ہے اسی قدر یہ خرابیاں زیادہ پھیلتی ہیں۔ اس دشواری کا صرف ایک علاج ہے وہ یہ کہ بندوبست کی میعاد زیادہ رکھی جائے۔ مثلاً پچاس پچاس سال تاکہ نہ دوامی بندوبست کی خرابیاں پیدا ہوں اور نہ میعادی بندوبست کی۔

زمینداروں
حق ملکیت

اس بحث کو ختم کرنے سے قبل مختصر طور پر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ زمین میں زمینداروں کے کیا کیا حقوق ہیں۔ آیا دراصل زمیندار انگریزی مفہوم کے مطابق مالک زمین ہیں یا صرف مالگزاری کے ٹھیکہ دار اور محصل۔ اس امر کے متعلق بہت اختلاف رائے پھیلا ہوا ہے۔ ۱۸۶۵ء میں جو نگان کا ایک بڑا مقدمہ چلا اس میں کلکتہ ہائی کورٹ کے ججوں نے یہ تجویز کیا کہ بنگال کے زمیندار دراصل مالک زمین نہیں بلکہ محصل تھے یعنی سرکار کی طرف سے مالگزاری تحصیل کیا کرتے تھے لیکن بعض ہندوستانی مدبرین کا خیال ہے کہ زمین کے حقیقی مالک بھی وہی تھے بلکہ ان میں سے بعض بعض تو صوبوں کے حصوں پر حکمراں تھے۔ حکومت بنگال نے ۲۴ جون ۱۹۰۱ء کو حکومت ہند کو اپنا ایک مراسلہ بھیجا جس سے اس کی رائے صاف ظاہر ہوتی ہے لکھا ہے کہ حقیقت حال دونوں فریق کے انتہائی بیانات کے بین بین ہے۔ جہاں سینکڑوں متوسطین جن کا تعلق تحصیل مالگزاری کے سوا کچھ نہ تھا زمیندار بن بیٹھے۔ وہاں بہت سے ایسے خاندانی زمیندار بھی تھے جن کو اپنے زمانے کے دستور کے

مطابق پورے پورے مالکانہ حقوق حاصل تھے۔

پس شروع میں زمینداروں کی حیثیت خواہ کچھ ہی ہو۔ عملی طور پر وہ ہمیشہ اپنی مقبوضہ زمینوں کے مالک شمار ہوئے ہیں۔ اور ہونے چاہیئے۔ البتہ سرکار کو حق مالگزاری ضرور حاصل ہے اور رواج و قوانین کی رو سے کچھ حقوق اسامیوں کو بھی ملے ہیں زمینداروں کو ان کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔

بندوبست مالگزاری

مالگزاری کے لحاظ سے حقیت اراضی کی دو قسمیں ہیں۔ زمینداری اور رعیتواری۔ جب مالگزاری ایک ایسے فرد یا جماعت کے ذمے قرار پاتی ہے جو مالک زمین ہو اور جس کی حیثیت زمیندار کی سی ہو۔ تو بندوبست زمینداری کہلاتا ہے اور جب مالگزاری ایسے افراد کے ذمے قرار پائے جو یا تو زمین پر خود قابض ہوں یا قابضوں کے قائم مقام ہوں تو بندوبست کو رعیتواری کہتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں ممکن ہے کہ کچھ ذیلی کاشتکار بھی لگان دیکر زراعت کریں۔ پہلا طریق تو بالعموم بنگال۔ بہار۔ صوبۂ متحدہ پنجاب۔ صوبۂ متوسط اور مدراس کے حصوں میں رائج ہے۔ دوسرا طریق آسام۔ برما۔ برار۔ سندھ، بمبئی اور مدراس کے اکثر حصوں میں جاری ہے۔

جیسا کہ اوپر بھی بیان ہو چکا ہے۔ بندوبست کی دو قسمیں اور ہیں یعنی دوامی اور میعادی کل بنگال میں اور صوبۂ متحدہ اور مدراس کے بعض حصوں میں تو دوامی بندوبست قائم ہے۔ باقی تمام ہندوستان میں میعادی بندوبست جاری ہے اور میعاد دس سے لیکر تیس سال تک رہتی ہے۔ مجموعی رقبۂ مزروعہ میں سے کوئی بیس فیصدی تو دوامی بندوبست میں داخل ہے۔ ۳۳ فیصدی پر زمینداری طریق کے مطابق میعادی بندوبست ہوتا رہتا ہے۔ اور باقی ۴۷ فی صدی رعیتواری علاقہ ہے جہاں میعادی بندوبست رائج ہے۔

عام طور پر تو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مالگزاری بھی ایک قسم کا محصول ہے جو لگان پر وصول کیا جاتا ہے۔ لیکن حکام کا خیال اور ہے وہ لگان کو الٹا مالگزاری کا منہا کیا ہوا حصہ قرار دیتے ہیں چنانچہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ ہندوستانی لگان میں یہ عجیب بات ہے کہ اکثر ممالک میں تو مالگزاری لگان کا ایک جزو

سمجھی جاتی ہے جو کہ زمیندار سرکار کو ادا کرتا ہے - ہندوستانی تاریخی حیثیت سے
لگان منافع زمین کا وہ حصہ ہے جو سرکار اپنی مالگزاری میں سے، زمیندار کے واسطے
چھوڑ دے -

تشخیص

زمین کی حالت اور انتظام کے لحاظ سے تشخیص لگان کے طریق مختلف ہیں
لیکن کل طریق دو عام اصولوں پر مبنی ہیں - ایک تو تجربہ کاری کی بنا پر مقدار لگان کا
قرار دینا - وہ اس طرح کہ قیمتوں کے اضافے اور مرفہ الحالی کی ترقی کا لحاظ رکھکر
سابقہ اور موجودہ شرحوں کی بنا پر بہترین شرح تجویز کرنا - اور پھر ان شرحوں کو
مناسب تخفیف کے ساتھ فرق پیداآوری کے لحاظ سے زمینوں پر حسب حال
عائد کرنا - دوسرا اصول زمینداروں کی زمین سے متعلق ہے - جن زمینوں کو اسامیاں
کاشت کرتے ہیں - ان کا جسقدر لگان وصول ہو اس کی مقدار معلوم کر کے ایک
مقررہ نسبت مثلاً پچاس فیصدی کے حساب سے مالگزاری مقرر کر دیتے ہیں -
جو زمیندار سے وصول کر لی جاتی ہے - بمبئی میں تو شرح مالگزاری بحوالہ پیداوار
مقرر ہوتی نہیں - البتہ اس کے سوا ہر کہیں مالگزاری اس طرح تشخیص کرتے
ہیں کہ وہ پیداوار کلی کے بجائے پیداوار خالص کا جزو شمار ہو -

زمینداری کے میعادی بندوبست میں سرکار بالعموم لگان کا ۵۰ فیصدی
بطور مالگزاری وصول کرتی ہے - دوامی بندوبست میں مالگزاری کا اوسط لگان
کے ۲۵ فیصدی پڑتا ہے - زمین کی پیداآوری - موسم - آب وہوا اور آبپاشی
کے فوائد اور مال فروخت کرنے کی سہولتیں - شرح مالگزاری تشخیص کرنے میں
ان سب باتوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے -

ہندوستان کے معاشیات اور سیاسیات میں یہ بہت معرکۃ الآرا اور
مختلف فیہ مسئلہ ہے کہ مالگزاری کا بار بجا ہے یا بیجا - بہت سے ہندوستانی
محبان وطن کا قول تو یہ ہے کہ یہ بار بہت تکلیف دہ ہے - ہندوستان میں
عوام الناس کے اس انتہائی افلاس کا ایک بڑا باعث مالگزاری بھی ہے اور
اسی سے قحط بھی پھیلتے ہیں - اس کے برعکس حکام کا دعویٰ ہے کہ مالگزاری
ہرگز بہت زیادہ نہیں ہے - بلکہ کچھ عرصے سے اس کے تعین میں سرکار

بہت زیادہ فیاضی سے کام لینے لگی ہے تخمینے سے معلوم ہوا کہ برطانوی ہندوستان کی آبادی پر مالگزاری کا بار فی کس سوا روپے کے قریب پڑتا ہے۔

سنہ ۱۹۰۲ء کا ذکر ہے کہ کچھ وظیفہ خوار اعلیٰ حکام نے سرکار ہند کے ہاں ایک محضر پیش کیا جس میں چند تجاویز پر زور دیا گیا تھا۔ (۱) اول یہ کہ جہاں کاشتکار براہ راست مالگزاری ادا کرتے ہیں۔ وہاں مصارف کاشت منہا کرنے کے بعد جو کچھ خالص پیداوار بچے۔ اس کے حساب سے ۵۰ فیصدی مالگزاری مقرر کی جائے۔ اور بالعموم وہ پیداوار کلی کے ۲۰ فی صدی سے تجاوز نہ کرے (۲) دوسرے یہ کہ جہاں مالگزاری زمینداروں سے وصول ہوتی ہو وہاں قواعد سہارنپور کے بموجب جو سنہ ۱۸۵۵ء میں نافذ ہوئے تھے مالگزاری اس لگان کی نصف ہونی چاہیئے جو زمیندار کو اسامی سے وصول ہو اس سے زیادہ نہیں (۳) تیسرے یہ کہ بندوبست کی میعاد تیس سال سے کم نہ ہونی چاہیئے (۴) یہ کہ سوائے اس حالت کے کہ سرکاری ذرائع آبپاشی کی ترقی یا قیمت پیداوار کے اضافے سے زمین کی آمدنی میں اضافہ ہو۔ اور کسی حالت میں مالگزاری نہیں بڑھانی چاہیئے (۵) پانچویں یہ کہ ابواب جو مالگزاری کے ساتھ وصول کیئے جاتے ہیں ان کی انتہائی مقدار مقرر کر دینی چاہیئے کہ ابواب اس سے نہ بڑھ سکیں۔

سرکار نے جو ان تجاویز کا جواب دیا ان کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلی تجویز ناقابل عمل ہے۔ اس سے کاشتکاروں کو الٹی تکلیف پہنچے گی۔ موجودہ طریق کہیں بہتر ہے۔ دوسری تجویز بے محل ہے قواعد سہارنپور کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ مالگزاری ۵۰ فیصدی سے بڑھ ہی نہ سکے۔ تیسری تجویز خلاف اصول ہے۔ تعین میعاد کا اصول یہ ہے کہ جہاں زراعت ایک حالت پر قائم ہو چکی ہو اور اس میں جلد جلد کوئی تغیر و تبدل نہ ہوتا ہو وہاں تو تیس تیس سال بعد بندوبست ہونا چاہیئے۔ گویا ہر نسل کی زندگی میں ایک ایک مرتبہ لیکن جہاں زراعت کی حالت اس کے برعکس ہو مثلاً بہت سی زمین ابھی افتادہ ہو۔ لگان کم ہو۔ زراعت گھٹتی بڑھتی ہو یا نئی نئی سڑکیں بننے، ریل نکلنے، اور آبادی بڑھنے سے زراعت پھیلے اور قیمتوں میں اضافہ ہو تو دونوں صورتوں میں تیس سال

تک تجدید بندوبست ملتوی رکھنا یا تو مالگزاروں کے حق میں ظلم ہوگا۔ جو اضافۂ مالگزاری کا بیجا بار تھوڑے سے روز بھی برداشت نہیں کر سکتے یا عام محصول گزار مزید مالگزاری سے محروم رہیں گے۔ حالانکہ وہ اس کے پورے طور پر مستحق ہیں۔ چوتھی تجویز کے مطابق سرکار ایک مختصر جماعت کے فائدے کی خاطر اس اضافۂ غیر مکتسب سے کیونکر دست بردار ہو سکتی ہے۔ جو خود سرکار کی کوشش اور ترقی تہذیب کی بدولت نمودار ہوا ہے رہی پانچویں تجویز سو مقامی محصول یعنی ابواب کا منشا مقامی لوگوں کو فائدہ اور آرام پہنچانا ہے اس کی مقدار قطعی طور پر معین کرنی مفاد عامہ کے خلاف ہے۔

قوانین

قوانین لگان کا منشا یہ ہے کہ اسامی کو بیجا مسابقت کی زد سے بچائیں۔ اور از روئے رواج اس کو جو حقوق مل چکے ہیں انکو محفوظ رکھیں۔ چونکہ آبادی کے بہت بڑے حصے کا ذریعۂ معاش زراعت ہے۔ زمین کے متعلق جو جو قوانین نافذ ہیں ان کا مختصر خلاصہ پیش کرنا خالی از منفعت نہ ہوگا۔

اس سے قبل بیان ہو چکا ہے کہ زمین میں زمیندارانہ حقوق کو جو فوقیت حاصل ہوئی وہ اکثر دوسرے حقوق کو دبا دبا کر ہوئی۔ مثلاً جوں جوں زمانہ گزرتا گیا کچھ زمیندار تو مالک بن بیٹھے اور باقی بیچاروں کی حیثیت محض اسامی کی سی رہ گئی۔ ان میں سے چند کاشتکاروں نے البتہ لڑ جھگڑ کر زمینداروں سے کچھ دوامی حقوق منوائے۔

جو اسامیاں کہ کبھی خود مالک زمین تھیں اور جن کو بطور معاہدہ پٹے پر زمینیں ملی ہیں۔ ان کو الگ الگ چھانٹنا بہت دشوار ہے۔ بنگال اور صوبۂ متحدہ میں تو اس تفریق کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ کیونکہ وہاں قانون یہ ہے کہ اگر کاشتکار مسلسل بارہ سال تک کسی زمین پر قابض رہے تو اس کو حق دخیلکاری حاصل ہو جاتا ہے اور وہ دخیلکار اسامی شمار ہونے لگتا ہے البتہ پنجاب اور اودھ میں یہ بارہ سال کا قاعدہ رائج نہیں ہے۔ اور صوبۂ متوسط میں بھی اس کا نفاذ بہت خاص خاص حالتوں تک محدود ہے۔ لیکن ساتھ ہی ان صوبوں میں ایسے کاشتکاروں کی جماعتیں موجود ہیں جن کو خاص طور پر ذیلی زمیندار تسلیم

کر لیا گیا ہے۔

بنگال کے قانون لگان میں اسامیوں کی تین قسمیں قرار پائی ہیں (۱) ٹھیکہ دار۔ (۲) رعیت (۳) شکمی رعیت۔ پھر رعیت کی بھی تین قسمیں ہیں۔ (۱) اول وہ جن کے لگان کی مقدار یا شرح ہمیشہ کے واسطے معین ہو (۲) دوسری دخیلکار رعیت جن کو زمین پر مستقل قبضہ رکھنے کا حق حاصل ہو (۳) تیسری غیر دخیلکار رعیت۔ ان کے علاوہ رعیت کی ایک قسم اور بھی ہے جن کو آباد شدہ رعیت کہہ سکتے ہیں یعنی جو کہ رعیت کی حیثیت سے کسی گاؤں کی زمین پر بارہ سال تک قابض رہ چکے ہوں۔

ٹھیکہ دار سے ایک ایسا شخص مراد ہے جس نے کہ مالک زمین یا دوسرے ٹھیکہ دار سے زمین پر قبضہ رکھنے کا حق حاصل کر لیا ہو تاکہ وہ اس کا لگان تحصیل کرے یا اس کو زراعت کے واسطے اسامیوں کے ہاتھ پٹے پر اٹھادے۔ اس حق میں ٹھیکہ دار کے ورثا اور اس کے دوسرے حقدار بھی شامل ہیں۔

رعیت وہ لوگ ہیں جن کو زمین پر قبضہ رکھنے کا حق اس لیئے ملا ہو کہ وہ خود یا اپنے کنبے یا مزدوروں یا شریکوں کی مدد سے اس کو کاشت کریں۔ اور اس حق میں بھی ورثا اور ان کے دوسرے حقدار شامل ہیں۔

شکمی رعیت سے وہ اسامیاں مراد ہیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ رعیت کے تحت میں زمین پر قابض ہوں۔

بنگال میں رعیت بشرح معین سب سے اعلے رتبے کی اسامی ہیں۔ انکو قریب قریب ٹھیکہ داروں کے حقوق حاصل ہیں۔ نہ تو ان کے لگان میں اضافہ ہو سکے اور نہ یہ اسامی بے دخل ہو سکیں سوائے بہت خاص صورتوں کے جبکہ وہ شرائط لگان کی صریح خلاف ورزی کر بیٹھیں۔ اور اسامیاں جن کو خاص حقوق حاصل ہیں۔ مجموعی طور پر دخیلکار کہلاتے ہیں۔ باقی اسامیاں غیر دخیلکار شمار ہوتی ہیں۔ ان کو پاہی اسامی بھی کہتے ہیں۔ ان کی حفاظت کے واسطے بھی قانون نے چند قواعد مقرر کر دیئے ہیں مثلاً بے دخلی کے واسطے کم از کم چھ ماہ قبل ان کو اطلاع دینی ضرور ہے۔

صوبۂ متحدہ کے ان اضلاع میں جہاں دوامی بندوبست رائج ہے۔ بنگال کی سی اسامیاں موجود ہیں جن کے لگان کی مقدار یا شرح معین ہے۔ ان کے علاوہ اور اسامیاں بھی اگر مسلسل بارہ سال تک ایک زمین پر قابض رہیں تو دخیلکار بن جاتے ہیں۔ اس سے کم میعاد کی اسامیاں غیر دخیلکار شمار ہوتی ہیں۔ ان کی ایک قسم اور بھی ہے۔ جن کو ساقط الملکیت کہتے ہیں۔ گویا وہ ان زمینوں کے دخیلکار اسامی ہیں جن کے وہ کبھی خود ہی مالک بھی تھے۔ ان کا ایک خاص حق یہ ہے کہ معمولی اسامیوں کے لگان سے ان کا لگان کچھ کم رہتا ہے۔ بالعموم ۲۵ فیصدی کم۔

صوبۂ متوسط میں جو زمیندار ہیں ان کو مال گزار بھی کہتے ہیں۔ اضافۂ لگان اور بے دخلی کے لحاظ سے ان کے اختیارات بہت محدود ہیں۔ جن اسامیوں کو خاص حقوق حاصل ہیں جب تک نہایت خاص وجوہات کی بناء پر عدالت ڈگری نہ دے۔ زمیندار انکو بے دخل نہیں کر سکتے ہیں۔ اسی بنا پر اضافۂ لگان بھی محدود ہے۔ یہ نہیں کہ جتنا بڑھ سکے بڑھالیں۔ صوبۂ متوسط کے قانون میں اسامیوں کی ایک قسم دخیلکار مطلق کہلاتی ہے۔ یہ کسی حال میں بے دخل نہیں ہو سکتے۔ اور ان کا لگان میعاد بندوبست تک معین رہتا ہے۔ دوسری قسم معمولی دخیلکاروں کی ہے یہاں ان کے حقوق اس طرح نہیں بڑھتے جیسے کہ بنگال اور صوبۂ متحدہ میں صوبۂ متوسط کے قانون میں ان لوگوں کا بھی خاص طور پر ذکر ہے جو گاؤں کی کسی خدمت کے معاوضے میں کچھ زمین پر قابض ہوں۔ غیر دخیلکار اسامیوں کی حفاظت کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔

پنجاب میں حق دخیلکاری بالکل قدرتی طور پر قائم ہوا۔ قانون کو زیادہ چھان بین نہ کرنی پڑی۔ پنجاب کے قانون میں دخیلکار اسامیوں سے اول تو وہ لوگ مراد ہیں جو دو نسل تک زمین پر قابض رہ چکے ہوں۔ مگر اس دوران میں سوائے حصۂ مالگزاری کے نہ تو زمیندار کو کوئی لگان ادا کیا ہو اور نہ اسامی کی حیثیت سے اس کی کوئی خدمت بجا لائے ہوں۔ دوسرے ساقط الملکیت کاشتکار، تیسرے جو گاؤں کے بانی کے ساتھ آئے ہوں۔ اور اول اول زمین

درست کرنے میں ہاتھ بٹایا ہو جو تھے جو لوگ مالگزاری ادا کریں اور زمین پر قابض چلے آتے ہوں۔ دخیلکار اسامیوں کی یہ جو خود بخود قسمیں بن گئی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے حقوق مختلف ہیں۔ کسی کے زیادہ اور کسی کے کم۔

مدراس میں اسامی جتنا حق ثابت کر دکھائے اتنا ہی اس کو مل جاتا ہے۔ بے دخلی۔ اور اضافۂ لگان کے متعلق کوئی خاص قاعدہ مقرر نہیں، معاہدے خواہ صریحی ہوں یا نخوائی۔ سب کی تعمیل ہوتی ہے۔ اگر کوئی معاہدہ نہ ہو تو تشخیص مالگزاری کی سرکاری شرح کے حساب سے لگان قرار پاتا ہے۔ یا اس مقام کی رواجی شرح کے مطابق اسامیاں بالعموم عدالتی ڈگری کی رو سے بے دخل ہوتی ہیں لیکن وہ چاہیں تو کسی سال کے ختم پر زمین چھوڑ دیں۔

بمبئی میں جس شخص کا زمین پر قبضہ ہوتا ہے یا تو وہ بطور خود قابض ہوتا ہے اور بلاواسطہ سرکار کو مالگزاری ادا کرتا ہے۔ یا وہ کسی دوسرے شخص کا ذیلی اسامی ہوتا ہے اور اس کو لگان دیتا ہے۔ اس دوسری صورت میں اگر کوئی معاہدہ ہو گیا ہو تو اسی کے مطابق لگان اور میعاد وغیرہ مقرر ہوگی ورنہ مقامی رواج دیکھا جائے گا۔

اودھ میں اول تو یہ کوشش کی گئی کہ صوبۂ آگرہ کی طرح وہاں بھی بڑے بڑے زمینداروں کو چھوڑ کر دیہاتیوں کو زمیندار تسلیم کر لیا جائے۔ لیکن سنہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد تعلقہ داروں کے ساتھ بندوبست کر لیا گیا اس صورت میں تعلقہ جات کی اسامیوں کی حفاظت کے واسطے قانون نے قواعد مقرر کر دیئے۔ سنہ ۱۸۸۶ء کے قانون لگان نے اسامیوں کے کل واجبی حقوق تسلیم کر کے محفوظ کر دیئے۔ موروثی اسامیوں کو تو حق دخیلکاری مل گیا۔ اور ان کے لگان بھی محدود کر دیئے گئے۔

**قحطوں کی سرگزشت**

یوں تو ہندوؤں کے عہد میں بھی ہندوستان قحطوں سے محفوظ نہ تھا۔ لیکن سنسکرت کی کتابوں میں اور قدیم سیاحوں کے سفرناموں میں قحط کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں قحط شاذ و نادر تھے، جب کبھی قحط پڑتا تھا۔ سرکار امداد کا انتظام کرتی تھی۔ چانکیا نے اپنی مشہور کتاب ارتھ شاستر میں امداد قحط کی جو چند صورتیں بیان کی ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) محصول کی معافی (۲) ترک وطن (۳) سرکاری خزانے سے روپیہ پیسہ اور غلہ تقسیم کرنا (۴) جھیل تالاب اور کنووں کی تعمیر (۵) دوسرے مقامات سے غلہ منگانا۔

مسلمانوں کے عہد میں بھی قحط پڑے جن کا تواریخ میں ذکر موجود ہے ان میں چار قحط بہت ہولناک تھے ایک قحط تو ۱۳۴۳ء میں محمد تغلق نیک دل بادشاہ کے زمانے میں شمالی ہند میں نمودار ہوا۔ لیکن بادشاہ نے فوراً ہی نہایت وسیع پیمانے پر امداد کا اہتمام کر دیا۔ دہلی کی کل آبادی کو چھ چھ مہینے کی خوراک تقسیم کر دی گئی۔ اس کے بعد اکبر کے زمانے میں تمام ہندوستان میں چار سال تک برابر خشک سالی اور قحط میں مبتلا رہا۔ بادشاہ کی طرف سے شہر شہر خیرات بٹنے لگی چنانچہ نواب شیخ فرید بخاری مرحوم اُس کے مہتمم مقرر ہوئے اور انھوں نے لوگوں کی مصیبت گھٹانے میں بیحد کوشش کی۔ شاہ جہاں کی تخت نشینی کے پانچویں سال تمام ملک میں ایسا پرخطر قحط ہوا کہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔ باوجودیکہ بادشاہ کی طرف سے امداد کا نہایت زبردست اہتمام تھا بیشمار خلقت بھوکوں مر گئی۔ چوتھا قحط اورنگ زیب کے عہد میں نازل ہوا۔ اس موقع پر امداد کا جو کچھ انتظام کیا گیا اس کے باب میں جیمس مل صاحب رقمطراز ہیں کہ اگر اورنگ زیب کے سابق طرز عمل کو دیکھ کر ہم رحمدلی اور رحمدری اس سے منسوب نہ کریں۔ تو پھر یہ اس کی مآل اندیشی سمجھنی چاہیئے کہ اُس نے اس مصیبت کے وقت حد درجہ فیاضی اور دریا دلی سے کام لیا۔ مالگزاری اور محصول یک قلم معاف کر دیئے گئے۔ سرکاری خزانوں سے بیحد و حساب داد و دہش شروع ہو گئی۔ جہاں غلہ دستیاب ہوتا تھا وہاں سے قحط زدہ مقاموں میں لیجا کر ارزاں فروخت کرتے تھے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں ہندوستان کے کسی نہ کسی حصے میں کل بارہ قحط اور چار گرانیاں ظہور پذیر ہوئیں۔ سب سے پہلا قحط ۱۷۷۰ء میں بنگال میں پھیلا جس نے ایک ثلث سے زیادہ آبادی کا صفایا کر دیا۔ گرچہ

سنہ ۱۷۶۹ء میں قحط کے آثار نمودار ہونے لگے تھے اس کی روک تھام کی کوئی فکر نہیں کی گئی۔ اور جب سخت مصیبت پھیلی تو امداد کا کوئی معقول اہتمام نہیں ہوا۔ سنہ ۱۷۸۱ء اور سنہ ۱۷۸۲ء میں مدراس میں گرانی رہی اور سنہ ۱۷۸۴ء میں کل شمالی ہندوستان میں ایک مہلک قحط پڑ گیا۔ سنہ ۱۷۹۱ء میں حیدرآباد اور مدراس میں گرانی رہی اور دوسرے سال یہاں بھی قحط مسلط ہو گیا۔ کمپنی کے عہد میں یہ پہلا موقع تھا کہ حکومت مدراس نے قحط زدوں کے واسطے امدادی کام جاری کیے۔ سنہ ۱۸۰۲-۳ء میں خشک سالی کی وجہ سے بمبئی میں تو قحط پڑا۔ اور مدراس میں گرانی پھیلی اور دوسرے ہی سال صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ میں قحط جا دھمکا۔ اس موقع پر سرکار نے کئی طرح پر امداد کی مالگزاری معاف کر دی زمیندار اور کاشتکاروں کو قرض کے طور پر پیشگی رقمیں دیں اور جس قدر غلہ بنارس، الہ آباد کانپور، اور فتحگڈھ میں باہر سے آتا تھا اس پر سرکار بطور امداد کچھ رقم دیتی تھی تاکہ غلہ ارزاں فروخت ہو سکے سنہ ۱۸۰۶ء میں مدراس کے بعض اضلاع میں گرانی پھیلی اس کے بعد سنہ ۱۸۳۳ء میں وہ قحط نمودار ہوا جو بالعموم گنتور قحط کے نام سے مشہور ہے۔ مدراس کے شمالی اضلاع، جنوبی مرہٹواڑی اور میسور و حیدرآباد کے حصوں پر اس کا خاص اثر پڑا۔ جب تک مصیبت ناقابل برداشت نہ ہو گئی۔ سرکار نے اس کی طرف کوئی توجہ ہی نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گنتور کی پانچ لاکھ آبادی میں سے دو لاکھ جانیں ضائع ہو گئیں۔ سنہ ۱۸۳۷ء میں شمالی ہندوستان میں قحط پڑا۔ مختلف مرکزی مقامات میں بغرض امداد تعمیرات کا کام شروع کر دیا گیا۔ لیکن بوڑھے، بچے اور اپاہج جو کام کاج سے معذور تھے ان کو عوام کی خیرات پر چھوڑ دیا۔ موت کی گرم بازاری کا کیا حال بیان ہو۔ اس مصیبت کے دردناک افسانے مدتوں لوگوں کی زبان پر جاری رہے سنہ ۱۸۵۴ء میں ایک سخت قحط پڑا مگر وہ شمالی مدراس تک محدود رہا۔

جب سے ہندوستان کی حکومت کمپنی کے ہاتھ سے نکلی اور تخت و تاج برطانیہ کے تحت میں آئی۔ دس تو بڑے بڑے قحط پڑ چکے ہیں۔ اور بہت سی

سخت سخت گرانیاں الگ ہوئیں۔ پہلا قحط سنہ ۱۸۶۰ء واقع ہوا لیکن اس کا اثر دلی آگرے کے درمیان محدود رہا۔ برطانوی ہندوستان کا یہ پہلا قحط تھا جس میں امداد کی غرض سے خیرات خانے کھولے گئے۔ اور سب سے اول اسی موقع پر حکام کو یہ خیال پیدا ہوا کہ قحط کے اسباب، اس کی وسعت اور سختی کے متعلق تحقیقات کر کے ایسی تدابیر نکالنی چاہئیں کہ اس مصیبت کا مقابلہ کیا جا سکے۔ چنانچہ کرنل برڈ اسمتھ۔ اس تحقیقات کے کام پر تعینات ہوئے۔ سنہ ۱۸۶۵ء میں خشک سالی اور اس کے دوسرے سال سخت قحط ہوا۔ سب سے زیادہ مصیبت اوڑیسہ میں آئی اس لئے اس کو قحط اوڑیسہ کہتے ہیں ورنہ در حقیقت اس کا اثر مدراس شمالی بنگال اور بہار تک پھیل گیا تھا۔ حکام کو پہلے سے قحط کی خبریں مل رہی تھیں مگر وہ مطمئن بیٹھے رہے نتیجہ یہ ہوا کہ جب مصیبت آئی تو سنبھالے نہ سنبھلی لوگوں کا تخمینہ ہے کہ اوڑیسہ میں دس لاکھ جانیں ضائع ہو گئیں۔ ایک سال بھی نہ گذرنے پایا تھا کہ ایک نہایت ہولناک اور قابل یادگار قحط تمام شمالی اور متوسط ہند میں پڑ گیا۔ راجپوتانہ اور متوسط ہند کی حالت سب سے بدتر تھی کہ جہاں نہ کوئی فصل تھی۔ نہ گھاس چارہ اور نہ پانی اور اس پر بھی اکتفا نہ ہوئی تو ہیضے نے وہ آفت برپا کی کہ الاماں، سرکار نے نہایت مستعدی اور سر گرمی سے امداد کا اہتمام کیا لیکن مصیبت کے مقابل وہ امداد پھر بھی ناکافی رہی اور جانوں کا بہت نقصان ہوا۔

سنہ ۱۸۷۳ء میں بہار اور صوبۂ متحدہ کے مشرقی اضلاع میں قحط پڑا۔ حکومت بنگال نے اس موقع پر بڑی مستعدی اور کارگزاری دکھائی۔ امداد کا وسیع پیمانے پر ایسا اچھا انتظام کیا کہ اس سے قبل کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ امدادی کاموں میں تقریباً دس کروڑ روپیہ صرف ہوا۔ سنہ ۱۸۷۶-۷۸ء میں جو قحط ہوا کیا بلحاظ وسعت و تباہی آبادی کے کیا بلحاظ مدت اور سختی کے انیسویں صدی کے شروع سے اس وقت تک کے کل قحطوں سے بازی لے گیا۔ مدراس بمبئی۔ صوبۂ متحدہ اور پنجاب سب اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ اس موقع پر امداد کا انتظام بہت ناکافی اور ناقص رہا۔ سرکار نے لوگوں کی جان بچانے کی ذمہ داری لینے سے

انکار کیا اور نہایت روکھے پن سے صاف کہدیا کہ بلا لحاظ کمی و بیشی مصارف جانیں بچانے کا کام سرکار کے اختیار سے باہر ہے - اور خود مصیبت زدہ رعایا کے اور نیز عام محصول گزاروں کے حق میں یہی بہتر ہے کہ سرکار لوگوں کی مفت خوری کو روکے اور اس کے بار سے بچے - پھر اگر اس طریق عمل کے بعد سخت تباہی پھیلی ہو تو کیا عجب ہے -

۱۸۷۸ء اور ۱۸۹۶ء کے درمیان دو قحط اور پانچ گرانیاں نمودار ہوئیں مگر زیادہ تر مقامی تھیں - البتہ ۱۸۹۶-۹۷ء کے بڑے قحط کا اثر کم و بیش ہر صوبے پر پڑا اور تین کرور چالیس لاکھ کی آبادی تو پس کر رہ گئی - جا بجا تعمیرات کا امدادی کام شروع کرنے کے علاوہ خیرات بھی بکثرت تقسیم کی گئی اور بہت سی جگہ تو لوگوں کے مکانوں پر امداد پہونچائی - امداد کا انتظام خوب کامیاب ثابت ہوا البتہ صوبۂ متوسط کا انتظام اچھا نہ رہا - اسی وجہ سے وہاں اموات بھی اور جگہ سے بہت زیادہ ہوئیں - امداد میں کوئی سوا سات کرور روپیہ صرف ہوا -

ابھی لوگ اچھی طرح پر سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ پھر ایک سخت مصیبت نازل ہوئی یعنی ۱۸۹۹-۱۹۰۰ء میں قحط نمودار ہوا - ایک لاکھ نواسی ہزار مربع میل کے اندر اندر دو کرور اسی لاکھ آبادی پر اس کا اثر پڑا - شروع شروع میں تو سرکار امدادی کام جاری کرنے سے معذور رہی اور اس نے زیادہ کوشش بھی نہیں کی لیکن بعد کو جب امدادی کام جاری ہوئے تو ان کی طرف لوگ اس کثرت سے ڈھلے کہ انتظام کرنا دشوار ہو گیا - دس کرور روپیہ صرف ہوا اور پھر بھی مجموعی مدات معمول سے ۱۲۳۶۸۵۵ بڑھ گئیں ۱۹۰۰ء کے بعد بھی کئی قحط اور گرانیاں آئیں مگر وہ بیشتر مقامی تھیں ۱۹۰۶-۸ء کا قحط البتہ وسیع تھا لیکن ان موقعوں پر امدادی کام جاری کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا -

قحط کے علامات

اس مختصر سرگزشت سے واضح ہوا کہ ہندوستان میں قحط کی مصیبت اکثر نازل ہوئی رہتی ہے ۱۸۸۰ء میں قحط کمشنروں نے یہ اوسط نکالا کہ بالعموم سات فصلیں اچھی ہوتی ہیں تو دو خراب ہو جاتی ہیں - اور تخمیناً آبادی کے بارھویں حصے پر ہر قحط کا اثر پڑتا ہے - بعض صوبوں میں قحط کا زیادہ خدشہ لگا رہتا ہے لیکن

باب ۴

شاید ہی کوئی ایسا سال آتا ہو کہ ہندوستان کے کسی نہ کسی حصے میں کچھ قحط یا گرانی نہ ہو۔ بڑے بڑے قحط جب جاہیں نمودار ہو جاتے ہیں۔ ان کا کوئی زمانہ مقرر نہیں لیکن پہلے سے ان کے قرائن ضرور نظر آنے لگتے ہیں۔

قحط کی پہلی علامت یہ ہے کہ بارش نہ ہو اور فصلیں ماری جائیں۔ گرانی پھیلے اور ادنیٰ درجہ کے مزدوروں کو کام نہ ملے تو بھیک پر اتر آئیں ساتھ ہی اعتبار گھٹ جائے یعنی لوگ لین دین بند کر دیں اور خیرات میں بھی مٹھی بھینچ لیں۔ چوری اور لوٹ مار شروع ہو۔ لوگوں میں ایک عام بےچینی پیدا ہو جائے اور صحت عامہ خراب ہونے سے سخت سخت وبائیں نمودار ہوں۔

قحط کا [illegible] قحطوں کا مقابلہ کرنے کے واسطے تمام صوبوں نے ایک ایک دستور العمل مرتب کر لیا ہے۔ ان کے فروعات میں تو کچھ کچھ اختلاف ہے۔ مگر خاص خاص اصول میں سب متفق ہیں یوں تو معمولی زمانے میں بھی بطور احتیاط و پیش بندی کچھ مستقل انتظام رہتا ہے۔ لیکن جہاں قحط یا گرانی کا خطرہ نظر آیا خاص تدابیر شروع ہو گئیں۔ ان تمام عہدہ داروں کے کام اور فرائض مقرر ہیں جن کو قحط میں امداد کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ نیز امداد کے طریق بیان کر دیئے گئے ہیں۔

جوں ہی کسی صوبہ دار حکومت کو قحط یا گرانی کی آمد کا پتہ چلے فوراً اس کی روک تھام کا انتظام شروع کر دینا چاہیئے۔ قحط کمیشن نے امدادی کام کا جو طریق بتایا ہے اس کا لب لباب ذیل میں پیش کرتے ہیں:۔

شروع شروع میں تو:۔

(۱) کچے کنوئیں کھودنے اور پختہ کنوؤں کی مرمت کرنے کے واسطے دل کھول کر پیشگی رقم تقسیم کرنی چاہیئے۔

(۲) جو لوگ عہدہ دار نہ ہوں ان کی امداد بھی حاصل کرنی چاہیئے اور لوگوں کی طرف سے خیرات تقسیم ہونے کا انتظام کرنا چاہیئے۔

(۳) تخم خریدنے کے واسطے کاشتکاروں کو پیشگی رقم دینی چاہیئے۔

(۴) کچھ رقم پولیس کی تحویل میں رہے کہ وہ مصیبت زدہ آوارہ گردوں کی امداد کرے۔

(۵) امتحانی کام جاری کر دئے جائیں - اور جابجا آبادی کے مرکزوں میں محتاج خانے قائم ہونے چاہئیں -
(۶) التوار مالگزاری کے متعلق تحقیقات شروع کردی جائے -
(۷) امدادی حلقے مقرر کر کے ان کی نگرانی کی جاوے -
(۸) جو لوگ بوجہ معذوری مفت امداد کے مستحق ہوں ان کی فہرستیں تیار کر لی جاویں -
(۹) اگر چارے یا پانی کی قلت کا خدشہ ہو تو اس کا بندوبست کرنا چاہیئے - لوگوں کو بھی آمادہ کیا جائے کہ باہر سے چارہ منگائیں - اور ذرایع آبرسانی پیدا کریں -

ابتدائی تدابیر اوپر بیان ہوئیں - ان سے پتہ چل جاوے گا کہ قحط کا خطرہ کس نوبت پر پہونچ چکا ہے - مثلاً امتحانی کام ہے اس کا منشاء قحط میں امداد پہونچانا نہیں بلکہ قحط کا پتہ چلانا ہے بھوکوں کا پیٹ بھرنا مقصود نہیں بلکہ بھوکوں کی جماعت دریافت کرنا ہے اگر قحط قریب آپہنچا ہو تو لوگ بکثرت امتحانی کاموں پر گریں گے - جب ایسی حالت ہو تو امتحانی کاموں کو فوراً امدادی کام قرار دے دینا چاہیئے کیونکہ یہی کام تو امداد قحط کے انتظام میں سب سے بڑی چیز ہے - جو لوگ چاہیں اور کام کر سکیں ان کو امدادی کاموں میں لگا دینا چاہیئے - اور ہر ایک کی محنت اور اجرت اسکی جسمانی طاقت اور ضروریات کے لحاظ سے مقرر کردی جائے - قحط میں اجرت کا یہ اصول ہے کہ قیام صحت کے واسطے کم سے کم جس قدر درکار ہو اتنی اجرت دی جائے امدادی کاموں کی بھی قسمیں ہوتی ہیں - سرکاری کام اور دیہاتی کام - پہلے کام تو محکمۂ تعمیرات کے زیر انتظام رہتے ہیں - اور اس میں لوگوں کی بڑی بڑی جماعتیں مزدوری کرتی ہیں - دیہاتی کاموں پر حکام مالگزاری کی نگرانی رہتی ہے - اور وہ کام زیادہ تر انہی دیہات کے واسطے کمفید ہوتے ہیں -

امتحانی کاموں کو امدادی کام قرار دیتے وقت مفت امداد تقسیم کرنے کا

بھی انتظام کر لینا چاہیئے۔ نہایت احتیاط کے ساتھ ان تمام لوگوں کی فہرستیں تیار کی جاویں جو از روئے دستور العمل مفت امداد پانے کے مستحق ہوں۔ مثلاً جن لوگوں کے کوئی عزیز قریب پرورش کرنے والے نہ ہوں اور جو کام کاج سے بھی معذور اور اپاہج ہوں۔ یا جن کو مکان پر بیماروں کی تیمارداری یا بچوں کی نگہداشت کرنی پڑے اور وہ اس وجہ سے امدادی کاموں میں محنت مزدوری نہ کر سکیں۔

جا بجا موقع دیکھ کر محتاج خانے بھی کھول دینے چاہئیں تاکہ جو لوگ معذور اور بے خانماں یا غریب الوطن ہوں انکو کچھ امن ملے۔

امداد کی اور بھی صورتیں ہیں۔ مثلاً جو لوگ امدادی کاموں میں مزدوری کر رہے ہوں اُن کے بال بچوں کے واسطے باورچی خانے اور رسوئی گھر کھول دیئے جاویں یا پردہ نشین مستورات کو مفت امداد تقسیم کی جاوے شرفا کو ان کے مناسب حال امداد دی جائے۔ عارضی طور پر جو یتیم خانے جاری ہوں ان کی مدد کی جائے۔

جب برسات کا موسم آئے تو بارش شروع ہونے سے قبل مویشی اور تخم خریدنے کے واسطے کاشتکاروں میں تقاوی کے طور پر پیشگی رقم تقسیم کرنی چاہیئے تاکہ وہ کھیتی باڑی کا اہتمام شروع کر دیں۔ خیراتی فنڈوں سے ابھی لوگوں کو امداد پہنچانی چاہیئے۔ آمد برشگال کے زمانے میں لوگوں کو امدادی کاموں سے بتدریج ہٹانا چاہیئے۔ اور بطریق احتیاط مفت امداد میں معقول اضافہ کر دینا چاہیئے تاکہ لوگ روزی کی طرف سے پریشان نہ ہوں۔ نئی فصلیں پیدا ہونے سے جب سرکاری امداد کی کوئی ضرورت باقی نہ رہے تو امدادی انتظام بھی ختم کر دینا چاہیئے۔

متعدد قحط کمیشنوں نے جن قواعد کی سفارش کی ہے اور جو قحط کے دستور العمل میں منضبط ہیں بہت مناسب اور موزوں ہیں۔ ان میں اصلاح کی بہت کم گنجایش نظر آتی ہے لیکن محض قواعد کے عمدہ ہونے سے کیا فائدہ جب تک کہ حکام میں جو قواعد سے کام لیتے ہیں بیش بینی، مستعدی اور ہمدردی کا مادہ

نہ ہو۔ انتظام میں تین باتیں مدنظر رہنی چاہئیں۔ اول یہ کہ جہاں تک ممکن ہو سکے مصیبت روکنے کی کوشش کی جائے۔ دوسرے یہ واضح رہے کہ امدادی انتظام جلد شروع کرنے سے خرچ میں کفایت ہو جاتی ہے۔ تیسرے یہ کہ لوگوں کی جان بچانے اور صحت و عافیت برقرار رکھنے کے واسطے امداد میں فیاضی کرنی چاہیئے۔

اسباب قحط

ہم کو محض اس بات پر قناعت نہ کرنی چاہیئے کہ جب قحط کی مصیبت پھیلی تو امداد کر دی۔ مرض کے علاج سے مرض کا روکنا بہتر ہے۔ پس بڑی عقلمندی یہ ہو گی کہ قحط کے اصلی اور حقیقی اسباب دریافت کر کے اس کے روکنے کی کارگر تدابیر اختیار کریں۔ سب سے بڑا اور پہلا سبب خشک سالی ہے یعنی بارش کم ہونا اور دیر سے ہونا یا قبل از وقت ختم ہو جانا۔ ماہرین خصوصی کی رائے میں قلت بارش کا بڑا سبب یہ ہے کہ جنگلات بہت کم باقی رہ گئے اکثر صاف کر دیئے گئے اور اگر جنگلات لگانے کا عمدہ انتظام کیا جائے تو خشک سالی کا خطرہ کم ہو سکتا ہے نہر نالے اور کنویں تالاب جیسے مصنوعی ذرائع آبپاشی تیار کرنا اور بھی ضروری ہے۔ اگرچہ اس معاملے میں بہت کچھ ہو چکا ہے پھر بھی ترقی کی گنجائش باقی ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء کے قحط کمشنر لکھتے ہیں کہ یہ سچ ہے کہ ہر صوبے میں بڑی بڑی نہریں نہیں نکل سکتیں۔ تاہم چھوٹے چھوٹے ذرائع آبپاشی کی گنجائش ابھی کہیں ختم نہیں ہوئی۔ اور ان سے بھی قحط کے روکنے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔ بلکہ بعض بعض صوبوں میں تو ابھی تک ان کی طرف توجہ بھی نہیں کی گئی تالاب اور کنویں جن میں پانی جمع رہے۔ بہت ضروری ہیں اور ان کی تیاری کی گنجائش موجود ہے فصلوں کو محفوظ رکھنے کے واسطے زراعت میں جدید ترقی یافتہ طریق مفید ہوں گے۔ بالخصوص خشک کاشت کا طریق رائج کرنا چاہیئے۔ کبھی فصلیں سیلاب سے بھی تباہ ہو جاتی ہیں۔ اس لئے پانی کی نکاس کا بھی عمدہ انتظام ہونا ضرور ہے۔ کیڑے مکوڑے بھی فصلیں چاٹ جاتے ہیں لیکن سائنس کے ہوتے ہوئے اس خرابی کا علاج کچھ دشوار نہیں۔ یہ شکایت بآسانی رفع ہو سکتی ہے۔

اگرچہ قحط سے یہ قدرتی اسباب بھی کچھ کم نہیں۔ تاہم ایک خاص الخاص سبب معاشی بھی ہے۔ فصل تو خشک امساک یا کثرت بارش سے خراب

ہوتی ہے لیکن لوگ جو اس قدر تباہ اور ضائع ہو جاتے ہیں اسکی خاص وجہ یہی ہے کہ اُن کے پاس کچھ اندوختہ نہیں جو بُرے وقت میں آڑے آئے۔ چنانچہ ۱۸۸۰ء کی قحط کمیشن کا بیان ہے کہ بُرے سے بُرے سال میں بھی اتنی غذا ضرور پیدا ہوتی تھی کہ کل آبادی کے واسطے کفایت کرے۔ ۱۸۹۸ء کی قحط کمیشن نے بھی اس خیال کی تائید میں لکھا ہے کہ ہماری رائے میں ہندوستان میں زائد پیداوار کی مقدار بحیثیت مجموعی اتنی ہوتی ہے کہ اگر جیسے قحط اب تک پڑتے آئے ہیں ملک کے کسی حصے میں کبھی ایسا قحط پڑے تو اس سے کام چل سکتا ہے یعنی اس زاید مقدار سے قحط کی مصیبت ٹلجائے۔ پس معلوم ہوا کہ ملک میں جو مصیبت پھیلتی ہے وہ قحط زر سے پھیلتی ہے نہ کہ غلے کے قحط سے غذا کی کبھی ایسی قلت نہیں ہوتی کہ نہ مل سکے البتہ خریدنے کے واسطے ٹکہ پلے نہیں ہوتا۔ ۱۹۰۱ء کی قحط کمیشن نے یہاں کے کاشتکاروں کے افلاس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اچھے سال تو اس کو روٹی کپڑے سے زیادہ کچھ میسر نہیں آتا اور بُرے سال میں اس کی گزر خیرات پر ہوتی ہے لیکن غریب مزدوروں کی حالت تو کاشتکاروں سے بھی گئی گزری ہے۔ قحط کا پہلا وار انھیں غریبوں پر ہوتا ہے اور یوں تو کوئی طبقہ اور جماعت ایسی نہیں جس پر قحط کا کم و بیش اثر نہ پڑتا ہو۔

عام افلا…

لوگوں کی مالی حالت درست ہونے کے متعلق آج کل خواہ کتنا ہی اختلاف رائے ہو اس کو سب مانتے ہیں کہ ابھی ملک پر ہر طرف کالی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ اس افلاس کے متعدد اسباب نظر آتے ہیں۔ پہلی خرابی تو یہ ہے کہ بیشتر آبادی کا ذریعہ معاش زراعت ہے اور زراعت میں اس قدر منفعت نہیں جس قدر کہ صنعت و حرفت میں ہے۔ بہت سی قدیم دستکاریاں مٹ گئیں اور جدید صنعتوں میں سے بہت کم جاری ہو سکیں۔ ملک میں آبادی تو بڑھ گئی مگر دولت اس نسبت سے نہیں بڑھی۔ نظام حکومت بہت بیش خرچ ہے اس لئے لوگوں پر محصول کا بار بہت پڑ گیا ہے۔ اور سال بسال جوں جوں دولت ملک سے باہر کو ڈھلتی ہے افلاس پھیل رہا ہے۔ علاوہ بریں

مقدمہ بازی کمسنی کی شادی - اور فضول خرچ رسم ورواج لوگوں کو اور بھی کھوکھلا کئے دیتے ہیں ۔

افلاس کا علاج

افلاس روکنے اور دفع کرنے کی بہت سی تدبیریں ہوسکتی ہیں - مزروعہ رقبہ بڑھانے اور جدید طریق زراعت جاری کرنے کے علاوہ لوگوں کے ذرائع معاش بھی وسیع ہونے چاہئیں - سرکار اور عوام ملکر طرح طرح کے کاروبار بڑے بڑے کارخانے چھوٹی دستکاریاں اور گھریلو صنعتیں جاری کریں - کنگھم رقمطراز ہیں - کہ بلاواسطہ بالقصد اور باقاعدہ صنعتوں کو ترقی دینا سرکار کا فرض ہے اور ہندوستان میں سرکار کی اس سے بڑھکر اور کوئی کارگزاری نہیں ہو سکتی - سرکاری مصارف اور مطالبات وطن گھٹیں تو پھر محصول میں بھی کچھ تخفیف ہو - تشخیص مالگزاری میں بھی اعتدال کی ضرورت ہے اور برے سماں میں اس کی تحصیل میں بھی نرمی چاہیئے - بہتر تو یہ ہوتا کہ سرکار زرعی آمدنی میں اپنا حصہ مستقل طور پر معین کرلیتی تاکہ کاشتکار کو ہمیشہ کے واسطے اطمینان ہو جاتا - اپنی محنت کا پھل پاتا - اس طرح پر اس کی مالی حالت بہت کچھ درست ہو جاتی - اگر ترک وطن کا باقاعدہ انتظام ہو جائے تو جہاں آبادی کا بار بہت زیادہ ہے وہاں بھی امن ہو جاتا - امید ہے کہ قرض امداد باہمی کے طریق سے لوگوں کو بہت فائدہ پہونچے گا - قرض کی بیجا زیر باری سے بچیں گے اور کفایت شعاری کی عادت پڑے گی - اگر پنچایت گھر قائم ہو جائیں تو مقدمہ بازی کی وبا کم ہو - اور بڑی ضرورت یہ بھی ہے کہ قوم کے سرگروہ اور رہنما کوشش کر کے برے برے رسم ورواج کا استیصال کردیں -

بعض حلقوں میں یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ قحط اور بیکاری دونوں سے ایک ہی حالت مراد ہے - اس میں شک نہیں کہ قحط میں بہت سے لوگ مارے مارے بیکار پھرا کرتے ہیں - لیکن یہاں کی بیکاری جرمنی اور انگلستان کی سی نہیں بلکہ لکھوکھا مخلوق پر ایسی مصیبت نازل ہوتی ہے کہ یورپ والوں کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتی - اول تو بیشمار جانیں فاقے اور بیماری کی شکار ہوتی ہیں اور جو بچ رہتے ہیں اُن کی حالت کچھ نہ پوچھئے - نڈھال - کنگال - نہ گرہ میں پیسہ نہ کام کرنے کی سکت - قحط کا اثر سرکار پر کیا

کم پڑتا ہے۔ محاصل گھٹے۔ مصارف بڑھے اور تمام دفتر مالیہ زیر و زبر ہو گیا
پس قحط کے مسئلے کو اہم نہ سمجھنا بڑی غلطی اور نادانی ہے۔ اگر سائنس کی ترقیوں
اور سرکاری کوششوں کی بدولت یورپ میں قحط پڑنا محال ہو گیا تو پھر کیا
وجہ کہ غریب ہندوستان ہمیشہ اسی طرح پامال ہوتا رہے۔

یوں تو ہر زراعتی ملک میں قرض ستانی کی بہت ضرورت پڑتی ہے لیکن
اس معاملے میں ہندوستان کا نمبر سب سے بڑھا ہوا ہے۔ سہل اور سستا قرض
بھی خطرناک ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ لوگ بے تحاشا قرض لینا شروع کر دیں
اور بالآخر تباہ ہو جاویں۔ گزشتہ صدی کے وسط میں یورپ میں کچھ
محبان خلق نے اس کام کا بیڑا اٹھایا کہ کاشتکاروں کو سہل اور سستا قرض میسر
آنے لگے اور ساتھ ہی ان میں غیر ضروری قرض کی عادت بھی نہ پھیلنے پاوے۔
خاصکر رفزن اور شلوز نے بڑا کام کیا آج دونوں کا نام زبان زد خلائق ہے
مدت ہوئی کہ سر ولیم ویڈر برن مسٹر جسٹس راناڈے اور دوسرے مدبروں نے
یہ تجویز پیش کی کہ یورپ کی ان امداد باہمی کی انجمنوں کے نمونے پر یہاں بھی
قرض دینے کی انجمنیں قایم کرنی چاہئیں۔ بالآخر ۱۸۹۲ء میں سرکار ہند کو
بھی اس طرف کچھ توجہ ہوئی اور مسٹر فریڈرک نکلسن جو کہ بعد کو خدمات کے
صلے میں "سر" کے خطاب سے سرافراز ہوئے۔ اس کام پر تعینات کئے گئے کہ
تحقیقات کر کے انجمنوں کی تجویز کے متعلق کیفیت پیش کریں۔ چنانچہ ۱۸۹۵ء
میں وہ کیفیت پیش ہوئی۔ اس میں تحریر ہے کہ زراعت کی تمام عالم کی تاریخ
شاہد ہے کہ کاشتکاری کے واسطے قرض ناگزیر ہے۔ ملک کی حالت حیثیت اراضی
کاشتکار کی حیثیت ان باتوں میں خواہ کسی درجہ فرق اور اختلاف ہو۔ لیکن
ایک بات دنیا بھر میں عام ہے وہ یہ کہ قرض لئے بغیر کاشتکار کی گزر نہیں۔
پس ہندوستان کے کاشتکار بھی خوب دل بھر کے قرض لیتے رہتے ہیں۔

سرکاری یا مرکزی بنک تو قدرتہً شہروں میں دیہات سے دور دور
قایم ہوں گے۔ ان سے کاشتکاروں کو اتنا فائدہ نہیں حاصل ہو سکتا جتنا کہ
دیہاتی بنکوں سے جن میں ان کے واسطے خاص سہولتیں موجود ہیں۔ مثلاً

(۱) دیہاتی بنک کاشتکاروں کے قریب ہوں گے۔
(۲) لوگ ایسے بنکوں کا اعتبار کرکے اس میں اپنا روپیہ جمع کریں گے۔
(۳) اُن کو اپنے موکلوں کا پورا پورا حال معلوم ہوگا اور اس وجہ سے اُن پر اثر بھی رہے گا۔
(۴) بنکوں کا کام بہت کم خرچ سے بلکہ تقریباً مفت چل سکتا ہے۔ پس لوگوں کو قرض سستا ملیگا۔ یعنی شرح سود کم رہے گی۔
(۵) مقامی اصل اور اس کا سود سب کا سب اسی گاؤں میں محفوظ رہے گا۔
(۶) بنک گماشتوں کے طور پر اپنے دیہاتی موکلوں کی طرف سے خرید و فروخت کا کام بھی کر سکتے ہیں۔ زرعی پیداوار کو بیچیں اور دیہاتی ضروریات خرید لیں۔
(۷) بنک چاہیں تو دیہاتوں کا غلہ اپنے کھیتوں میں احتیاط سے امانتاً رکھ لیں۔
(۸) زراعت اور صنعت کی ترقی کے معاملوں میں یا کسی مصیبت اور دشواری کے وقت دیہاتی بنک سرکار اور گاؤں کے لوگوں کے درمیان بچولیوں (وسائط) کے طور پر بہت مفید کام انجام دے سکتے ہیں۔
(۹) وہ قرض لینے والوں پر یہ دباؤ بھی ڈال سکتے ہیں کہ روپیہ مناسب طور پر صرف ہو۔ اور نگرانی بھی رکھ سکتے ہیں کہ خلاف معاہدہ زر قرض کسی بیجا کام میں تو صرف نہیں ہوا۔
(۱۰) دیہاتی بنکوں کو دھوکا دینا بھی مشکل ہے۔ کیونکہ گاؤں میں وہ ایک ایک کے حال سے واقف ہوں گے۔
(۱۱) بنکوں کے ذریعے سے دیہاتیوں کو کفایت شعاری میل جول اور خود امدادی کی تربیت حاصل ہوگی۔
(۱۲) دیہاتیوں میں اعلیٰ درجے کی ذاتی استعداد۔ خدمت عامہ کا شوق اور قومی خصلتیں پیدا ہو جائیں گی۔

جب سرکار ہند کو خوب یقین ہو گیا کہ قرض امداد باہمی کی انجمنیں ملک کی ترقی کے واسطے ضروری اور مفید ہیں تو ۱۹۰۴ء میں ایک قانون انجمنہائے

قرض امداد باہمی پاس ہوا۔ اور ہر طبقے نے نہایت گرمجوشی سے اس کی تائید کی۔ اس قانون میں انجمنوں کی تین قسمیں قرار پائیں۔(۱) مرکزی (۲) قصباتی اور (۳) دیہاتی ۱۹۱۲ء کے قانون نے قصباتی اور دیہاتی کی تفریق مٹا کر دو قسمیں قرار دیں یعنی محدود اور غیر محدود ذمہ داری کی انجمنیں۔ جب تک کہ مقامی حکومت کسی خاص یا عام حکم کے ذریعے سے کچھ اور ہدایت نہ کرے۔ اس قانون کی رو سے :۔

(۱) جن انجمنوں کے رکن دوسری چھوٹی چھوٹی انجمنیں ہوں انکی ذمہ داری محدود ہوگی۔

(۲) جو انجمنیں کہ اپنے اراکین کو قرض دینے کے واسطے قائم ہوں، اور جن کے بلشتر اراکین کاشتکار لوگ ہوں اور دوسری انجمنیں اُن کی رکن نہ ہوں۔ ایسی انجمنوں کی ذمہ داری غیر محدود ہوگی۔

رجسٹری کے شرائط یہ ہیں۔(۱) انجمن میں کم سے کم دس رکن ہونے چاہئیں (۲) ہر رکن کی عمر ۱۸ سال سے زاید ہو۔(۲) سب رکن ایک ہی قصبے یا گاؤں یا آس پاس کے رہنے والے ہوں۔ یا ایک ہی ذات برادری یا پیشہ رکھتے ہوں۔

ان انجمنوں کا انتظام جمہوری طرز کا ہوتا ہے۔ خود اراکین ہی اپنے میں سے کچھ ممبر منتخب کر کے سال بسال بھر کے واسطے انتظامی مجلس مقرر کر دیتے ہیں۔ انتظامی مجلس کے رکن بالعموم اپنی خدمت کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے۔ ہر ممبر کو صرف ایک رائے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اگر انجمن کی ذمہ داری محدود ہو تو کہیں ایک سے زیادہ رائے کا بھی قاعدہ ہوتا ہے۔

رجسٹرار کے حکم سے ہر انجمن کے حسابات کی جانچ پرتال ہوتی رہتی ہے رجسٹرار انجمن کے رجسٹر۔ بہی کھاتے۔ اور مسلیں جب چاہے دیکھ سکتا ہے۔

ان انجمنوں کو خاص حقوق بھی حاصل ہیں۔ مثلاً :۔

(۱) وہ شخصیے مانی جاتی ہیں یعنی اُن کو دوامی وراثت۔ مشترک مہر۔ اور معاہدہ سازی کے حقوق حاصل ہیں۔

(۲) سرکاری مالگزاری کے سوا رجسٹری شدہ انجمن کے مطالبے کو باقی تمام مطالبوں پر فوقیت حاصل ہے۔ یعنی قانوناً موجودہ اور سابق ممبروں پر

باب ۱۴

اول اس کی ادائی لازم ہے۔

(۳) انجمن کے حصے قرق نہیں ہو سکتے۔

(۴) حصہ دار کی وفات کے بعد حصہ اس کے ورثہ کو مل جاتا ہے۔

(۵) انجمنوں کو محصول آمدنی۔ محصول اسٹامپ اور فیس رجسٹری بھی معاف ہو سکتی ہے۔ لیکن جہاں ممبروں کے خاص حقوق ہیں۔ وہاں اُن پر کچھ ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔

انجمن کی قسم کے لحاظ سے اراکین کی ذمہ داری محدود ہوتی ہے یا غیر محدود۔ سابق ممبر دو سال تک انجمن کے قرضے کا دیندار رہتا ہے اور متوفی ممبر کی جائداد پر اس کا بار ایک سال رہتا ہے۔

لین دین میں بھی چند بندشیں لگا دی ہیں۔ کوئی انجمن جسکی ذمہ داری غیر محدود ہو۔ جائداد منقولہ کی ضمانت پر قرض نہیں دے سکتی اسی طرح قرض لینے کے قواعد بھی مقرر ہیں اور مقامی حکومت حسب ضرورت قواعد جاری کرنے کی مجاز ہے۔

ان انجمنوں کے فنڈ یا ذخیرے کئی طرح پر کام میں لگ سکتے ہیں۔ یا تو سرکاری سیونگ بنک میں جمع کر دئے جائیں یا کسی اور جگہ جسکی قانون وقف اجازت دے۔ یا کسی دوسری رجسٹری شدہ انجمن کے حصے خرید لئے جائیں یا ایسے بنکوں میں یا ایسے شخصوں کے پاس جمع کر دیئے جائیں جن کو رجسٹرار منظور کرلے یا اور کسی ایسے کام میں لگا دیئے جائیں جس کی قواعد میں اجازت ہو۔

فنڈ کا تو کوئی حصہ بھی مقسوم کے طور پر لوگوں میں تقسیم نہیں ہو سکتا البتہ منافع تقسیم ہو سکتا ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ اول اس کا ایک چوتھائی حصہ محفوظ فنڈ یا ذخیرے میں لازماً داخل کر دیا جائے۔ اور موجودہ یا سابق سال کا جتنا منافع باقی بچے وہ بہ پابندی قواعد اراکین میں تقسیم ہو۔ لیکن اگر انجمن کی ذمہ داری غیر محدود ہو تو منافع بھی مقامی حکومت کی اجازت بغیر تقسیم نہیں ہو سکتا۔ البتہ ایک چوتھائی منافع محفوظ فنڈ میں داخل کرنے کے بعد انجمنیں چاہیں تو بہ اجازت رجسٹرار باقی منافع کا دس فی صدی خیراتی کاموں میں صرف کر سکتی ہیں۔

انجمن ہائے قرض امداد باہمی میں روپیہ لگانے کے واسطے کچھ مرکزی بنک کھلے ہیں۔ لیکن ابھی ایسے بہت سے بنک درکار ہیں۔ ایک بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ انکے وسیلے سے تمام منتشر انجمنوں کا عام بازار زر سے میل ہوجاتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ انجمنوں کی فاضلات بھی ان کے ذریعے سے تقسیم ہوجاتی ہیں۔ سرکار بھی کم شرح سود پر انجمنوں کو قرض دیتی ہے۔

سرکار ہند نے جو تحریک حال میں شائع کی ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ طریق امداد باہمی یہاں بھی اچھی طرح جڑ پکڑ چکا ہے سرکار خود کیفیت حال میں لکھتی ہے کہ آج سے دس سال قبل چند متفرق تجربوں کے سوا طریق امداد باہمی کا ہندوستان میں کچھ بھی نشان نہ تھا۔ اور آج بارہ ہزار سے زیادہ انجمنیں موجود ہیں۔ جن میں چھ لاکھ رکن شریک ہیں اور جن میں پانچ کرور روپے سے زیادہ اصل کام میں لگی ہوئی ہے۔ انجمنوں کی یوں تو ہر طرف خواہش ہو رہی ہے۔ مگر ان کے قیام میں احتیاط کرتے ہیں یہ سچ ہے کہ ابھی ہندوستان میں فی بیس ہزار زرعی آبادی ایک انجمن کا اوسط پڑتا ہے۔ حالانکہ اٹلی میں اس حساب سے ۱۸ اور جرمنی میں ۵۲ کا اوسط نکلتا ہے لیکن یہ بھی تو یاد رکھنا چاہیئے کہ ہندوستان میں یہ طریق ابھی شروع ہوا ہے۔

اب معاشی فوائد کو لیجئے۔ کاشتکاروں نے جو ساہوکاروں کے بجائے انجمنوں سے قرض لیا تو سود میں ان کو تخمیناً بیس لاکھ روپے سالانہ کی کفایت ہوگئی اور آگے چلکر تو اس کفایت کی مقدار کہیں سے کہیں پہنچ جائے گی۔ مزید براں طریق امداد باہمی کے پھیلنے اور اعتبار یعنی قرض کے بس دیں پر جمہوریت کا رنگ چڑھنے سے یہ نتیجہ نکلا کہ جو روپیہ بطور دفینہ بیکار پڑا ہوا تھا وہ بنکوں میں جمع ہوکر بطور اصل کاشتکاروں کے کام آنے لگا۔ قدیم قرض بے باق ہوگئے اور رہن بھی چھوٹ گئے۔ امداد باہمی کے طفیل سے کاشتکاروں کو کھاد۔ تخم اور آلات سستے ملنے لگے۔ مویشیوں کی پرورش اور نسلوں میں ترقی ہونے لگی۔ اس کے ذریعے سے کاشتکاروں میں مفید معلومات پھیلنی شروع ہوگئی۔

امداد باہمی کے رواج سے دماغی اور اخلاقی فوائد بھی حاصل ہوئے۔ اب جو

پرامیسری نوٹ یعنی سرکاری تمسک پر دستخط کرنے پڑتے ہیں اور باقاعدہ حساب کتاب رکھنا پڑتا ہے تو لوگوں کو لکھنے پڑھنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ چونکہ انجمن کی شرکت کے واسطے چال چلن کا اچھا ہونا شرط ہے۔ لوگوں کو اپنا اپنا رویہ درست کرنا پڑ رہا ہے کفایت شعاری کی عادت پھیل رہی ہے چونکہ ذمہ داری غیر محدود ہے یعنی ہر رکن فرداً فرداً نہ صرف اپنے بلکہ دوسرے رکنوں کے قرضے کا بھی دین دار شمار ہوتا ہے اس لئے کسی کو بھی فضول اور غیر پیداآور کاموں میں روپیہ خرچ کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ سب رکن ایک دوسرے کے نگران حال رہتے ہیں۔ ضبط۔ پابندی وقت۔ راست بازی خودداری کفایت شعاری۔ یہ سب اوصاف روز افزوں ہو رہے ہیں۔ بعض بعض جگہ مقدمہ بازی بہت گھٹ گئی۔ کہیں کہیں مدرسہ جاری کرنے، تعلیمی وظائف دینے، آبرسانی، آبپاری اور صفائی کے واسطے فنڈ قائم ہو گئے۔ انتظامی کمیٹیاں۔ آپس کے جھگڑوں کا تصفیہ کرتی ہیں اور مختلف خدمتیں انجام دیتی ہیں۔ یہی کام کبھی پنچایتوں کے سپرد تھے۔ چونکہ اتحاد اور یکدلی اس تحریک کی جان ہے امید ہے کہ اس کے طفیل سے پھر وہی دیہاتی جمعیت پیدا ہو جاوے گی جو آج کل کی افراتفری سے بہت ضعیف ہوتی جاتی ہے۔

کچھ لوگوں کی تجویز ہے کہ انجمن ہائے امداد باہمی کے قانون کے تحت میں دھرم گولوں کو بھی رجسٹری کیا جائے۔ سر ڈینیل ہملٹن کی رائے ہے کہ زمیندار یا کاشتکار ملکر اتنا غلہ فراہم کریں کہ دھرم گولے قایم ہو جائیں۔ غلہ قرض دیا جائے گا اور غلے ہی کی شکل میں اس پر سود لگے گا۔ اصلی غلہ اور اس کا سود اسی گولے میں جمع ہوتا رہے گا اور اسی گاؤں کے کام آئیگا۔ سر ڈینیل لکھتے ہیں کہ کچھ دنوں میں دھرم گولے گاؤں کے گودام بن جاویں گے۔ دیہاتی لوگ اپنی کل پیداوار اسمیں داخل کر کے اس کی ضمانت پر وقتاً فوقتاً مناسب شرح سود پر قرض لیتے رہیں گے پھر اُن کو آج کل کی طرح اپنا سارا مال ایک ہی بار فروخت کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اور نہ وہ اپنا مال اپنے کرمفرما بنئے کے سپرد کرنے پر مجبور ہونگے اور جب مال ایک ہی دفعہ بازار میں نہ آئے گا تو قیمت بھی اچھی ملے گی۔

سرکاری

چند سال سے یہ بحث چھڑی ہوئی ہے کہ ہندوستان میں ایک سرکاری یا مرکزی بنک قائم ہونا چاہیئے۔ جرمنی۔ فرانس۔ جاپان۔ روس۔ اٹلی اور دوسرے مہذب ملکوں میں سرکاری بنک پہلے سے موجود ہیں۔ امریکہ میں بھی ایک مرکزی بنک قائم ہوا چاہتا ہے۔ پھر کیا وجہ کہ یہاں بھی سرکار اپنی نگرانی میں ایک مرکزی بنک قائم نہ کرے۔ اس تجویز کے حامی سرکاری بنک کے جو جو فوائد بتاتے ہیں ان میں سے خاص خاص یہ ہیں:

اول وہ فوائد لیجیے جو سرکار کو حاصل ہوں گے۔

(الف) اس وقت کوئی بڑی سرکاری یا نیم سرکاری انسٹی ٹیوشن یا بنک نہیں جس میں باقاعدہ طور پر سرکاری فاضلات جمع ہوتی رہیں۔ اور اگر سول عہدہ داروں کو اختیار دیا جاوے کہ وہ اپنی احتیاط سے فاضلات کو قرض پر چلا دیں تو بھی مشکل ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جس زمانے میں سرکاری فاضلات بڑھتی ہیں بہت سا روپیہ بازار سے سمٹ جاتا ہے۔ اگر سرکاری بنک قائم ہو جائے تو سرکاری خزانوں کا موجودہ طریق ختم ہو جائے اور ساتھ ہی یہ سب دقتیں بھی رفع ہو جائیں۔

(ب) یہ جو اعتراض ہے کہ سرکار بڑی بڑی رقمیں لندن میں قلیل المدت قرضوں پر لگائے رکھتی ہے۔ یہ بھی رفع ہو جائے گا۔ کیونکہ بنک کے ذریعے سے پھر طلائی قرضوں میں رقم لگ سکے گی۔

(ج) اگر نوٹ بنک کے ذریعے سے جاری ہوں اور بنک اُن کے بھنانے کا اور بھی سہولت افزا انتظام کر دے تو وہ بہت زیادہ ہر دلعزیز ہو سکتے ہیں۔ سا اوران کے رواج میں بہت ترقی ہونی ممکن ہے۔

(د) اگر فاضلات۔ اجرائے نوٹ۔ ارسال زر اور لندن بازار کا قرضہ۔ یہ سب مدیں بنک کے سپرد کر دی جائیں تو سرکاری عہدہ دار بہت سی مالی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جاویں اور دوسرے کاموں میں زیادہ توجہ کر سکیں۔

(ہ) سرکار کے ہاں ایسے اعلٰے عہدہ داروں کی ایک جماعت تیار ہو جاویگی

جو مال اور بنک کے کام میں نہایت ماہر ہوں گے۔ حال کے سول عہدہ دار خواہ کتنی ہی مناسبت طبع اور تیزی ذہن کیوں نہ رکھتے ہوں پھر بھی ان کا کام کچھ اور ہی ہے۔

(و) سرکار ہند بھی مالی معاملات میں وزیر ہند کی فضول فروعی نکتہ چینیوں سے محفوظ ہو جاوے گی۔

دوسرے وہ فوائد لیجئے جو بنک کے قیام سے کاروبار والوں کو حاصل ہوں گے۔

(الف) کچھ تو سرکاری فاضلات مرکزی بنک میں جمع رہنے سے اور کچھ نوٹوں کی اجرا میں اصلاح ہونے سے معقول رقم کاروبار کے واسطے دستیاب ہونے لگے گی۔

(ب) شرح بنک میں جو آجکل اس قدر تغیرات ہوتے ہیں اور گرم بازاری کے زمانے میں وہ اس قدر چڑھ جاتی ہے یہ خرابی بھی کسی حد تک رفع ہو جاوے گی۔

(د) سرکار اگر بنک کا کام اپنے ہاتھ میں لے لے تو شاخیں کھلنے سے بنک کے کاروبار کی سہولتیں ملک کے ان حصوں میں بھی پیدا ہو جاویں۔ جہاں آج کل ان کی سخت ضرورت ہے۔ اول تو بلا واسطہ ایسا انتظام ہونا چاہیئے۔ دوسرے اس طرح سے کہ سرکاری بنک کے سہارے اسے شخصی کے اور امداد باہمی کے بنک قائم ہو جاویں۔

(ہ) بٹہ پینے لگانے کے واسطے سہولتیں پیدا کرنا گو سردست زیادہ ضروری معلوم نہ ہو مگر یورپ کے تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ بالآخر ہندوستان میں بنک کا کاروبار اسی راہ سے ترقی پائے گا۔ سرکاری بنک سے عوام کو بھی فوائد حاصل ہوں گے۔ مثلاً سرمایۂ مشترک کے بنکوں کو اس سے امداد ملے گی اور انجمن ہائے قرض امداد باہمی میں اس کا روپیہ لگ سکے گا۔

جو لوگ اس تجویز یعنی سرکاری بنک کے خلاف ہیں وہ حسب ذیل اعتراضات پیش کرتے ہیں۔

(الف) اول تو یہی فیصلہ دشوار سوال ہے کہ بنک کا صدر دفتر کہاں قائم ہو۔ جس پریزیڈنسی شہر میں بھی قائم کیجئے باقی شہر اس کو گوارہ نہیں کرینگے۔ اگر دہلی میں قائم کیجئے تو وہ ہندوستان کی مالی دنیا سے الگ رہے گا۔

(ب) ہندوستان جیسے وسیع ملک میں کسی ایک مرکز سے کل کاروبار کی نگرانی کرنا محال ہے اور صوبے صوبے میں لین دین کا طریق حسب حالات مختلف ہے۔

(ج) سرکار کی ذمہ داریاں کم تو کیا ہوں گی اور الٹی بڑھ جائیں گی۔ کبھی کوئی نازک وقت پڑا تو سرکار کو بڑی دقت کا سامنا ہوگا۔

(د) سرکار ہند اور وزیر ہند میں آئے دن حجت ہوا کرے گی۔

(ہ) مبادلہ بنک بالکل بیٹھ جاویں گے۔ حالانکہ اب تک انھوں نے تجارت اور کاروبار کو بہت خوبی اور کفایت شعاری سے چلایا ہے۔

ماہرین کی سرکاری بنک قائم ہو یا نہ ہو۔ اس مسئلے پر ماہرین کی رائے دونوں طرف ہمپلہ نظر آتی ہے مسٹر جے۔ ایم۔ کینس اور چند دیگر معاشیین تو اس کے مؤید ہیں۔ لیکن ماہرین مال مثلاً سرگائی فلیٹ وڈ ولسن۔ سر فلکس شسٹر اور لارڈ انچکیپ اس کے خلاف ہیں۔ بالخصوص سرگائی ولسن کو سرکاری بنک کے قیام میں بہت دشواریاں اور خطرے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے جواب میں صاف فرمایا کہ اگر بنک قائم ہوا تو اس سے کشمکش بڑھے گی۔ اور وزیر مال کو اپنی جگہ سنبھالنی مشکل ہو جاوے گی۔ سر فلکس شسٹر کا خیال ہے کہ سرکار بعض مالی کام اور ذمہ داری کسی بنک کے سپرد نہیں کرسکتی۔ لارڈ انچکیپ کی پختہ رائے ہے کہ بنک سے نہ تو سرکار ہی کو کچھ فائدہ ہوگا اور نہ ملک کی تجارت کو سرکار ہند کا رجحان بقول سر جیمس مسٹن یہ ہے کہ سردست یہ مسئلہ عملی سیاسیات سے باہر ہے۔ چیمبرلین کمیشن اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے۔ ہم سرکاری بنک کے موافق رائے دے سکیں نہ مخالف۔ البتہ ہماری رائے میں اس پر جلد غور و خوض ہونا چاہیئے۔

ریلوے لارڈ ڈلہاوزی کے زمانے تک تو ریلوں کی طرف کوئی توجہ ہی نہ تھی۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد جب ریلوں کی جنگی اہمیت معلوم ہوئی تو جلد جلد ریلیں نکلنی شروع ہوئیں۔ ۳۰ مارچ ۱۹۱۳ء کو جس قدر ریلوے لائن جاری تھیں اور انمیں جسقدر رقم لگ چکا تھا اس کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔

| قسم | طول | لاگت |
|---|---|---|
| سرکاری لائن سرکاری انتظام | ۷۰۲۳ میل | ۸۴۳۷۲۲۰۰ پونڈ |
| سرکاری لائن کمپنی کا انتظام | ۱۸۳۱۸ " | ۱۹۴۲۷۵۶۰۰ " |
| کمپنی کی لائن گارنٹی شدہ معاہدہ جدید | ۳۲ " | ۲۰۱۲۶۷ " |
| مجلس ضلع کی لائن | ۱۵۵ " | ۴۷۲۷۳۳ " |
| امدادی کمپنی کی لائن | ۳۸۰۷ " | ۱۷۴۸۵۵۳۳ " |
| غیر امدادی کمپنی کی لائن | ۶۹ " | ۱۲۲۸۶۷ " |
| دیسی ریاستوں کی لائن کمپنی کا انتظام | ۲۰۵۶ " | ۱۰۳۶۳۵۳۳ " |
| دیسی ریاستوں کی لائن اور ریاستوں کی ریلوے ایجنسی کا انتظام | ۲۵۷ " | ۱۰۴۳۸۶۷ " |
| دیسی ریاستوں کی لائن اور ریاستوں کا انتظام۔ | ۱۸۰۸ " | ۴۲۹۵۲۰۰ " |
| مقبوضات غیر کی لائن | ۷۴ " | ۱۳۰۷۸۶۷ " |
| میزان | ۳۳۵۹۹ میل | ۳۱۳۹۳۹۶۶۷ پونڈ |

گرچہ ریلیں جنگی اور انتظامی اغراض سے جاری ہوئیں۔ تاہم ملک پر ان کا معاشی اثر بھی بیحد پڑا۔ جب تھوڑے سے خرچ سے بسہولت و بسرعت آمد و رفت ہو سکے تو گنجان خطوں کی زائد آبادی ایسے مقامات میں جا بستی ہے جہاں آبادی ہلکی ہو اور جہاں محنت کرنے سے خوب فصلیں پیدا ہونے لگیں۔ ان نئے مقامات میں محنت کی پیداوار بڑھ جاتی ہے اور اجرت بھی اچھی ملتی ہے۔ ریلوں کی بدولت ملک کے مختلف حصوں میں قیمتیں بھی ایک سطح پر آ رہی ہیں خاص خاص چیزوں کے حق میں ملک کا ملک ایک بازار بن گیا کہ تمام جگہ قیمت یکساں رہتی ہے قحط

کے زمانہ میں ریلوں کی قدر معلوم ہوتی ہے۔ شاید ہی کبھی ایسا ہوتا ہو کہ تمام ملک میں ایک ساتھ قحط پڑے۔ اکثر تو یہ دیکھا ہے کہ کسی حصہ میں قحط پڑا تو دوسرے حصوں میں خوب فصلیں ہوئیں۔ اب ریلیں خوشحال مقامات کی زائد پیداوار قحط زدہ حصوں میں پہونچا کر وہاں کی کمی کو پورا کردیتی ہیں اس طرح فاقہ کشی کی مصیبت بہت گھٹ جاتی ہے علاوہ بریں ریلوں سے لوگوں میں طرح طرح کے معاشی ولولے پیدا ہو رہے ہیں۔ ریلوں کا اخلاقی اور معاشرتی زندگی پر بھی کچھ کم اثر نہیں پڑا۔ ان کا سیاسی فائدہ تو اسی سے ظاہر ہے کہ ان کی بدولت مرکزی حکومت کا طریق یہاں اس خوبی سے چل رہا ہے۔

برآمد میں سہولت پیدا کر کے ریلوں نے قیمتیں بڑھادیں اور بدیسی مصنوعات کی درآمد سے سودیشی صنعتیں تباہ ہوگئیں۔ علاوہ بریں ریلوے لائنوں کی بلند سطح سے پانی کے قدرتی بہاؤ میں رکاوٹ پیدا ہوگئی۔ اور لائنوں کے دونوں طرف پانی جمع رہنے لگا اس کا اثر لوگوں کی صحت پر برا پڑا ہے۔ کچھ ریلیں تو سرکار کی طرف سے تیار ہوئیں۔ اور باقی کمپنیوں نے تیار کرائیں۔ البتہ سرکار نے ۵ فیصدی سود کا ذمہ لے لیا۔ یہی طریق گارنٹی کہلاتا ہے۔ بعض کمپنیوں کو گارنٹی کے بجائے مختلف قسم کی امداد ملی مثلاً زمین مفت مل گئی اور اور رعایتیں ہوئیں۔

سنہ ۱۸۹۶ء تک ریلوں سے منافع کے بجائے الٹا خسارہ ہوتا رہا۔ چنانچہ اس سال نقصان کی مقدار ۱۵ کرور ۴۸ لاکھ روپیہ تک پہونچ گئی لیکن اسکے بعد سے حالت سدھرتی گئی حتیٰ کہ سنہ ۱۳-۱۹۱۲ء میں کل جاری شدہ لائنوں پر اصل کی مجموعی مقدار کے حساب سے ۴۸ء۶ فی صدی منافع ملا۔

اب چونکہ ریل ہندوستان کے مختلف حصّوں کو ایک دوسرے سے ملا چکی ہندوستانی مدبرین کا خیال ہے کہ نہ تو سرکار اب قرض کے روپے سے کوئی نئی لائن بنائے اور نہ گارنٹی کے طریق پر کسی کمپنی ہی سے لائن بنوائے۔ چونکہ ریلوں میں جو اصل لگتا ہے وہ بیشتر یورپ سے آتا ہے سود اور منافع کی شکل میں ہر سال ایک بڑی رقم ہندوستان کی جیب سے باہر چلی جاتی ہے پس اب

اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ریلیں حتی الوسع مقامی جماعتیں تیار کریں۔ اور سرکار ریلوں کے بجائے آبپاشی میں زیادہ تر روپیہ لگائے۔

اگر ریلیں سرکار کی ملک ہوں تو اس طریق میں خوبیاں اور خرابیاں دونوں موجود ہیں۔ اول خوبیوں کو لیجئے:۔

(۱) ریلوں کے منافع سے سرکاری آمدنی بڑھتی ہے۔

(۲) سرکاری ریلوں پر مسافروں کے آرام و آسائش کا زیادہ خیال رہتا ہے۔

(۳) شرح کرایہ بھی واجبی ہوتی ہے۔ اور ملک کی معاشی ترقی کی خاطر اس میں ضروری ترمیم بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس طریق میں دو خرابیاں خاص طور پر بتائی جاتی ہیں:۔

(۱) ریلوے عہدہ داروں کو ذاتی دلچسپی کم ہو گی۔ اس وجہ سے انتظام میں کفایت شعاری نہ ہو سکے گی اور مصارف بڑھے رہیں گے

(۲) ایک خدشہ یہ ہے کہ صنعت و حرفت میں سرکاری مداخلت ہونا خود صنعت و حرفت کے واسطے مضر ہے۔

ہندوستان کی ریلوں کے انتظام کی بابت اکثر طرح طرح کی شکایتیں سننے میں آتی ہیں ریلوے حکام اور ملازم بہت کھنچے کھنچے رہتے ہیں۔ مسافروں کے آرام و آسائش کی زیادہ پروا نہیں کرتے اور ریلوے ملازمت کے اعلے عہدوں تک ہندوستانیوں کی رسائی بھی بہت کم ہوتی ہے۔ لیکن سب سے بڑی شکایت جو ہے وہ یہ کہ شرح محصول میں اس قسم کے فرق رکھے جاتے ہیں کہ سودیشی چیزوں پر بدیسی مصنوعات کو فوقیت حاصل ہو جاتی ہے۔ مثلاً شیشہ آلات اور دیا سلائی جو باہر سے آتی ہے اس کا محصول خاص طور پر کم رکھا ہے۔ جسکی وجہ سے یہاں کے شیشے اور دیا سلائی کے کارخانوں کو مال نکالنے میں دقت پیش آتی ہے۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تھوڑی مقدار تھوڑے فاصلے تک لے جانے میں کمپنی کا خرچہ زیادہ پڑتا ہے۔ اور بڑی مقدار زیادہ فاصلے تک لے جانے میں کم۔ اس عذر میں جسقدر بھی اصلیت ہو۔ بہر حال یہ ظاہر ہے کہ کرایہ کی موجودہ شرحیں دیسی صنعتوں اور داخلی تجارت کی ترقی

کے موافق نہیں بلکہ مخالف ہیں۔ ایک شکایت یہ بھی ہے کہ چونکہ بہت کم ایسی ریلیں ہیں جن میں باہم رقابت اور مسابقت ہو۔ ریلوے حکام یہ کوشش کرتے ہیں کہ جتنا کرایہ بھی وصول ہو سکے وصول کیا جائے چند سال ہوئے سر فریڈرک لیلی نے فرمایا تھا کہ ریلوے کے ہر ناظم یا ٹریفک منیجر کو اس تمام حصۂ ملک میں جہاں جہاں کی ریلیں گزرتی ہیں۔ غیر ذمہ دارانہ قسم کے اختیارات حاصل ہیں حالانکہ وہ اختیارات ایسے ہیں کہ کسی مزدور کو نہ ملنے چاہیئیں۔ اور بالخصوص ایسے شخص کو جو اپنے نقطۂ نظر سے بجا طور پر اپنے مالک کے منافع کو سب پر مقدم سمجھتا ہو۔ ہر ریلوے کمپنی کی قدرتاً یہی خواہش رہتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ منافع کمائے لیکن چونکہ اب بہت سی ریلیں سرکار کی ملک بن گئی ہیں عوام کو یہ توقع کرنیکا پورا حق حاصل ہے کہ ملک کی معاشی فلاح اور بہبود اس طرح سرا سر نظر انداز نہ کی جائے گی۔ جیسے کہ اب تک ہو رہی ہے۔ چنانچہ بعض بعض محبان وطن چند سال سے شاہی مجلس وضع قوانین میں اس قسم کی تحریکیں پیش کر رہے ہیں کہ سرکار ریلوں کا انتظام کمپنیوں سے نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لے۔

آبپاشی

اس سے قبل بیان ہو چکا ہے کہ ہندوستان کے بہت سے حصوں میں بارش بالعموم ضرورت سے کم ہوتی ہے اور کہیں بکثرت ہوتی ہے تو ایسے نادقت کہ فصل کو نفع کے بجائے الٹا نقصان پہونچ جاتا ہے۔ ان تمام حصوں میں زراعت کے واسطے ذرائع آبپاشی درکار ہیں۔

ہندوستان میں ذرائع آبپاشی بہت قدیم زمانے سے رائج ہیں جگہ جگہ ہندو اور مسلمان حکمرانوں کے بنائے ہوئے نالے نہر اب تک ٹوٹے پھوٹے موجود ہیں۔ ہندو راجہ مہاراجوں نے بالخصوص تالاب بہت بنوائے۔ جن میں سے اب بھی ہزارہا موجود ہیں۔ بہت سوں میں مٹی بھر گئی۔ بہت سے منہدم ہو گئے اور بہت سے خشک پڑے ہیں۔ جن نالوں سے ان میں پانی آتا تھا وہ بھی ٹوٹ پھوٹ گئے۔ تمام جنوبی ہندوستان تالابوں سے پٹا پڑا ہے۔ اور اب بھی انکے ذریعہ سے لکھوکھا ایکر زمین کی آبپاشی ہوتی ہے تالاب چھوٹے بڑے سب قسم کے ہیں۔ کسی میں پانی کی سطح چند ایکر ہے تو کسی میں

دس بارہ مربع میل تک پھیلی ہوئی ہے۔ کہیں کہیں تالابوں میں ایسا سلسلہ قائم ہے کہ ایک کا زائد پانی نیچے کے دوسرے تالاب میں چلا جاتا ہے۔ شمالی برا میں بھی بہت سے تالاب موجود ہیں۔ شمالی ہندوستان میں زیادہ تر آبپاشی کنوؤں سے ہوتی ہے۔

برطانوی حکومت کے شروع شروع میں آبپاشی کی طرف سے بہت بے توجہی کی گئی۔ اور یہی وجہ ہے کہ بہت سے اچھے اچھے ذرائع آبپاشی از کار رفتہ ہو گئے سر آرتھر کاٹن نے قدیم تالابوں کی مرمت اور جدید نہر نالوں کی تعمیر کے واسطے ہزار تاکید کی لیکن کہیں گذشتہ صدی کے وسط سے سرکار کو اس طرف معقول توجہ ہوئی۔

آبپاشی کا سب سے سادہ اور سہل طریق تو یہ ہے کہ ندی اور دریاؤں کا زائد پانی سیلابی نالوں کے ذریعہ سے کھیتوں میں چھوڑ دیا جائے۔ دریا کے کنارے سے چھوٹے چھوٹے نالے نکال دیتے ہیں۔ جب سیلاب آتا ہے تو ان سب میں پانی چڑھ جاتا ہے۔ دریائے انڈس اور اس کے معاونوں کی وادیوں میں ایسے نالے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ آبپاشی کا یہ طریق غیر مفرر سا ہے۔ سیلاب آیا تو پانی ملا ورنہ نہیں۔

دائمی نہریں البتہ آبپاشی میں بہت مدد دیتی ہیں۔ مدراس میں ایک ہندو راجہ کرشن رائے نے سولھویں صدی میں آب پاشی کی غرض سے دریاؤں میں بہت سے بند لگوائے جو اب بھی موجود ہیں۔ شمالی ہندوستان میں جمنا کی نہریں سب سے قدیم ہیں۔ مغربی نہر کو کہتے ہیں فیروز شاہ نے چودھویں صدی میں تیار کرایا تھا۔ کچھ عرصہ تک وہ اٹی پڑی رہی۔ اس کے بعد اکبر اور شاہ جہاں نے اس کو پھر درست کرا دیا۔ مشرقی نہر شاہ جہاں نے نکلوانی شروع کی لیکن انگریزوں کے ہاتھ سے اس کی تکمیل ہوئی۔ برطانوی حکومت میں پہلے پہل مدراس میں دریاؤں کے دہانوں کے ڈیلٹا یا "کونوں" سے کچھ نہریں نکالی گئیں۔ ان میں دریائے کاویری کا سلسلۂ انہار سب سے قدیم ہے۔ ڈیلٹا کی نہروں میں یہ سلسلہ سب سے بڑا ہے۔ اور تمام ہندوستان کی نہروں میں

سب سے زیادہ کارآمد بھی یہی ہے اس قسم کے ڈیلٹا کی نہروں کے سترہ سلسلے مدراس میں موجود ہیں۔ اور ایک سلسلہ مہاندی کے ڈیلٹا کی نہروں کا اوڑیسہ میں پھیلا ہوا ہے۔ پنجاب کی جدید نہروں میں سب سے اول نہر باری دوآب سنہ ۱۸۵۰ء میں بنتی شروع ہوئی اس کے سلسلے میں ۳۶۹ میل تک نہر اور شاخیں جاری ہیں اور ۱۲۰۰ میل تک نالے پھیلے ہوئے ہیں۔ نہر سرہند سنہ ۱۸۶۹ء میں دریائے ستلج سے نکلی اور سنہ ۱۸۸۲ء میں جاری ہوگئی۔ نہر چناب کا سلسلہ پنجاب میں سب سے بڑا ہے، ۴۰۰ میل تک نہر اور بارہ سو میل نالے نہر۔ جھیلم جس سے پندرہ لاکھ ایکڑ کی آبپاشی ہوتی ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں بن کر تیار ہوئی۔ اوپر کی نہر چناب اور نیچے کی نہر باری دوآب سنہ ۱۹۱۳ء میں جاری ہوئی۔ نہر مثلث جو عنقریب تیار ہوا چاہتی ہے۔ ہندوستان میں نہری انجینیری کا ایک شاندار کارنامہ شمار ہوگی۔ اس سلسلے کے ذریعہ سے جھیلم کا زائد پانی چناب میں چلا جاتا ہے اور جو کچھ باقی بچتا ہے وہ دریائے راوی میں ہوکر نیچے کی نہر باری دوآب میں جا گرتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے تقریباً بیس لاکھ ایکڑ کی آبپاشی ہوسکے گی۔

صوبۂ متحدہ میں نہر گنگ اور نیچے کی نہر گنگ یہ دو خاص دوامی سلسلے ہیں ان میں سے پہلے میں ۴۴۰ میل نہر اور شاخیں اور ۲۷۰۰ میل نالے دوسرے میں ۵۵۸ میل نہر اور شاخیں اور ۲۴۰۰ میل نالے شامل ہیں۔

بہار میں سون کا سلسلہ ہے جس میں ۳۷۰ میل نہر اور شاخیں اور ۱۲۰۰ میل نالے شامل ہیں۔ اوڑیسہ کی نہریں بھی بہت کام کی ہیں۔ بنگال میں صرف ایک مدناپور کی نہر ہے جس سے آبپاشی ہوتی ہے۔

ذخائر آب

بمبئی اور مدراس میں اول تو دریا نالے کم ہیں دوسرے بارش گو زور سے ہوتی ہے لیکن جم کر نہیں ہوتی۔ کچھ ڈونگرے آکر گزر جاتے ہیں۔ اس لئے وہاں ذخائر آب کی سخت ضرورت ہے۔ بمبئی کے پہاڑی حصوں میں بہت سے تالاب اور ذخائر آب موجود ہیں۔ ان میں سے لیک فائف اور لیک ہائیٹنگ پونا کے قریب بہت بڑے بڑے ہیں۔ بمبئی میں آبپاشی سے کچھ منافع نہیں ملتا۔

باب ۱۴

لیکن یہاں کے برابر ہندوستان میں کہیں بھی قحط کا اندیشہ دامنگیر نہیں رہتا۔ اور یہاں حفاظتی ذرائع آبپاشی کی سخت ضرورت ہے۔ مدراس کے ضلع مدورا میں پیریار کا سلسلہ ہندوستان کے ذخائر آب کے سلسلوں میں سب سے زیادہ دلچسپ اور عجیب ہے۔

سفری نہریں

ہندوستان میں ایسی نہروں کے تین سلسلے ہیں جو خاص طور پر کشتیوں کی آمدورفت کے واسطے بنائی گئی ہیں۔ ایک تو بنگال کی مدرا اور مشرقی نہریں۔ دوسرے ساحل اوڑیسہ کی نہر جس میں نہر مدو جزر بھی شامل ہے۔ اور تیسرا بکنگھم نہر مدراس میں۔ آج کل سرکار کے سامنے یہ تجویز پیش ہے کہ ٹولی نالے کو بھی نہر بنادیا جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو کلکتہ اور مشرقی بنگال کے درمیان آمدورفت میں بہت سہولت ہو جاوے گی۔

سرکاری طور پر نہروں کی دو قسمیں مانی جاتی ہیں۔ نہر کلاں۔ اور نہر خرد۔ ان میں سے پھر ہر ایک کی دو قسمیں ہیں پیدآور اور حفاظت گر۔ جن نہروں سے منافع حاصل ہوتا ہے وہ تو پیدآور کہلاتی ہیں۔ اور جن سے کل اصل کا پورا پورا سود بھی وصول نہیں ہوتا وہ حفاظت گر شمار ہوتی ہیں۔ یہ محض اس لئے بنائی ہیں کہ ان کی مدد سے غلہ پیدا ہو اور قحط رکا رہے۔ بیمہ اور امداد قحط کے نام سے جو ڈیڑھ کرور روپیہ سالانہ عطیہ سرکار سے ملتا ہے اسی میں سے نہروں کا خرچ چلتا ہے۔

پیدآور نہریں عموماً قرض کے روپے سے تیار ہوتی ہیں۔ مصارف کا اوسط فی میل تین ہزار سے پچاس ہزار روپے تک رہتا ہے۔ اور خالص منافع کل اصل پر ۷ فی صدی سالانہ کے حساب سے ملتا ہے۔

نہری آبادیاں

آبپاشی کے طفیل سے پنجاب کے خشک ریگستان کیسے سرسبز اور شاداب کھیت بن گئے۔ جہاں نہر چناب جاری ہے وہاں کبھی ویران میدان تھا۔ اور بہت کم لوگ آباد تھے۔ اب دیکھو تو بیس لاکھ ایکڑ زمین تختۂ عدن بنی ہوئی ہے۔ اور آبادی میں دس لاکھ کا اضافہ ہو گیا۔ نہر جہلم کی بستی۔ اب کوئی نوسو مربع میل سرکاری زمین پر پھیلی ہوئی ہے۔ حالانکہ سنہ ۱۹۰۲ء میں یہاں آبادی شروع ہوئی۔ اس وقت یہاں کی آبادی دو لاکھ کے قریب ہے

کچھ بستیاں اور ہیں - مثلاً باری دوآب پر چمن کی بستی اور سوہاگ پڑا اور سدھونی کی بستیاں - نہر شلٹ کے رقبے میں بھی عنقریب آبادی شروع ہونے والی ہے - سر فلیٹ وڈولسن نے انھیں بستیوں کے متعلق فرمایا تھا کہ یہ ایشیا میں بہت بڑے بڑے کھلیان ہیں اور یہاں کے طاقتور اور کارگزار باشندے چاہیں تو بڑی بڑی صنعت و حرفت کو اپنے ہاں ترقی دیں۔

آبپاشی سے ہر سال خالص ڈیڑھ کروڑ روپیہ منافع ملتا ہے آمدنی کی کئی مدیں ہیں کھیتوں کی آبپاشی - کشتی رانی اور ماہی گیری وغیرہ - کشتی رانی سے مدراس اور بنگال میں بہت آمدنی ہوتی ہے - باقی صوبوں میں بہت کم آبپاشی کا محصول پانی کے حساب سے نہیں - بلکہ کھیت کی فصل اور رقبے کے حساب سے لیتے ہیں - شمالی ہندوستان اور بمبئی میں محصول آبپاشی مالگزاری کے ساتھ تشخیص نہیں ہوتا بلکہ محکمہ آبپاشی کے حکام اس کو الگ مقرر کرتے ہیں - (۱) کاشتکار کی شرح - (۲) زمیندار کی شرح (۳) نہر سے مالگزاری میں جس قدر اضافہ ہوا ہو - یہ سب مدیں اس میں شامل رہتی ہیں - مدراس کا طریق مختلف ہے - وہاں یکجائی شرح کا رواج ہے یعنی مالگزاری اور محصول آبپاشی ایک ساتھ مقرر ہوتا ہے محصول آبپاشی کا اوسط کل رقبہ آبپاشی کے حساب سے کچھ کم ساڑھے تین روپے فی ایکڑ پڑتا ہے۔

آبپاشی میں گوناگوں فوائد ہیں - اول تو وہ کاشتکار کے حق میں بڑی نعمت ہے - آبپاشی کی بدولت نہ صرف خشک سالی میں فصل محفوظ رہتی ہے - بلکہ یوں بھی تھوڑے سے خرچ سے پیداوار بہت بڑھ جاتی ہے - زمیندار کا یہ فائدہ ہے کہ لگان بڑھ جاتا ہے ملک کا فائدہ یہ ہے کہ قحط سے امن ملتا ہے اور سامان خوراک کی پیداوار بڑھ جاتی ہے - آبپاشی سرکار کے حق میں یوں مفید ہے کہ اول تو اس سے محاصل میں اضافہ ہوتا ہے دوسرے لوگوں کی تکالیف کم ہونے سے عام بےچینی کا سدباب ہوتا ہے۔

سنہ ۱۹۰۲ء میں کمیشن آبپاشی نے پیمائش کرکے حساب لگایا تھا کہ کل مزروعہ رقبے میں سے بالعموم ۱۹ ½ فی صدی کی آبپاشی ہوتی ہے - اور

رقبہ آبپاشی میں سے ۴۲ فی صدی کو سرکاری ذرائع آبپاشی سے پانی ملتا ہے اور باقی کو دوسرے ذرائع سے جس میں نصف سے زیادہ رقبے کی آبپاشی کنوؤں سے ہوتی ہے۔ ۳۱ مارچ ۱۹۱۳ء کو سب سرکاری آبپاشی کا رقبہ ایک کرور ۶۵ لاکھ ایکڑ تھا اور ذرایع آبپاشی میں کل ۶۵ کرور روپیہ لگ چکا تھا۔

گرچہ آبپاشی میں بہت ترقی ہوئی تاہم ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ چنانچہ ۱۹۰۲ء کی آبپاشی کمیشن نے بھی جتا دیا ہے کہ اب تک کل پانی کے بہت قلیل حصے سے کام لیا جاسکا ہے بہت سی نہریں اور تالاب بنانے چاہئیں تاکہ دریاؤں کا پانی یوں فضول سمندروں میں نہ گرے۔ قرض دے دے کر کاشتکاروں کو بھی کنویں اور باولی بنانے کی ترغیب دینی چاہیئے۔ ساتھ ہی کشتی رانی کی طرف بھی زیادہ توجہ کرنی چاہیئے۔ نہروں کا یہ کام بھی بہت مفید ہے۔

حکومت اور صنعت

ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں دیسی صنعتوں کی بری گت بنی۔ جب سے حکومت شاہ برطانیہ کے ہاتھ میں آئی سرکار نے اصول غیر مداخلت پر عمل رکھا یعنی صنعت و حرفت میں کوئی دخل نہیں دیا البتہ یوں بالواسطہ اس سے صنعت و حرفت کو برابر تعلق رہا۔ مثلاً اگر سرکار ملک میں امن و امان قائم نہ کرتی تو صنعت و حرفت کی ترقی کیونکر ممکن تھی۔ تاہم سرکار نے شاذ و نادر ہی کبھی یہاں کی صنعتی ترقی کے واسطے عملی کوشش کی ہو۔ اب چند روز سے البتہ سرکار کو ادھر کچھ توجہ ہوئی ہے اور دیسی صنعتوں کی ترقی میں مدد دینے کا وعدہ کرنے لگی ہے۔ گشتیات بھی نکل چکی ہیں کہ جہاں تک ہو سکے سرکاری ضروریات کا سامان ہندوستان سے خریدا جائے اور سودیسی چیزوں کو ترجیح دی جائے۔ بشرطیکہ عمدہ قسم کی مل سکیں اور قیمت بھی مناسب ہو لیکن ملک کی بدقسمتی کہ ان گشتیات پر عمل کم ہوتا ہے۔ وقتاً فوقتاً خاص خاص صنعتوں کے حالات شائع کئے جاتے ہیں۔ محکمہ تجارتی معلومات کی طرف سے بہت سی کارآمد باتیں شائع ہوتی رہتی ہیں تاکہ موجودہ صنعتوں اور مستقبل موقعوں کا سب کو حال معلوم ہوتا رہے مقامی حکومتیں بھی اپنے اپنے ہاں صنعتوں کی حالت دریافت کرتی رہتی ہیں۔ سرکار کی سرپرستی میں کبھی کبھی صنعتی کانفرنسیں اور نمائشیں بھی منعقد

ہوتی ہیں۔ چند سال سے یہ کوشش ہو رہی ہے کہ پارچہ بافی کی گھریلو صنعت کو ترقی دی جائے۔ اس غرض سے نئے نئے قسم کے عمدہ کرگھوں اور بنائی کے جدید طریقوں کو رواج دے رہے ہیں۔ مدراس میں تجربہ کیا گیا تو کروم چمڑا عمدہ تیار ہونے لگا۔ سرکار کچھ ہونہار نوجوانوں کو ہر سال وظیفے دے دے کر صنعتی اور تجارتی تعلیم کو بھی تھوڑی بہت ترقی دے رہی ہے اور بعض صنعتی انجمنوں کو بھی امداد دیتی ہے۔

سرکار صنعت و حرفت کی ترقی کے واسطے جو کچھ کوشش کرتی ہے۔ اسکی تفصیل اوپر بیان ہوئی۔ واضح ہو کہ بحیثیت مجموعی سرکاری امداد کچھ زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ سنہ ۱۹۱ء میں ہندوستانی صنعتی کانفرنس کے صدر نے سرکار کی اس بے التفاتی کا رونا رو کر فرمایا کہ ہم کو سرکار سے بجا طور پر جو توقعات ہیں وہ یہ نہیں کہ بس دست شفقت پھیرنا اور کچھ نہ کرنا امداد کے جو سرسری وعدے کئے جاتے ہیں ان سے کیا فائدہ ہم کو اُس وقت اطمینان ہو اور اُسی وقت ہمارا کام بنے جب سرکار امداد کا پکا وعدہ کرے بلکہ اس پر قانون کی مہر بھی لگا دے یعنی ایسے قوانین پاس کردے کہ صنعت و حرفت کو ترقی ہو۔

صنعت و حرفت کی امداد کے لحاظ سے ہماری سرکار دوسری مہذب حکومتوں کے مقابل بہت پھسڈی نظر آتی ہے۔ جرمنی ریاستہائے متحدہ۔ جاپان کناڈا۔ اور آسٹریلیا۔ ان ملکوں میں جس طرح بھی بن پڑتا ہے سرکار صنعت و حرفت کی حمایت اور امداد کرتی ہے جاپان میں جو کچھ بھی صنعتی ترقی ہوئی حکومت کی کوشش کا نتیجہ ہے کہ اُس نے پانی کی طرح روپیہ بہا کر صنعتوں کو سینچا۔ نہ صرف اپنی صنعتوں کو کشمکش سے نکالا بلکہ نمونے کے طور پر کارخانے قائم کرکے بہت سی نئی صنعتیں جاری کردیں۔ جن سے آج ملک مالامال ہو رہا ہے۔ ہنگری کی حالت بھی صنعتوں کے لحاظ سے ہندوستان کی سی ہے۔ لیکن وہاں سرکار ہر طرح پر امداد کر رہی ہے اول تو محصول تامین قائم کر رکھا ہے کہ بدیسی مال کا گزر ہی نہو دوسرے تمام سرکاری دفتر اور محکموں میں اپنے ملک کی بنی ہوئی چیزیں استعمال کرتے ہیں۔ پھر بھی

صنعت و حرفت کے واسطے وہاں قانون پاس ہوتے رہتے ہیں۔ ۱۹۰۶ء کے قانون نمبری ۳۲ میں بھی ترقی صنعت کے واسطے بہت سی رعایتیں رکھی گئی ہیں۔ مثلاً (۱) محصول آمدنی اور محصول راہداری کی معافی (۲) کرایہ ریل میں تخفیف کروڑگیری اور چنگی میں رعایت سرکاری ضبطی میں رعایت (۳) جو نمک صنعت کے واسطے درکار ہو اُس کو معمول سے کم قیمت پر دینا۔ (۴) مزدوری پیشہ لوگوں کو مکانات بنانے میں مدد دینا۔ (۵) اس امر کی گارنٹی کہ سرکار کو جس قدر سامان کی ضرورت ہوگی۔ اپنے ہی ہاں کے کارخانوں سے خریدے گی۔ (۶) کھلم کھلا مالی امداد دے دے کر صنعتوں کو ترقی دینا اگر وہاں صنعت و تجارت کو فروغ اور ترقی نہ ہو تو کہاں ہو ہماری سرکار امداد کرے تو ایسی کرے کہ کچھ نتیجہ بھی نکلے۔

اگر فرائض حکومت کے تعین میں تنگ نظری سے کام نہ لیجئے اور قوم کی ہمہ گیر ترقی کو حکومت کا مقصد قرار دیجئے تو سرکار ہند کا اصول عدم مداخلت جسکو بے التفاتی کہیئے حق بجانب نہیں ہوسکتا اس اعتبار سے سرکار یقیناً اپنے فرایض کی ادائی میں قاصر رہی۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ اب تو سرکار کو چاہیئے کہ اپنی ذمہ داری سمجھے اور اس طرف پوری پوری توجہ کرے ہندوستان کے صوبے صوبے میں یہی صدا بلند ہو رہی ہے کہ سرکار دیسی صنعتوں کو عملی طور پر امداد کیوں نہیں دیتی۔ چنانچہ ۱۹۱۲ء کی صنعتی کانفرنس میں خاص طور پر سرکار کو اس طرف توجہ دلائی گئی۔ لطف تو یہ ہے کہ مدراس کی مجلس وضع قوانین میں غیر سرکاری ممبروں نے چند باقاعدہ تحریکیں پیش کیں کہ سرکار اس اس طرح بالخصوص فلاں فلاں صنعت کی دستگیری کرے۔

اس مسئلے کا ایک ضروری پہلو اور بھی ہے جس کو چند سال ہوئے خود ایک اعلیٰ عہدہ دار نے واضح کیا تھا۔ سرکار ہند کے مشیر زراعت تحریر فرماتے ہیں کہ جوں جوں تعلیم پھیلتی ہے اور لوگوں میں اپنی حالت کی اصلاح کا شوق پیدا ہوتا ہے معاشی ترقی کی ضرورت بڑھ رہی ہے۔ اگر صنعت و حرفت نے ترقی نہ کی تو تعلیم یافتہ لوگ پھر کس کام میں اپنا دل و دماغ صرف کریں گے۔ اور

یہ منظر کیسا عجیب ہوگا کہ لوگ تو تعلیم یافتہ اور ملک غیر ترقی یافتہ۔

تامین تجارت آزادی تجارت

یہ علمی بحث کہ تامین تجارت اور آزادی تجارت میں سے حکومت کو کونسی تجارتی پالیسی اختیار کرنی چاہیئے ہندوستانی معاشیات کے بجائے اصول معاشیات کی کتاب میں زیادہ برمحل ہوگی۔ البتہ دونوں فرقوں کے استدلال کا خلاصہ پیش کئے دیتے ہیں تاکہ یہاں پر علمی مسئلے کو حل کرنے میں مدد ملے۔

آزادی تجارت کے حامی اپنے طریق میں جو خوبیاں بتاتے ہیں ان میں سے خاص خاص یہ ہیں۔

(۱) تجارت بین الاقوام کی حالت بالکل داخلی تجارت کی سی ہے۔ جتنی آزادی ہوگی اتنا ہی فریقین کو فائدہ ہوگا۔ جب تجارت پر کوئی روک ٹوک نہ ہوگی تو ہر کوئی کم سے کم قیمت پر مال خریدے گا اور زیادہ سے زیادہ پر فروخت کرے گا۔ اسی طرح مجموعی فائدہ سب سے بڑھا رہیگا۔

(۲) جس ملک کو پیدائش دولت کے جو ذرائع بدرجۂ اعلیٰ حاصل ہونگے وہ اُنھیں کو پوری پوری ترقی دے گا۔ اور جب ذرائع پیداوار اس طرح کام کریں گے تو دنیا کی دولت میں لامحالہ بہت اضافہ ہوجاوے گا۔

(۳) تجارت کی آزادی سے قوموں اور فرقوں میں دوستی اور محبت بڑھتی ہے۔

مخالفین ان دلیلوں کا یہ جواب دیتے ہیں کہ داخلی تجارت اور تجارت خارجہ میں فرق ہے۔ دونوں کو مشابہ قرار دینا صحیح نہیں۔ اگر وہی صنعت ایک ملک میں تباہ ہوکر دوسرے ملک میں ترقی کرے تو پہلے ملک کو اس سے کیا تسکین ہوسکتی ہے کہ بلا سے ہمارا کام بگڑا تو بگڑا دنیا کی دولت میں تو اضافہ ہوگیا نیز دوستی کے برعکس یہ بھی تو اندیشہ ہے کہ آزادی تجارت کی بدولت معاشی لحاظ سے ایک ملک دوسرے کا محکوم اور دستنگر بن جائے۔

تامین تجارت میں جو خوبیاں بیان کی جاتی ہیں اب انکو لیجیئے:۔

(۱) درآمد میں روک ٹوک ہونی چاہیئے تاکہ برآمد بڑھی رہنے سے توازن تجارت اپنے موافق رہے۔

(۲) تامین نہ صرف صنعت و حرفت بلکہ زراعت کے حق میں بھی مفید ہے۔ کیونکہ اگر ملک میں دولت اور آبادی بڑھے تو قرب وجوار میں جو غلہ اور مال پیدا ہوتا ہے اس کی مانگ بڑھ جائیگی اور اچھی قیمت اٹھے گی۔

(۳) تامین کا خاصہ یہ ہے کہ اس کے زیر سایہ اجرت میں اضافہ ہوکر مزدوروں کا معیار زندگی ترقی کرتا ہے۔

(۴) تامین سے قوم میں ایک خوبصورت معاشی ترقی نمودار ہوتی ہے اور قوم کو صنعتی آزادی حاصل ہو جاتی ہے یعنی مصنوعات وغیرہ کے واسطے وہ دوسروں کی دست نگر نہیں رہتی۔

(۵) سرکار حمایت کرے تو نوخیز صنعتیں اپنے نشو ونما کے زمانے میں بیجا مسابقت کی زد سے محفوظ رہ کر خوب جڑ پکڑ لیتی ہیں ورنہ اُن کا پنپنا محال ہے۔

تامین تجارت میں بھی مخالفین عیب نکالتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

(۱) تامین اصولاً تجارت خارجہ کے منافی ہے اور اس کے اخلاقی و دماغی فوائد سے لوگوں کو محروم رکھتی ہے۔

(۲) مجموعی طور پر ملک کی پیداوار آزادی تجارت کے مقابل تامین کی حالت میں گھٹتی رہے گی۔

(۳) تامین سے کچھ فائدہ نہیں کیونکہ کچھ صنعتوں کی عارضی طور پر نگہداشت ہوتی ہے۔ تو ساتھ ہی اس کی بدولت کچھ صنعتیں برباد ہو جاتی ہیں

(۴) اصل اپنے شغل کے قدرتی راستوں سے رخ پھیر کر مجبوراً دوسرے راستوں پر جا پڑتی ہے یعنی جن کاموں میں روپیہ لگانا خود بخود مفید ہوتا اُنکے بجائے دوسرے دوسرے کاموں میں روپیہ لگنے لگتا ہے۔ جن کو تامین نے زبردستی فائدہ مند بنا رکھا ہے۔

(۵) مزدوروں میں اطمینان کی وجہ سے تن آسانی اور پست ہمتی پیدا ہوتی ہے لامحالہ پیداوار بھی گھٹ جاتی ہے۔

(۶) مال وسامان صرف کرنے والوں کا اس میں نقصان ہے۔ اور پیدا کرنے والوں کا فائدہ بہت لوگوں سے چھینکر تھوڑے لوگوں کو دینا کیا اچھی بات ہے۔

(۷) سرکار کو صنعت اور تجارت میں دخل دینا پڑتا ہے اور اس سے اکثر سیاسی بداخلاقیاں پھیل جاتی ہیں۔

(۸) قوموں میں بددلی اور دشمنی بڑھتی ہے۔

ان دونوں حریف گروہوں کی بحث اور استدلال پر بالتفصیل رائے زنی کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں صرف اس قدر جتانا کافی ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے عزیز اصولوں کی تائید و توصیف میں کسی قدر حد سے گزر جاتا ہے۔ اگرچہ دونوں حریفوں کے انتہائی خیالات بے بنیاد ہیں۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ دونوں جانب کچھ کچھ اصلیت اور سچائی ضرور ہے۔ جگت بھلائی کا تخیل یوں تو نہایت خوب ہے لیکن ساتھ ہی عمل سے بھی بعید ہے۔ جب تک مختلف قومیں موجود ہیں ہر ایک قوم کو موقع ملنا چاہیئے کہ اپنے اپنے طور پر جتنی ترقی کر سکے کرے۔ کوئی اس کا سدراہ نہ ہو۔ آزادی تجارت سے مختلف اقوام کی صنعتوں میں رقابت لازم آتی ہے۔ اور اگر سب قوموں کی صنعتیں بلحاظ ترقی ایک سطح پر ہوں تو پھر مسابقت کے جوش میں اور بھی ترقی کرتی ہیں۔ لیکن جب کوئی صنعت ایک جگہ خوب ترقی پا چکی ہو اور دوسری جگہ بالکل نوخیز ہو اور پھر ان میں مسابقت آپڑے تو جب تک حکومت حمایت نہ کرے یہ نوخیز صنعت کہاں چل سکتی ہے چنانچہ مسٹر جے اس مل جیسے آزادی تجارت کے حامی بھی مانتے ہیں کہ نوخیزی کے زمانے میں صنعت کے واسطے تامین مفید ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت کی عام پالیسی تو آزادئ تجارت ہونی چاہیئے لیکن خاص حالتوں میں تامین تجارت نہ صرف واجبی بلکہ سراسر ضروری ہوتی ہے یہاں تک تو تجارت کی آزادی اور تامین کے متعلق علمی پیرائے میں بحث کی گئی۔ اب اس مسئلے کو ہندوستانی حیثیت سے دیکھنا چاہیئے۔ اس وقت ہندوستان خاص کر ایک زراعتی ملک ہے۔ مشہور جرمن معاشی مسٹر لسٹ کا مقولہ ہے کہ جس ملک کا پیشہ زراعت ہی زراعت ہو اس کی حالت پیداوار دولت کے لحاظ سے اس شخص کی سی ہو گی جس کا ایک بازو ندارد ہو جب وہ مصنوعات دوسرے ملکوں سے خریدتا ہے تو گویا اس کا

دوسرا بازو دوسروں کے پاس ہے۔ مسٹر لسٹ کی کتاب قومی معاشیات قابل دید ہے۔ انھوں نے ثابت کیا ہے کہ جن ملکوں میں سامان خام پیدا ہوتا ہے۔ وہاں کند ذہنی۔ تاریک خیالی۔ رسم پرستی بے تہذیبی اور مفلسی پھیلی رہتی ہے۔ اور آزادی ادھر کبھی رخ نہیں کرتی۔ اس کے برعکس جن ملکوں میں صنعت و تجارت کا دور دورہ ہے وہاں دماغی قوتیں خوب جوہر دکھاتی ہیں۔ ہر طرف ترقی کا ولولہ پھیلتا ہے اور آزادی بھی وہیں ڈیرہ ڈالتی ہے۔ چنانچہ یہ مسلم ہے کہ ہندوستان کی بہبود کے واسطے صنعتوں کی ترقی سراسر ناگزیر ہے۔

لیکن اگر اسی طرح دوسرے ملکوں کی ترقی یافتہ صنعتوں سے مقابلہ ہوتا رہا تو ہندوستان کی نوخیز صنعتوں کا پنپنا معلوم ہے۔ یہاں نئی نئی صنعتوں کو جو دشواری پیش آتی ہے اسکی کیفیت سنہ ۱۹۱۰ء کی صنعتی کانفرنس میں صدر صاحب نے یوں بیان فرمائی ہے کہ اگر ہندوستان میں کوئی ایسی صنعت جاری کی جائے جس سے مصنوعات کی درآمد گھٹنے کا قرینہ ہو تو دوسرے ملکوں کے صناع جوش مسابقت میں ان مصنوعات کو گھر گھر اور گلی کوچے اس قدر ارزاں فروخت کریں گے کہ یہاں ان کی لاگت بھی اس قیمت سے زیادہ رہیگی۔ پس جب تک شروع شروع میں تامین کا انتظام نہ ہو یہاں صنعتیں کیونکر سرسبز ہو سکتی ہیں۔ سستی بدیسی چیزوں کے مقابل لوگ مہنگی دیسی چیزیں کیوں خریدنے لگے۔ یہ سچ ہے کہ جب صنعتیں نئی نئی جاری ہونگی تو مدت تک یہاں کے مصنوعات یہیں کھپیں گے دوسرے ملکوں تک ان کا گزر نہ ہوگا۔ لیکن اگر ہندوستان میں تجارت کے دروازے یونہیں کھلے رہے تو کبھی صنعتیں نہ پنپ سکیں گی۔ دوسرے ملکوں کے بڑے بڑے مالدار اور صاحب اقتدار کارخانے مصارف پیدائش سے بھی کم قیمت پر مال لٹانا شروع کردیں گے۔ اور جب ہندوستانی صنعتوں کا خاتمہ ہو جانے سے مسابقت کا خطرہ رفع ہو جاوے گا تو پھر من مانی قیمت وصول کریں گے۔ حاصل کلام یہ کہ آزادی تجارت کے ہوتے ہوئے ہندوستان میں صنعتی ترقی محال ہے۔

دنیا میں جتنے ملکوں نے صنعتی ترقی کی سب نے شروع شروع میں اپنی نوخیز

صنعتوں کو تامین کے حصار میں پالا۔ انگلستان اور فرانس کو صنعت و حرفت میں جو عظمت حاصل ہے اس کا سنگ بنیاد کرام ویل اور کالبرٹ کی تامینی پالیسی نہیں تو اور کیا تھی۔ اور آج کے دن بھی جرمنی ریاستہائے متحدہ، برطانوی آبادیات اور جاپان گویا تقریباً ہر ترقی یافتہ ملک میں طریق تامین رائج ہے۔ اس وقت انگلستان ہی ایک ملک ہے جہاں آزادی تجارت کا رواج ہے لیکن وہ جو اپنے ہاں درآمد پر محصول نہیں لگاتا تو اس معاملہ میں بھی وہ اصول تامین کی پیروی کرتا ہے۔ یعنی یہ کہ سامان خام پر محصول درآمد لینا چاہیے تاکہ مصنوعات پر بار نہ پڑنے پاوے۔ مزید براں ہندوستان اور انگلستان کی حالت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ہندوستان میں محصول تامین لگ گیا تو نہ صرف دیسی صنعتوں کو امن ہو جائے گا بلکہ جو آمدنی ہوگی وہ تعلیم صفائی۔ اور اصلاح تمدن وغیرہ ضروری مدوں میں کام آئے گی۔

ہندوستان کی رائے تو سراسر تامین تجارت کی حامی ہے۔ آج سے مدتوں پہلے ۱۸۷۹ء میں مسٹر تلانگ نے جو کہ بعد کو جسٹس کے عہدہ پر سرافراز ہوئے۔ ہندوستانی صنعتوں کی تامین کے واسطے پرزور اپیل کی۔ مسٹر جسٹس راناڈے آنجہانی ہمیشہ اپنی تقریر و تحریر میں ہندوستان کی نوخیز صنعتوں کے واسطے تامین کی ضرورت جتاتے رہے۔ آج کل کے تمام ہندوستانی مدبر تامین کے حامی ہیں اور بہت سے انگریز جو ہندوستان کی معاشی حالت سے واقف ہیں اُن کے ہم خیال ہیں۔ لارڈ منٹو نے بھی صاف فرمایا تھا کہ ہندوستان کا مستقبل بہت کچھ اس کی صنعت و حرفت کی ترقی پر منحصر ہے۔ اس باب میں جو کوشش بھی ہو سکے کرنی چاہیے۔ صنعتوں کی حالت ہندوستان اور کناڈا میں کبھی ایک سی تھی۔ اگر ریاستہائے متحدہ کی مصنوعات محصول تامین کے ذریعے سے نہ روکی جاتیں تو ممکن تھا کہ کناڈا کو وہ صنعتی عروج میسر ہوتا جو اس کو آج حاصل ہے۔ کناڈا والوں نے اپنی صنعتوں کی خود ہی بنا ڈالی اور تامین کے سایہ میں اُن کی پرورش کی یہ سچ ہے کہ ہندوستان اور کناڈا کی ایک سی حیثیت نہیں۔ گو کوئی بڑا صناع ملک ہندوستان کے قرب و جوار

میں واقع نہیں۔ تاہم دور دراز ملکوں کی مصنوعات تو اس کے گلے کا ہار بنی ہوئی ہیں۔ اگر ہندوستان میں صنعتوں کو ترقی دینا منظور ہو تو محصول درآمد و برآمد کی اصلاح لابد ہے۔ اس کے بغیر کامیابی نظر نہیں آتی۔

ہندوستانی مدبرین بیشک تامین کے حامی ہیں۔ لیکن وہ کورانہ حمایت نہیں کرتے۔ وہ جانتے ہیں کہ تامین سے قیمتیں بڑھیں تو خریداروں پر بار پڑے گا۔ لیکن ان کا خیال ہے کہ عوام کو اتنا ایثار گوارا کرنا چاہیئے کیونکہ جب تامین کے ذریعے سے ملک میں ذرائع پیداوار ترقی کریں گے تو اس چند روزہ زیرباری کی پوری تلافی ہو جاوے گی۔ دوسرے وہ یہ نہیں چاہتے کہ خواہ مخواہ ہر صنعت تامین میں شامل کی جائے۔ بس ان صنعتوں کے واسطے تامین چاہیے جو ہونہار ہوں۔ اور کچھ مہلت ملے بعد اپنے قدموں پر کھڑی ہو سکیں۔ اور انتہائی تخیل ہندوستانی تامینیوں کا بھی یہی ہے کہ تجارت آزاد ہو چنانچہ ان کو اُمید ہے کہ ایک زمانہ ایسا بھی آوے گا کہ تامین کا مقصد پورا ہو جائیگا اور اس کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔

ہندوستان اور شاہی ترجیح

اب ایک اور اہم علی بحث چھیڑتے ہیں جو کہ گذشتہ بحث سے مختلف بھی ہے اور متعلق بھی۔ شاہی ترجیح کے نام سے تجارت کا جو نیا طریق تجویز ہو رہا ہے۔ اس میں ہندوستان کا کوئی ذکر نہیں آتا۔ اور اگر کوئی ذکر کرتا بھی ہے تو انگریزی نظر سے کرتا ہے۔ ہندوستان کے خیال سے کوئی نہیں کرتا۔ سر رودپر لیتھبرج فرماتے ہیں کہ اگر سلطنت برطانیہ کے اندر کوئی تجارتی اتحاد قائم کرنے کی معقول تدبیر نکالی جائے تو اُس میں انگلستان کے بعد ہندوستان کا خاص لحاظ اور رتبہ رہنا ضرور ہے۔ اس وقت سلطنت برطانیہ کے جتنے حصے ہیں اُن سب میں ہندوستان ہی وہ ملک ہے۔ جہاں سب سے زیادہ خوراک اور سامان خام پیدا ہوتا ہے اور مصنوعات بھی سب سے زیادہ وہیں فروخت ہوتے ہیں۔ جس ملک میں تیس کرور کفایت شعار۔ محنتی اور ترقی پذیر لوگ آباد ہوں کیا درآمد اور کیا برآمد کے لحاظ سے۔ دنیا میں کس ملک کو اس سے زیادہ اہمیت حاصل ہو سکتی ہے۔

سر روپر لیتھبرج ہندوستانی مدبرین کے روبرو ایک نہایت اعلیٰ معیار پیش کرتے ہیں۔ وہ امید دلاتے ہیں کہ ہندوستان اور سلطنت برطانیہ کے باقی حصوں میں جو آیندہ تجارتی معاہدہ ہوگا اُس میں ہندوستان ایک اعلیٰ سلطنت تسلیم کی جاوے گی لیکن یہ اُن صاحب کو بھی گوارا نہیں کہ برطانوی سامان کے مقابل ہندوستان کی مصنوعات کو تامین حاصل ہو۔ تو پھر بھلا کوئی اُن سے دریافت کرے کہ ہندوستان اعلیٰ سلطنت کیا خاک ہوئی۔ خالی شاندار نام سے کیا فائدہ۔ کچھ کام بھی ہونا چاہیے۔

سر روپر لیتھبرج اپنے استدلال سے نتائج ذیل اخذ کرتے ہیں۔

(۱) شاہی ترجیح کا طریق جاری ہوتے ہی ہندوستان کو بہت سے فوائد اور بالواسطہ و بلاواسطہ حاصل ہونے لگیں گے۔

(۲) صوبے صوبے کی صنعتوں میں دوبارہ جان پڑ جاوے گی۔ اور قحط کا خطرہ بھی رفع ہو جاوے گا۔

(۳) ہندوستان کے مالیئے پر جو دوسرے ملکوں کا بہت اثر پڑتا ہے۔ یہ خرابی بھی رفع ہو جائے گی۔ اور اس میں نہایت مناسب طور پر استقلال پیدا ہو جاوے گا۔

(۴) ہندوستان کی نوخیز صنعتوں کو معقول اور کافی تامین حاصل ہو جاویگی۔

(۵) ہندوستان کے مفاد اور جذبات کا جس قدر لحاظ رکھنا چاہیے اور رکھنا ممکن ہے اس طرح رکھ سکتے ہیں جیسے کہ شاہی ترجیح کے طریق میں تجویز کیا گیا ہے۔

جو کچھ فوائد اوپر بیان ہوئے سبحان اللہ کیا کہنا۔ اگر اس کا عشر عشیر بھی حاصل ہو سکے تو شاہی ترجیح کا طریق ضرور جاری کرنے کے قابل ہے۔ لیکن ہندوستانی مدبرین کو یہ سب باتیں سبز باغ دکھائی دیتی ہیں۔ اُن کے دلکو اطمینان نہیں ہوتا یوں تو سر روپر لیتھبرج ہندوستان کے بڑے شفیق دوست نظر آتے ہیں لیکن ان کی تجاویز پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اُنکے دل میں انگلستان کی بہبودی کی خواہش جاگزیں ہے نہ کہ ہندوستان کی۔

ان کی تجویز یہ ہے کہ چاء۔ تمباکو۔ قہوہ۔ بن اور نیل کو ترجیح مل جائے۔ چاء کی صنعت تو بالکل انگریزوں کے ہاتھ میں ہے۔ اور اس مد میں جو کچھ فائدہ ہوگا انگریزوں کو ہوگا۔ ہندوستانی اس سے کیا خوش ہو سکتے ہیں۔ تمباکو بھی ایک ہونہار شے ہے۔ ترجیح ملنے کے بعد ممکن ہے ترقی کر جائے۔ لیکن نیل کے پنپنے کی امید بہت کم ہے۔ قہوہ اور بن بہت چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں وہ کسی شمار قطار میں نہیں۔ بس یہ پانچوں چیزیں بحیثیت مجموعی ہندوستان کی برآمد کا بہت قلیل جزو ہیں۔ اگر ترجیح سے فائدہ پہونچانا مقصود ہو تو دوسری چیزوں پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ محصول درآمد و برآمد کی اصلاح کا جو سرکاری خاکہ انگلستان میں تیار ہوا ہے اس میں تو ہندوستان کا کوئی فائدہ نظر آتا نہیں۔ اصلاح محصول درآمد و برآمد کی جو لیگ یا انجمن ولایت میں قائم ہے۔ اس نے ایک کتاب شائع کی ہے۔ جس میں تحریر ہے کہ ترجیح سے مراد یہ ہے کہ سلطنت متحدہ اور برطانوی آبادیات میں ہندوستان کی چاء۔ قہوہ۔ شکر۔ گیہوں اور دیگر پیداوار آزادی داخل ہوگی۔ اور اس کے ساتھ ہی جو محصول درآمد برطانوی مصنوعات پر اس وقت ہندوستان میں قائم ہے وہ یا تو بالکل اٹھ جائے گا یا اس میں تخفیف ہو جائے گی۔ ایسی حالت میں زیادہ فائدہ انگلستان ہی کا ہے۔ ہندوستان کا بہت کم فائدہ ہے۔

پروفیسر لی اسمتھ معلوم ہوتا ہے بات خوب سمجھتے ہیں۔ انھوں نے صاف کہدیا کہ وہ خاص دس چیزیں جو ہندوستان سے انگلستان جاتی ہیں۔ اور جن کی مقدار مجموعی برآمد کی ۹۰ فی صدی رہتی ہے اُن کو ترجیح دینا ممکن نہیں۔ ورنہ جو سامان ہماری صنعتوں اور خوراک کے واسطے ناگزیر ہے اسکی قیمت لامحالہ بڑھ جاوے گی۔ پس ہماری حالت ہی ایسی واقع ہوئی ہے کہ ہم ہندوستان کو کوئی معقول معاوضہ نہیں دے سکتے۔ جن دس چیزوں کا ذکر ہے وہ یہ ہیں۔ جوٹ۔ چاء۔ گیہوں خام چمڑہ۔ روغنی تخم۔ اون۔ جوٹ کے مصنوعات۔ روئی۔ چانول۔ لاک۔ پروفیسر موصوف رقم طراز ہیں کہ جوٹ اور لاک میں تو ترجیح کی ضرورت ہی نہیں۔ اسن کا اجارہ ہندوستان ہی کے

ہاتھ میں ہے۔ جب کوئی مدّ مقابل نہ ہو تو پھر ترجیح کیا معنی۔ جوٹ کے مصنوعات میں البتہ ڈنڈی سے کچھ مقابلہ رہتا ہے۔ چاء کے واسطے ہندوستان کو تامین کی ضرورت ہی نہیں۔ رہیں باقی چیزیں وہ یا تو خوراک میں کام آتی ہیں۔ مثلاً گیہوں۔ چانول۔ یا صنعتوں کی سامان خام ہیں۔ مثلاً چمڑا۔ روغنی تخم، اون اور روئی۔ ترجیح کے تو معنی یہ ہیں کہ یہی چیزیں جب دوسرے ملکوں سے آئیں تو ان پر محصول درآمد لیا جائے۔ اس طرح قیمتیں بڑھنی یقینی ہیں۔ لیکن یہ امید نہیں کہ انگلستان کے لوگ ہندوستان کی خاطر اضافہ قیمت گوارا کریں۔

پس صاف ظاہر ہے کہ یہ جو طریق ترجیح نکالا چاہتے ہیں۔ اس میں ہندوستان کو سلطنت متحدہ سے کچھ زیادہ فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ آبادیات سے اس کی تجارت ہی کم ہے۔ ان کا طریق ترجیح اس کے کچھ کام نہیں آسکتا۔ سلطنت برطانیہ کو بھی کیا فائدہ پہنچے گا۔ ہندوستان کے پاس ہے ہی کیا جو پیش کرے۔

اس کے برعکس یہ بہت ممکن ہے کہ طریق ترجیح کی بدولت ہندوستان کو بہت نقصان برداشت کرنا پڑے۔ چنانچہ لارڈ اِنچکیپ نے سنہ ۱۹۰۰ء میں آبادیات کی کانفرنس میں صاف فرمایا کہ مالی لحاظ سے ہندوستان کو یہ خطرہ ضرور دامنگیر ہے کہ دوسری قومیں بھی انتقام اور بدلا لینے کی کوشش کریں۔ گو کوششیں بالآخر ناکام ثابت ہوں۔ تاہم یہ خطرہ فی نفسہ اس قدر اہم ہے۔ اور اس کوشش کے نتائج اس قدر مضرت رساں ہو سکتے ہیں کہ ہم کو اس نئے طریق پر ہرگز نہ چلنا چاہیے۔ تاوقتیکہ ہمکو اس کے بڑے بڑے فوائد صاف نظر نہ آجائیں۔ اور وہ اب تک تو نظر آئے نہیں۔

سر رو پر لیتھبرج بجا فرماتے ہیں کہ خاص مقامی حالات کی وجہ سے ہندوستان میں نوخیز صنعتوں کے واسطے تامین ضروری ہے لیکن دقت یہ ہے کہ ہندوستان برطانیۂ عظمیٰ کے مقابل بھی تامین چاہتا ہے۔ کیونکہ یہاں جو بہت سی نئی صنعتیں جاری ہو رہی ہیں۔ ان میں خود برطانیۂ عظمیٰ ہندوستان

کا حریف اور مدمقابل ہے۔ چنانچہ لارڈ کریو سابق وزیر ہند بھی اپنی ایک تقریر میں اس خواہش کے جواز کا اعتراف کر چکے ہیں لیکن یہ بات تو لگتی ہوئی معلوم نہیں دیتی کہ ہندوستان کی خاطر برطانیہ عظمیٰ اپنے اوپر کوئی محصول قائم ہونے دے۔ ہندوستان کو تو فائدہ اسی حالت میں پہنچ سکتا ہے جبکہ دوسری خود اختیار نوآبادیات کی طرح ہندوستان کو مالی آزادی مل جائے تاکہ وہ بھی جس طرح اپنا فائدہ دیکھے محصول درآمد و برآمد قائم کرے۔

# پہلا ضمیمہ

## ہندوستانی زر

۱ پائی ........ = $\frac{1}{12}$ پینی

۱ پیسہ (۳ پائی) ........ = ۱ فاردنگ

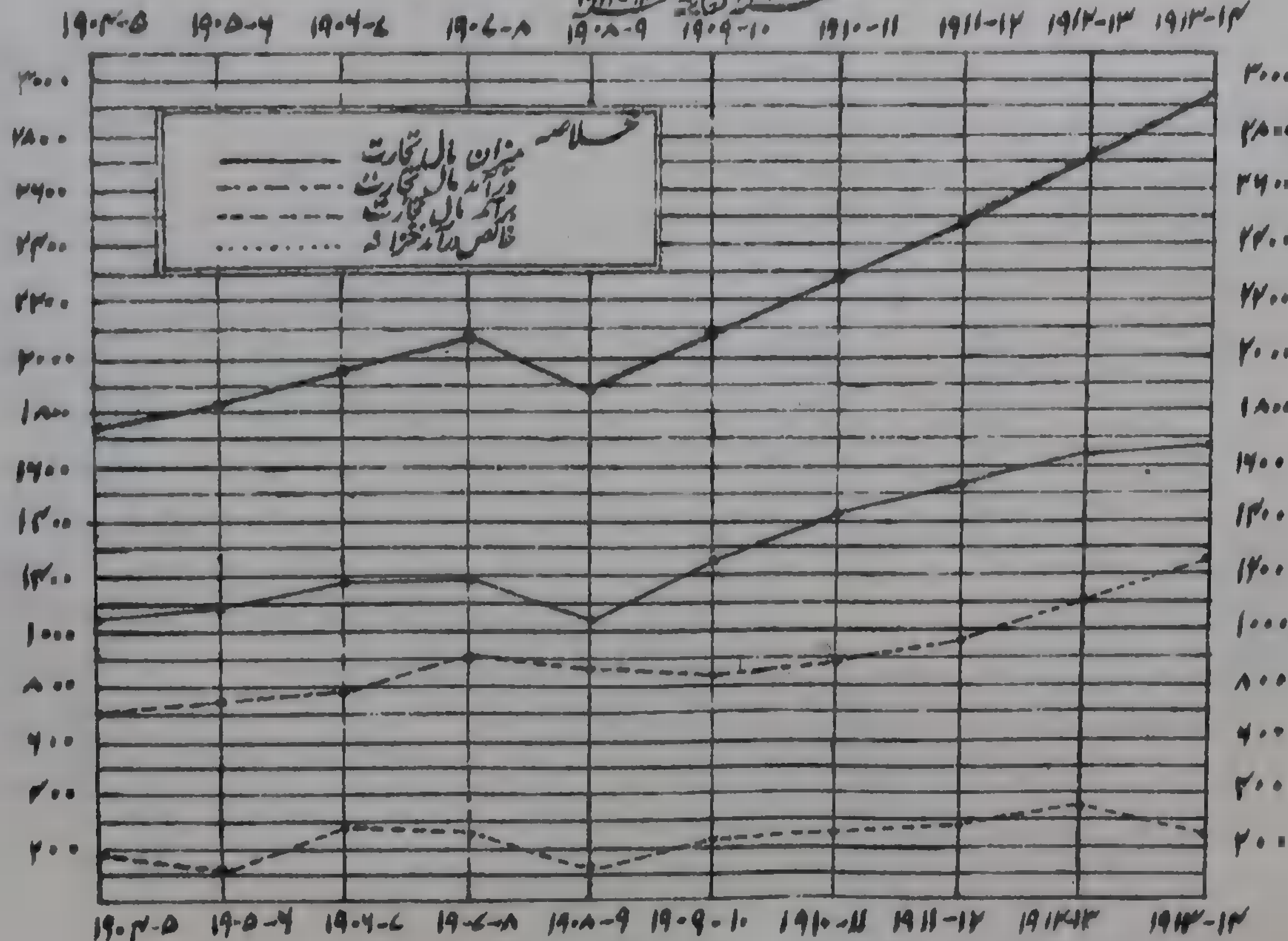
۱ آنہ (۱۲ پائی) ........ = ۱ پینی

۱ روپیہ (۱۶ آنہ) ........ = ۱ شلنگ ۴ پنس - ۳۲۴ء ڈالر = ۹۵ء ین -

## دوسرا ضمیمہ

### ہندوستان کی بحری تجارت خارجہ

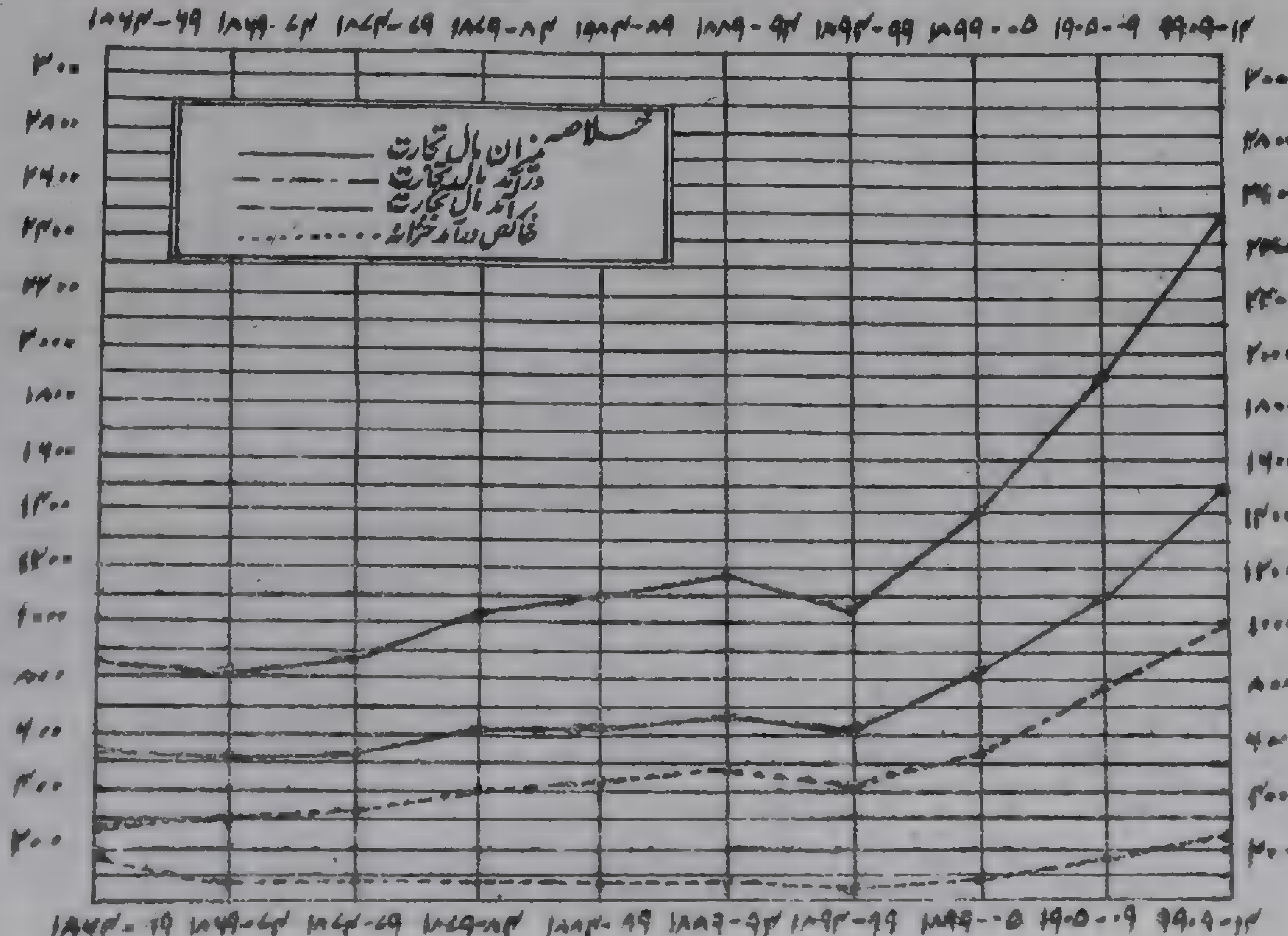
دس سال ۱۹۰۴-۵ لغایت ۱۹۱۳-۱۴



## تیسرا ضمیمہ

## ہندوستان کی بحری تجارت خارجہ

پچاس سال ۶۵-۱۸۶۴ لغایت ۱۹۱۳-۱۴ء



# چوتھا ضمیمہ

## گنجانی آبادی - آبرسانی اور فصلیں

| حصۂ ملک | اوسط آبادی فی مربع میل | فی صدی کل رقبۂ زمین | | فی صدی کل رقبۂ مزروعہ | | فی صدی کل رقبۂ مزروعہ زیر آبپاشی | معمولی بارش انچوں میں |
|---|---|---|---|---|---|---|---|
| | | قابل کاشت | مزروعہ | مزروعہ | دو فصلی زمین | | |
| ۱ | ۲ | ۳ | ۴ | ۵ | ۶ | ۷ | ۸ |
| ہندوستان | ۱۷۵ | ۶۴ | ۳۸ | ۵۹ | ۸ | ۱۷ | - |
| اجمیر مارواڑ | ۱۸۵ | - | - | - | - | - | ۱۹ |
| آسام | ۱۱۵ | ۷۶ | ۱۸ | ۲۴ | ۲ | ۱ | ۱۱۶ |
| بلوچستان | ۶ | - | - | - | - | - | ۸ |
| بنگال | ۵۵۱ | ۷۰ | ۵۰ | ۷۱ | ۱۷ | ۴ | ۷۰ |
| بہار و اڑیسہ | ۳۴۴ | ۷۳ | ۵۲ | ۷۱ | ۱۳ | ۱۲ | ۵۳ |
| بمبئی | ۱۴۵ | ۶۳ | ۳۸ | ۶۱ | ۲ | ۱۴ | ۴۶ |
| برما | ۵۳ | ۴۲ | ۱۳ | ۳۲ | ۱ | ۷ | ۹۵ |
| صوبۂ متوسط و برار | ۱۲۲ | ۶۵ | ۳۹ | ۶۰ | ۴ | ۳ | ۴۸ |
| کورگ | ۱۱۱ | ۳۴ | ۱۴ | ۴۵ | ۴ | ۳ | ۱۲۷ |
| مدراس | ۲۹۱ | ۵۸ | ۳۸ | ۶۵ | ۹ | ۳۰ | ۴۳ |
| شمال مغربی سرحدی صوبہ | ۱۶۴ | ۵۵ | ۳۱ | ۵۶ | ۸ | ۲۳ | ۲۱ |
| پنجاب | ۱۷۷ | ۵۷ | ۳۳ | ۵۸ | ۱۰ | ۳۲ | ۳۱ |
| صوبۂ متحدہ | ۴۲۷ | ۷۲ | ۵۳ | ۷۴ | ۱۵ | ۲۸ | ۴۲ |
| ریاست بڑودہ | ۲۴۸ | ۸۳ | ۷۳ | ۸۷ | ۴ | ۵ | - |
| ریاست ہائے متوسط ہند | ۱۲۱ | ۴۷ | ۲۵ | ۵۳ | ۳ | ۵ | ۳۲ |
| ریاست کوچین | ۶۷۵ | ۵۷ | ۵۶ | ۹۷ | ۱۷ | ۴ | ۱۰۳ |
| ریاست حیدر آباد | ۱۶۲ | ۶۰ | ۵۴ | ۸۹ | - | ۶ | ۳۰ |
| ریاست کشمیر | ۳۷ | ۵ | ۴ | ۸۴ | ۱۷ | ۲۴ | ۲۴ |
| ریاست میسور | ۱۹۷ | ۴۵ | ۳۳ | ۷۲ | ۳ | ۵ | ۲۸ |
| ریاست ہائے راجپوتانہ | ۸۲ | - | - | - | - | - | ۲۲ |
| ریاست ٹراونکور | ۴۵۲ | ۶۱ | ۷۵ | ۷۴ | ۱۷ | ۸ | ۸۵ |

# پانچواں ضمیمہ

## سنہ ۱۸۶۱ء اور سنہ ۱۸۹۵ء کے درمیان قیمتوں کا اتار چڑھاؤ

سنہ ۱۸۶۰ء میں قیمتیں علی العموم چڑھ گئیں۔ سنہ ۵۷ء کی شورش فرو ہونے کے بعد جب حکومت ہند شاہ انگلستان کے ہاتھ میں آئی تو صنعت و تجارت کی چہل پہل کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ سڑکیں بنیں۔ ریلیں نکلیں۔ بندرگاہ درست ہوئے۔ آبپاشی پھیلی۔ غرضکہ ملک میں ذرائع پیداوار کو ترقی دینے کے سامان جمع ہو گئے۔ سنہ ۱۸۶۱-۶۵ء والی امریکہ کی جنگ وراثت کے دوران میں ہندوستان میں روئی کی کاشت کو بہت ترقی ہوئی اور لڑائی ختم ہونے تک یہاں کے کاشتکار اور تاجر خوب منافع کماتے رہے۔ سنہ ۵۷ء کی شورش کے بعد سے جو یہاں قیمتی دھاتیں آنی شروع ہوئیں تو اس جنگ کے زمانے میں ان کی درآمد اور بڑھ گئی۔ جنگ کے دوسرے ہی سال مغربی اور متوسط ہند میں جہاں جہاں روئی کاشت ہوتی ہے۔ عموماً قیمتیں بہت بڑھ گئیں۔ اور ان کے اثر سے ملک کے دوسرے حصوں میں بھی تھوڑا بہت اضافہ ہوا۔ سنہ ۱۸۶۱ء میں صوبۂ آگرہ کے بالائی دوآب میں اور نیز پنجاب اور راجپوتانہ کے قرب و جوار کے اضلاع میں قحط پھیلا؛ بعض میں خشک سالی رہی۔ اس لیئے قیمتوں میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

امریکی جنگ کی وجہ سے جو قیمتیں چڑھ گئی تھیں۔ وہ ختم جنگ پر ضرور اتر آئیں۔ لیکن ایک اور دقت پیش آ گئی۔ وہ یہ کہ سنہ ۱۸۶۶ء میں اوڑیسہ میں ایک سخت قحط نمودار ہوا جو بالآخر بنگال۔ بہار۔ مدراس اور صوبۂ متوسط کے مشرقی حصے میں سب جگہ پھیل گیا۔ سنہ ۱۸۶۹ء میں ایک اور قحط آیا جس کا مغربی راجپوتانہ اور شمالی ہندوستان کے بعض حصوں پر خاص اثر پڑا مغرب اور جنوب میں خشک سالی ہونے کی وجہ سے بمبئی۔ صوبۂ متوسط اور حیدرآباد میں بھی گرانی پھیل گئی۔

سنہ ۱۸۷۱-۷۵ء میں قیمتوں میں کوئی بڑا تغیر نہیں ہوا البتہ سنہ ۱۸۷۳ء میں بہار میں خشک سالی رہی۔ اگرچہ اس سال سرکار نے بہت غلہ خریدا۔ اور صوبۂ متحدہ کے قرب و جوار

کے اضلاع میں بھی خشک سالی رہی تاہم گرانی کا اثر زیادہ نہیں پھیلا۔ ۱۸۷۲-۷۳ء میں چانول کی برآمد بہت بڑھ گئی۔ ۱۸۸۱ء تک برابر یہی حال رہا۔ ۱۸۷۴ء میں جب بہار میں قحط پھیلا تو البتہ برآمد کسی قدر گھٹ گئی۔ اور تین سال بعد جب دکن میں قحط نمودار ہوا تو برآمد اتنی بھی نہ گھٹی۔

۱۸۷۶-۸۰ء

اس پنجسالہ میں ۱۸۷۷-۷۸ء کا مشہور قحط نمودار ہوا جو کہ تمام ملک میں پھیل گیا۔ مغربی اور جنوبی ہندوستان پر اس کا اثر بہت سخت پڑا۔ شمال میں قحط کسی قدر کم رہا۔ لیکن تمام ہندوستان میں غلّہ کی قیمت عام طور پر چڑھ گئی۔ ۱۸۷۰ء میں نہر سویز کھلنے سے جو گیہوں کی تھوڑی سی برآمد شروع ہوئی تھی وہ ۱۸۷۸-۸۰ء میں قحط کی بدولت رک گئی۔

۱۸۸۱-۸۵ء

اس دوران میں فی الجملہ چانول کے سوا باقی تمام فصلیں اچھی رہیں۔ ۱۸۸۴ء میں پنجاب کے ایک حصے میں خشک سالی رہی۔ ۱۸۸۵ء میں بنگال اور مدراس کے کچھ کچھ حصوں میں لوگوں نے گرانی کی تکلیف اٹھائی۔ ۱۸۸۳ء اور ۱۸۸۵ء کے درمیان خشک سالی اور سیلاب کی بدولت چانول کی فصلیں ماری گئیں۔ لیکن گیہوں خوب بکثرت پیدا ہوا۔ اور سب غلوں کا نرخ اوسطاً گھٹا رہا۔

۱۸۸۶-۹۰ء

اس پنجسالہ میں جو قیمتیں اس قدر بڑھ گئیں اس کے صحیح اسباب سمجھ میں نہیں آتے کیونکہ صرف بہار اور اڑیسہ میں ۱۸۸۹ء میں ایک معمولی سا قحط پڑا۔ ورنہ ہر سال فصلیں اچھی رہیں۔ اور قیمتیں ۱۸۸۸ء میں ہی حد کو پہنچ گئیں۔ غلے کی برآمد بھی گزشتہ پنجسالہ سے نہیں بڑھی پھر خدا جانے قیمتوں میں کس وجہ سے اس قدر اضافہ ہوا۔

۱۸۹۱-۹۵ء

۱۸۹۱-۹۲ء میں بمبئی۔ مدراس۔ دکن بہار اور شمالی برما۔ ان تمام حصوں میں خشک سالی پھیلی رہی۔ ایک تو ۱۸۸۶-۹۰ء سے یونہی قیمتیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اب ان میں اور اضافہ ہوگیا۔ اول تو خود ہندوستان میں چانول کی بہت مانگ تھی اس پر طرہ یہ کہ اس کی خوب برآمد ہوئی۔ پھر چونکہ یورپ میں فصل ماری گئی تھی گیہوں بھی یہاں سے اس قدر برآمد ہوا کہ اس سے

پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ نتیجہ یہ کہ ہندوستان میں غلے کی قیمت اس قدر بڑھی کہ اچھا خاصہ قحط پھیل گیا۔ بعد کو فصلیں اچھی ہونے سے قیمتیں گھٹ گئیں لیکن سنہ ۹۵-۱۸۹۱ء میں جو سب سے کم قیمت رہی وہ بھی گزشتہ پنجسالہ کی اوسط قیمت سے بڑھی رہی اور گزشتہ پنجسالہ کی طرح اس دوران میں سکہ ڈھلنے کے واسطے بکثرت چاندی آتی رہی۔ حتیٰ کہ جون سنہ ۱۸۹۳ء میں ٹکسالیں بند کردی گئیں۔

۱۹۰۰- اس پنجسالہ میں دو جداگانہ قحط پڑے۔ پہلا قحط سنہ ۱۸۹۶ء کے آخری زمانے میں نمودار ہوا۔ اور سنہ ۱۸۹۷ء تک اس کا سلسلہ جاری رہا۔ دوسرا قحط سنہ ۱۸۹۹ء کے آخری زمانے میں نمودار ہوا۔ اور اس کا سلسلہ بھی دوسرے سال تک قائم رہا۔ ان دونوں قحطوں کی قریب قریب ایک سی حالت تھی۔ دونوں سخت تھے۔ اور تمام ملک میں پھیلے۔ گزشتہ پنجسالہ کے آخر میں جو قیمتوں میں تخفیف ہوئی تھی وہ چند روزہ تھی۔

سنہ ۵- سنہ ۲-۱۹۰۱ء میں چانول کے سوا اور فصلوں کی حالت کچھ اچھی نہیں رہی۔ اس وجہ سے قیمت میں بھی کوئی نمایاں تخفیف نہ ہو سکی لیکن بعد کے دو سال خصوصاً سنہ ۱۹۰۴ء میں فصلیں خوب ہوئیں اور خاص کر گیہوں بہت پیدا ہوا غلوں کی قیمتیں بھی اتر گئیں۔ مگر سنہ ۱۹۰۵ء میں وقت پیش آگئی۔ اس سال یہ ہوا کہ شمالی اور مغربی ہندوستان میں تو خشک سالی رہی۔ بنگال میں خوب بارش ہوئی۔ اور سیلاب آئے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۰۵ء سے قیمتوں میں پھر اضافہ ہونا شروع ہوا۔ خاص کر غلہ گراں ہونے لگا۔

۱۱-۰۶ سنہ ۱۹۰۶ء میں بھی گرانی برقرار رہی۔ کیونکہ گیہوں کے سوا ربیع کی اور فصلوں کی حالت اچھی نہ تھی۔ اور خریف کی فصلیں کثرت بارش اور سیلاب کی وجہ سے خراب ہو گئیں۔ بالخصوص بنگال میں بہت نقصان ہوا۔ صوبہ متحدہ میں فصلوں کی حالت اچھی تھی۔ لیکن چونکہ ملک کے دوسرے حصوں کی زراعت تباہ حال تھی۔ اس وجہ سے قیمتوں میں کوئی تخفیف نہ ہو سکی۔ اور جب جنوب مغربی برشگال سے بھی کام نہ بنا اور بارش نہ ہوئی تو ملک کے بیشتر حصے میں قحط نمودار ہو گیا۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں گیہوں اور روغنی تخموں کی فصلیں خراب ہو گئیں۔

اول تو بارش ہوئی کم دوسرے بے وقت ہوئی۔ خریف کی فصلیں بھی اچھی نہ ہوئیں سنہ ۱۹۰۷-۰۸ء میں جب شمالی ہند میں فصلیں ماری گئیں تو گرانی اور بھی بڑھ گئی۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں گیہوں کی فصل گزشتہ سال سے کسی قدر اچھی رہی۔ اور بنگال و برما میں چانول کی ایسی فصل ہوئی کہ لوگ حیرت کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۹۰۹ء میں عام طور پر قیمتیں اتر گئیں۔ مہاوٹ کی بارش بروقت ہونے سے سنہ ۱۹۱۰ء میں ربیع کی فصلیں اچھی پیدا ہوئیں۔ اس سال بارش خوب ہوئی اور زراعت بھی اچھی رہی۔ قیمتیں اترنی شروع ہوئیں۔ لیکن چانول کی قیمت بالخصوص برما میں وہی رہی جو اس سے پہلے سال تھی۔ وجہ یہ ہوئی کہ چین کی مانگ شروع ہوگئی اور وہاں کے لیئے چانول بہ کثرت برآمد ہونے لگا۔

سنہ ۱۹۱۱-۱۲ء

سنہ ۱۹۱۱ء میں فی الجملہ ربیع کی فصلیں اچھی رہیں۔ گرچہ شمالی اور مغربی ہندوستان میں فصلوں کو کہر سے نقصان پہنچا۔ قیمتوں میں تخفیف ہوتی رہی۔ لیکن اس سال بارش اچھی نہ ہوئی بالخصوص شمالی اور مغربی ہندوستان میں خریف کی فصلوں کو خشک سالی سے نقصان پہنچا۔ چانول کی قیمت اول تو یوں ہی بڑھنی شروع ہوئی۔ باہر کی مانگ اور برآمد نے اس میں دو چند اضافہ ہو گیا۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں مغربی اور شمالی ہندوستان کی فصلیں خشک سالی سے پھر خراب ہوگئیں۔ قیمتیں بڑھنی شروع ہوئیں۔ اور گرچہ اس سال فی الجملہ بنگال کی حالت کچھ خراب نہ تھی تاہم کثرت برآمد کی بدولت چانول کی قیمت برابر بڑھتی رہی۔

# چھٹا ضمیمہ

## اسباب گرانی

### قیمتوں کے متعلق سنہ ۱۹۱۴ء میں جو تحقیقات ہوئی اس کا خلاصہ

اگرچہ پورے طور پر یہ تعین نہیں ہو سکتا کہ جن جن اسباب کی وجہ سے آج کل ہندوستان میں قیمتیں بڑھی ہوئی ہیں ان میں سے ہر ایک کو موجودہ گرانی میں کس درجہ دخل ہے۔ اور ہر ایک کا کس قدر جداگانہ اثر پڑ رہا ہے۔ تاہم ان کی اہمیت کے لحاظ سے اسباب کو ترتیب دینا ضرور ہے۔ یوں تو دنیا کے تمام بڑے بڑے ملکوں میں قیمتیں بڑھ رہی ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں جسقدر قیمتوں میں اضافہ ہوا اس کی مثال دوسرے ملکوں میں نظر نہیں آتی۔ اسباب گرانی کی دو قسمیں سمجھنی چاہئیں۔ ایک تو وہ اسباب جو ہندوستان کے واسطے مخصوص ہوں اور جن کا اثر یہیں تک محدود ہو۔ دوسرے وہ اسباب جن کا اثر تمام دنیا پر پڑ رہا ہو اور عالمگیر ہو۔ ایک اور لحاظ سے بھی اسباب کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں یعنی کچھ تو وہ جو چند روزہ اور عارضی ہوں۔ اور کچھ وہ جن کا شروع سے اب تک گرانی سے تعلق چلا آتا ہو۔

جو اسباب ہندوستان کے واسطے مخصوص ہیں ان میں سے خاص خاص یہ ہیں:۔

برما کے علاوہ کل ملک میں مقابلۃً سامان خوراک کی پیداوار گھٹ گئی ہے داخلی اور خارجی ذرائع آمد و رفت میں ترقی ہونے سے مصارف نقل و حمل میں بہت تخفیف ہو گئی۔ جس کی وجہ سے سامان خوراک کی برآمد بڑھ گئی۔ اور اضافہ آبادی کی وجہ سے خود ملک میں اس کی طلب زیادہ ہو گئی۔ زر کی کثرت اور بنک کا قیام بھی گرانی کا ایک خاص باعث ہے۔ اب ان اسباب کو لیجئے جن کا اثر تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ سونے کی پیداوار میں اضافہ۔ اعتبار کی ترقی۔ تباہ کن لڑائیاں جن کا ایک عرصے سے سلسلہ بندھا ہوا ہے۔ اور نیز یہ کہ دولتمند قومیں فوج اور جنگی بیڑوں کی تیاری میں بہت کچھ محنت اور اصل لگا رہی ہیں

جب سے ہندوستان کی چیزوں کی دوسرے ملکوں میں مانگ بڑھی انکی قیمتوں میں بھی بہت اضافہ ہوگیا - تجارت بین الاقوام میں ہندوستان کی حالت درست ہونے سے قیمتوں پر قدرۃً بہت گہرا اثر پڑا - سر ڈیوڈ باربر اپنی نئی کتاب موسومہ معیار قدر میں تحریر فرماتے ہیں کہ گزشتہ پندرہ سال کے اندر ہندوستان کو تجارت بین الاقوام میں بہت ترقی حاصل ہوئی - اس ترقی کی بدولت جو ہندوستانی مبادلات کی شرح بڑھی تو سونے کی درآمد میں معقول اضافہ ہوا - اور سرکار ہند کو بھی روپیہ کی مقدار بڑھانی پڑی - اس صورت میں ہمیشہ قیمتیں اور اجرت خود بخود بڑھ جاتی ہیں -

خاص ہندوستان کے اندر سامان خوراک کی پیداوار میں کمی ہونے کی وجہ سے قیمتوں میں بہت اضافہ ہوا - قلت پیداوار سے اکثر یہ مراد ہوتی ہے کہ طلب رسد سے بہت بڑھی رہی یا یوں کہیے کہ رسد طلب کے مقابل بہت کم رہی - جب سے دوسرے ملکوں میں ہندوستان کی روئی - جوٹ اور دوسری تجارتی چیزوں کی مانگ بڑھی - یہی چیزیں زیادہ کاشت ہونے لگیں - اور غلے جو خوراک میں کام آتے ہیں کاشتکاروں کے دل سے اتر گئے اور ان کی کاشت میں کافی ترقی نہیں ہوئی - گرانی کا جو دور ہمارے زیر تحقیق ہے اس میں بارش ہوئی بھی کم اور بے وقت ہوئی - قلت پیداوار کا ایک باعث یہ بھی ہوا - یہ صورت سنہ ۱۸۹۱ء سنہ ۱۸۹۶-۹۷ء سنہ ۱۸۹۹-۱۹۰۰ء سنہ ۱۹۰۷-۸ء میں خاص طور پر پیش آئی - باقی سالوں میں بھی اس کا تھوڑا بہت ظہور ہوتا رہا - سال بسال خشک سالی اور فصلیں تباہ ہونے سے جو نقصان پہنچتا رہا اس کے مجموعی اثر کا پورا اندازہ نہیں کیا گیا - برما کے سوا باقی ہندوستان میں غلے کی پیداوار کی جو رفتار رہی اس کے اعداد و شمار کو بالتفصیل مطالعہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ آبادی کی ترقی کو پیش نظر رکھتے ہوئے پیداوار میں اتنا اضافہ نہیں ہوا جس قدر کہ ہونا چاہیے تھا - برما نے البتہ اس قلت پیداوار کی کچھ تلافی کر دی - وہاں چاولوں کی کاشت بہت پھیل گئی ہے - اور ابھی توسیع کی بہت گنجائش [illegible] سنہ [illegible]ء میں جب قحط پھیلا تو چاولوں کی ایک معقول بڑی مقدار برما

سے بنگال اور مدراس پہنچی۔ یورپ اور مشرق بعید کو اس کی برآمد روک دی گئی۔ اس طرح بڑے وقت میں برما آڑے آ گیا۔

بعض طبقوں میں مرفہ الحالی خاص طور پر بڑھی ہوئی نظر آتی ہے۔ بالخصوص جو لوگ جوٹ، روئی، روغنی تخم، اور گیہوں کی کاشت کرتے ہیں خوش حال ہو گئے ہیں، ان لوگوں کی استطاعت خرید بڑھ جانے سے تمام ضروریات کے صرف میں اضافہ ہو گیا ہے۔ مغربی طرز پر صنعت اور تجارت کے ترقی کرنے سے شہروں اور دوسرے صنعتی مرکزوں کی آبادی میں بسرعت اضافہ ہو رہا ہے۔ اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہے کہ آبادی کا ایک بڑا حصہ ادنی قسم کے بجائے اچھے قسم کا خورد و نوش کرتا ہے ملک میں تقریباً کل طبقوں کے رہنے سہنے کا طرز بہت بدل گیا ہے۔ نہ صرف تنعمات کا رواج بڑھ رہا ہے بلکہ خوراک کی عمدگی پر بھی زیادہ نظر ہے۔ گوشت۔ مچھلی۔ ترکاری۔ گھی اور دودھ ان چیزوں کا خرچ بہت بڑھ گیا ہے۔ کبھی کبھی کاشتکار بھی ان چیزوں کی خریداری میں متوسط الحال لوگوں کے مقابل بن جاتے ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ اکثر چیزوں کی طلب میں بہت اضافہ ہو گیا ہے اور نتیجہ یہ کہ قیمتیں چڑھ رہی ہیں۔

خود ہندوستان کے اندر اور نیز ہندوستان اور دیگر ممالک کے درمیان ذرائع آمد و رفت کے ترقی کرنے اور مصارف نقل و حمل میں تخفیف ہونے سے بھی قیمتوں میں اضافہ ہوا ہے۔ گزشتہ ۲۳ سال کے اندر ریلوں کا راستہ دو چند ہو گیا۔ اور ریل کا محصول تقریباً ۳۰ فی صدی گھٹ گیا۔ پہلے جو بعض مقامات میں یہ دقت تھی کہ بڑے بڑے بازاروں کو مال نہیں بھیج سکتے تھے اور منافع سے محروم رہتے تھے۔ ریل نکلنے سے وہ دقت بھی رفع ہو گئی۔ تجارتی جہاز اور بحری تار جاری ہونے سے ہندوستان دنیا کی تجارت میں اور بھی زیادہ حصہ لینے لگا۔ اب حالت یہ ہے کہ ہندوستانی بندرگاہوں میں قیمتیں دوسرے ملکوں کی قیمتوں سے وابستہ رہتی ہیں۔ اور اندرون ملک کی قیمتیں بندرگاہوں کی سطح پر ٹھیری رہتی ہیں۔ پہلے قیمتوں میں اس درجہ تعلق اور بندھن نہ تھا۔ سنہ ۱۸۹۰ء اور سنہ ۱۹۱۰ء کے درمیان جو ریلوے محصول

میں تخفیف ہوئی اس کا قیمتوں کے تناسب پر بہت گہرا اثر پڑا نہ صرف ہندوستان کے مختلف حصوں میں بلکہ ان بازاروں میں بھی جو کہ بیرونی ممالک اور ہندوستان کے مابین قائم ہیں۔ حال میں ہندوستان اور دوسرے ممالک کے بازاروں میں جو باہمی تعلق بڑھ گیا ہے کہ ایک بازار کی قیمتوں کا دوسرے بازاروں کی قیمتوں پر قوی اثر پڑتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خارجی اسباب کا بمقابل سابق اب یہاں کی قیمتوں پر زیادہ زیادہ اثر پڑنے لگا ہے۔ اگر یورپ یا امریکہ میں گیہوں، چانول۔ روئی، روغنی تخم کی کمی واقع ہوتی ہے تو اس کا اثر فوراً ہندوستان میں نمودار ہو جاتا ہے۔ اور نہ صرف بندرگاہوں میں بلکہ اندرون ملک ان چیزوں کی قیمتیں عالمگیر بازاروں کی قیمتوں کی پیروی کرتی ہیں۔ البتہ لوگ اس بات کو محسوس کم کرتے ہیں۔ اندرون ملک کے بازاروں میں اور نیز ہندوستان اور دیگر ممالک کے بازاروں میں جو اس درجہ باہمی یکرنگی پیدا ہو گئی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ تو قیمت اس قدر اتر سکتی ہے اور نہ چڑھ سکتی ہے جس قدر کہ دوسری حالت میں ممکن تھا اگر یہ بات نہ ہوتی تو ہر بازار میں جدا جدا قیمتیں کچھ کم اور کچھ بیش رہ سکتیں اور رہتی تھیں۔

ہندوستان میں مشترک سرمایہ دار بنکوں کا اصل اور محفوظ ذخیرہ دس سال کے اندر ۱۹۱۱ء تک بقدر ۵٦ فی صدی بڑھ گیا۔ ان میں پریسیڈنسی بنک بھی شامل ہیں۔ ذاتی امانتیں یعنی وہ رقمیں جو لوگوں نے بنکوں میں جمع کر دیں اور جو کاروبار میں کام آئیں ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۴ء تک ان کا اوسط ۲۲ کرور رہا۔ اور ۱۹۱۱ء میں ان کی مقدار ۸۵ کرور ہو گئی۔ تینوں پریسیڈنسی شہروں یعنی کلکتہ۔ بمبئی اور مدراس میں ۱۸۹۰ء میں بقدر ایک ارب۔ ۳۸ کرور روپیہ ہنڈیاں سکریں۔ اور ۱۹۱۲ء میں ایسی ہنڈیوں کی رقم پانچ ارب ۱۷ کرور روپیہ تھی۔ اس طرح پر جو زر میں اضافہ ہوا بنکوں کا کاروبار پھیلا اور اعتبار نے ترقی پائی تو کاروبار میں لوگوں کے ذرائع وسیع ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی عام طور پر چیزوں کی مانگ بڑھی قیمتیں اس قدر چڑھ گئیں کہ بحالت

دیگر غالباً اس قدر اضافہ ممکن نہ ہوتا۔

اعتبار کی ترقی کچھ ہندوستان تک محدود نہیں بلکہ تمام دنیا میں پھیل رہی ہے۔ اور قیمتوں کے عالمگیر اضافہ کا یہ سب سے بڑا سبب ہے۔ اس سے قبل بیان ہو چکا ہے کہ سونے کی رسد میں اس قدر اضافہ ہو گیا ہے کہ کسی زمانہ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ ایک تو سونے کی افراط دوسرے اعتبار کی توسیع یعنی یہ کہ طرح طرح کی ضمانت پر بنک روپیہ چلانے لگے۔ ان دو صورتوں سے اعتبار میں بہت نمایاں ترقی ہو گئی۔

۱۸۹۹ء سے جو تباہ کن لڑائیوں کا سلسلہ بندھا ہے تو اب تک ختم نہیں ہوا جنگی تیاریوں کی بدولت بھی گرانی پھیل رہی ہے۔ اصل اور محنت غیر پیدا آور کاموں میں صرف ہو رہی ہے۔ فوجوں اور جنگی بیڑوں کی ضرورت سے بہت سی چیزوں کی مانگ بڑھی رہتی ہے۔ اس طرح گرانی اور ترقی کرتی ہے۔

موجودہ گرانی کے یہی خاص اسباب مانے جاتے ہیں جو اوپر بیان ہوئے ان کے اثر کا جدا جدا تخمینہ کرنا محال ہے۔ کیونکہ اثرات ملے جلے رہتے ہیں۔ اور اسباب آپس میں ایک دوسرے پر بھی اثر ڈالتے ہیں۔ تاہم بعض اسباب مقابلۃً زیادہ اہم ہیں۔ مثلاً ذرائع آمد و رفت کی ترقی اور مصارف نقل و حمل کی تخفیف ہونا معیار زندگی اعلیٰ ہو جانے سے چیزوں کی طلب میں اضافہ ہونا۔ سونے کی رسد اور اعتبار کا رواج بڑھنے سے بنک کے کاروبار کا عروج اور اعتبار کی ترقی ہونا۔ ٹرنسوال میں سونا بکثرت دستیاب ہو رہا ہے اور اس کے صاف کرنے کا بھی بہت اچھا طریق معلوم ہو گیا ہے گرانی کے کچھ اسباب اور بھی ہیں جن کا اوپر ذکر نہیں آیا مثلاً بہت کچھ اصل اور محنت کا ریلوں کی توسیع اور ترقی میں یا پسماندہ ممالک کے غیر آباد حصوں کے صاف اور آباد کرنے میں صرف ہوتا ان کاموں کے فوائد تو کچھ عرصہ بعد ظاہر ہونگے لیکن ان کی بدولت چیزوں کے صرف میں ابھی سے بہت اضافہ ہو گیا۔ اور پیداوار اس کا ساتھ نہ دے سکی۔ لامحالہ قیمتیں بڑھ گئیں۔

# ساتواں ضمیمہ

## اضافۂ اجرت

حال میں یہ تجویز قرار پائی کہ ملک کے مختلف صوبوں میں اجرت کے متعلق پنجسالہ اعداد و شمار جمع ہوا کریں۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء میں جو شمار ہوا اس کے نتایج شایع ہو چکے ہیں۔ کبھی کبھی جو اس سے قبل بھی شمار ہوا تھا۔ اس کے نتایج کا حال کے نتایج سے مقابلہ کرتے ہیں تو بہت سبق آموز باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ جدید نتایج کو بہت صحیح اور معتبر بتاتے ہیں۔ جیسے بھی ہوں ذیل میں درج ہیں۔

**بنگال**۔ ۱۹۰۸ء میں ایک ابتدائی اور بعد ۱۹۱۱ء میں ایک باقاعدہ شمار ہوا۔ لیکن چونکہ ۱۹۰۸ء میں قحط کی وجہ سے حالت بہت غیر معمولی ہو رہی تھی۔ اس لئے ان دونوں شماروں کے نتایج کا مقابلہ ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ کھیتی باڑی کے غیر مہارت یافتہ مزدور کی معمولی روزانہ اجرت کم سے کم دو آنہ تھی۔ جیسے کہ چھوٹے ناگپور میں اور زیادہ سے زیادہ ۴ آنہ جیسے کہ بردوان اور پریسیڈنسی کے علاقوں میں قصباتی غیر مہارت یافتہ مزدور کی اجرت ڈھائی آنہ سے لے کر ۵ آنہ تک تھی مہارت یافتہ مزدوروں کی اجرت کے اس قدر مدارج ہیں کہ ان کے متعلق کوئی عام مقدار بیان نہیں ہو سکتی۔ معماروں کو ۷ - ۸ آنہ روز ملتے ہیں اور کلکتے میں ۱۱ آنہ تک مل جاتے ہیں کلکتے میں لوہار۔ بڑھئی کی روزانہ اجرت سوا روپیہ تک رہتی ہے۔

**مشرقی بنگال و آسام**۔ مشرقی بنگال میں زراعتی مزدور کو روزانہ اجرت اوسطاً ڈھاکے میں چھ آنے سے لے کر چٹاگانگ کے پہاڑی علاقوں میں ۱۱ آنہ تک ملتی ہے۔ صرف موسمی توطن کی بدولت اجرت ۱۱ آنہ تک بڑھ جاتی۔ اس لئے یہ مقدار زیادہ دیرپا نہیں ہوتی۔ آسام میں اجرت کا اوسط ۵ اور ۸ آنے کے درمیان رہتا ہے۔

**صوبہ متحدہ**۔ اول ۱۹۰۶ء اور اس کے بعد ۱۹۱۱ء میں شمار ہوئی۔

زراعتی غیر مہارت یافتہ مزدوروں کی اجرت مغربی اضلاع میں زیادہ بڑھی اور مشرقی میں کم اور بندیلکھنڈ میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ روزانہ اجرت مشرقی حصے میں ڈیڑھ آنے سے لیکر پہاڑی حصوں میں ۴ آنہ تک رہی۔ فصل خریف خراب ہو جانے کی وجہ سے اجرت کی یہ شرح معمول سے کم تھی۔ قصبوں اور شہروں میں غیر مہارت یافتہ مزدوروں کی روزانہ اجرت ۳ آنہ سے ۶ آنہ تک اور مہارت یافتہ کی ۶ آنہ سے ڈیڑھ روپیہ تک تھی۔ قصباتی مزدوروں کی اجرت میں ہر جگہ اضافہ ہو رہا ہے۔

**پنجاب**۔ ۱۹۰۹ء میں ایک ابتدائی اور ۱۹۱۲ء میں باقاعدہ شمار ہوا۔ اس دوران میں تقریباً ہر ضلع کے اندر دیہاتی مزدوروں کی اجرت بڑھ گئی۔ ایک گڑگاؤں میں ۲ آنہ روزانہ کی قدیم شرح برقرار رہی۔ دوسرے مقامات میں ۴ آنے سے لے کر ۸ آنے تک شرح مروج ہے۔ مقابلۃً صوبۂ مشرقی میں شرح اجرت سب سے کم ہے۔

**شمال مغربی سرحدی صوبہ**۔ پنجاب کے قریب ترین اضلاع کے مقابل شرح اجرت یہاں زیادہ ہے۔ غالباً زراعت کی ترقی اور توسیع کی وجہ سے مزدوروں کی مانگ زیادہ رہتی ہے۔

**صوبۂ متوسط**۔ ۱۹۱۱-۱۲ء تین سال کے متعلق اعداد شمار قابل اطمینان مل گئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوا کہ دیہات اور قصبات میں شرح اجرت بتدریج برابر بڑھ رہی ہے۔ دیہاتی مزدوروں کی اجرت چھتیس گڑھ میں ۳ آنے سے لے کر برار اور ناگپور میں ۴ آنہ تک رہتی ہے۔ آبپاشی اور ریل کے کاموں اور زراعت کی ترقی کی بدولت اجرت میں یہ اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن ۱۹۱۱ء سے جو قیمتیں بڑھنی شروع ہوئیں تو اس اضافے پر مخالف اثر پڑا یعنی اجرت صحیحہ میں اس قدر اضافہ نہ ہو سکا جس قدر کہ اجرت متعارفہ میں نظر آتا تھا۔

**برما**۔ مغربی برما بہت سرعت سے ترقی کر رہا ہے۔ وہاں زراعتی مزدور کی اجرت روپے روز تک بڑھی ہوئی ہے البتہ اراکین کے قرب وجوار اور شمالی برما میں یہ کیفیت نہیں۔ وہاں مزدوروں کا رکھنا دشوار ہے۔ یہ حصہ پس ماندہ

حالت میں ہے تاہم ہندوستان کے مقابل پھر بھی یہاں اچھی اجرت ملتی ہے یعنی کم سے کم چار آنے یہاں روزانہ اجرت کا رواج کم ہے موسموں کے حساب سے مزدوروں کو اجرت دی جاتی ہے۔ صرف زراعت کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں اجرت روزانہ مل جاتی ہے۔ یہاں کھیتوں میں زیادہ تر عورتیں کام کرتی ہیں۔

**مدراس۔** ۱۹۰۸-۱۱ء تین سال کے درمیان عام طور پر اجرت میں اضافہ ہوا۔ دیہات میں غیر مہارت یافتہ مزدور کی روزانہ اجرت کم سے کم ڈیڑھ آنے سے ۱۲ آنہ تک رہتی ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ چار آنے سے آٹھ آنے تک دکن کے مقابل جنوب میں شرح بڑھتی رہتی ہے۔ ۱۹۱۲-۱۳ء میں قیمتوں کے ساتھ شرح اجرت بھی بڑھ گئی۔

**بمبئی۔** ۱۹۱۱ء میں صرف ایک مرتبہ شمار ہوئی۔ طاعون کی وجہ سے مزدوروں کی تعداد گھٹ گئی وہاں بڑے بڑے کارخانے جاری ہیں۔ بحری گھاٹ اور ریل کی تعمیر میں توسیع ہوتی رہتی ہے۔ ٹاٹا صاحب کا بہت عظیم الشان کارخانہ چل رہا ہے ان ترقیوں کا زراعتی مزدور کی اجرت پر مفید اثر پڑ رہا ہے۔ شرح اجرت بالعموم ۴ آنے روز ہے۔ جہاں وحشی قومیں آباد ہیں وہاں کم ہے۔ سندھ میں شرح اجرت مقابلۃً بڑھ رہی ہے۔

خاص خاص صنعتوں کی اجرت کا اوسط ۱۹۱۳ء

| | |
|---|---|
| سوتی پارچہ | [illegible] ۸ر ماہانہ |
| اونی پارچہ | [illegible] ۱۰ر ماہانہ |
| کاغذ | [illegible] ۱۲ر ماہانہ |
| چاول | [illegible] ماہانہ |
| شراب | [illegible] ماہانہ |
| جار | [illegible] ۱۰ر ماہانہ |
| جوٹ | [illegible] ۱۲ر فی ہفتہ |
| کوئلہ کی کان | ۷ر آنہ روزانہ |

# آٹھواں ضمیمہ

اوسط اجرت ماہوار روپے کے حساب سے

| | سنہ ۱۸۷۳ء | | | سنہ ۱۹۰۹ء | | |
|---|---|---|---|---|---|---|
| | زراعتی مزدور | خدمتگار | معمار بڑھئی لوہار | زراعتی مزدور | خدمتگار | معمار بڑھئی لوہار |
| برما | ۳٫۵ تا ۱۴٫۳ | ۳ تا ۱۴٫۱ | ۱۵٫۲۶ تا ۳۰٫۷ | ۱۳٫۹ تا ۱۵٫۱۶ | ۱۲٫۳۶ تا ۱۴٫۲ | ۲۶٫۶ تا ۳۳٫۵ |
| آسام | ۶٫۵ تا ۶٫۷ | ۵٫۸ تا ۶٫۳ | ۶٫۹ تا ۱۴٫۶ | ۹٫۶۱ تا ۱۰٫۹ | ۸٫۲ تا ۹٫۳ | ۱۵٫۶ تا ۲۳٫۴ |
| بنگال | ۲٫۴ تا ۳٫۴ | ۲٫۷ تا ۳٫۸ | ۵٫۳ تا ۹٫۸ | ۶٫۰ تا ۷٫۳ | ۶٫۲ تا ۹٫۸ | ۱۱٫۹ تا ۱۵٫۲ |
| صوبہ متحدہ | ۳٫۸ | ۴٫۴ | ۹٫۵ | — | — | — |
| اودھ | ۳٫۵ | ۴٫۵ | ۷٫۴ | — | — | — |
| راجپوتانہ | ۵ | ۵٫۵ تا ۵٫۸ | ۱۰٫۲ تا ۱۲٫۸ | ۳٫۵۲ تا ۴٫۵ | ۴٫۷ تا ۷ | ۱۱٫۷ تا ۲۱ |
| متوسط ہند | ۴٫۵ تا ۵٫۵ | ۵٫۵ تا ۶ | ۱۲ تا ۱۲٫۵ | ۷٫۵ | ۵٫۵ تا ۶٫۵ | ۱۸٫۸ تا ۱۹٫۷ |
| پنجاب سرحدی صوبہ | ۵٫۲ | ۵٫۶ | ۱۲٫۸ | ۱۰٫۸ | ۷٫۸ | ۲۵ |
| سندھ | ۱۰ تا ۱۲٫۵ | ۸ تا ۱۰ | ۲۲٫۵ تا ۲۵ | ۱۳٫۵ | ۱۲٫۵ | ۲۳٫۵ تا ۳۰ |
| بمبئی | ۷٫۲ | ۸٫۵ | ۱۸٫۳ تا ۲۴٫۲ | ۹ | ۹ | ۱۹٫۵ تا ۲۴٫۱ |
| صوبہ متوسط | ۴ | ۵٫۳ | ۱۲٫۶ | ۵٫۷ | ۷ تا ۷٫۷ | ۲۲٫۵ تا ۲۶٫۷ |
| برار | ۵ | ۷ | ۱۹٫۵ | ۱۰ | ۱۰ | ۲۲٫۵ تا ۳۰ |
| حیدرآباد | ۵٫۱ تا ۸ | ۶ تا ۷ | ۱۲٫۸ تا ۱۵ | ۸ تا ۱۱ | ۸ تا ۱۲ | ۲۰ تا ۲۵ |
| مدراس | ۳٫۹ | ۵٫۷ | ۱۲٫۷ | ۴٫۵ | ۶٫۳ | ۱۳٫۸ تا ۱۵٫۵ |
| میسور | ۵٫۸ تا ۷٫۸ | ۵٫۱ تا ۶٫۱ | ۱۴ تا ۱۸٫۸ | ۹٫۵ | ۹ | ۷٫۵ تا ۲۳٫۵ |
| کورگ | ۷٫۵ | ۸ | ۲۲٫۵ | ۷ تا ۹ | ۸ تا ۱۰ | ۱۹ تا ۳۰ |

# نواں ضمیمہ

## مشترک سرمایہ دار کارخانے

| | سنہ ۱۹۰۰ء | سنہ ۱۹۱۲ء |
|---|---|---|
| بنک وقرض | ۴۰۷ | ۴۷۷ |
| بیمہ | ۴۳ | ۱۸۶ |
| جہاز رانی | ۹ | ۲۰ |
| ریل اور ٹریموے | ۱۸ | ۳۶ |
| تجارت | ۲۵۲ | ۷۶۹ |
| چاے | ۱۲۹ | ۷۷ |
| کوٹھیاں | ۱۹ | ۳۱ |
| کوئلہ | ۳۴ | ۱۳۴ |
| سونا | ۷ | ۸ |
| دوسری کانیں | ۱۳ | ۶۵ |
| روئی کے کارخانے | ۱۵۲ | ۲۰۵ |
| جوٹ کے کارخانے | ۲۱ | ۳۵ |
| اون، ریشم اور سن کے کارخانے | ۲۵ | ۱۶ |
| جوٹ اور روئی کے پریس | ۱۱۳ | ۱۴۰ |
| آٹا پیسنے کے بڑے کارخانے | ۱۸ | ۲۹ |
| تعمیرات | ۴ | ۲۹ |
| شکر | ۱۱ | ۲۲ |
| متفرق کاموں کے کارخانے | ۶۵ | ۱۳۰ |
| میزان | ۱۳۴۰ | ۲۴۰۹ |

# دسواں ضمیمہ

## بنکوں کے اصل میں اضافہ

| | اصل و ذخیرۂ محفوظ لاکھ روپیہ کے حساب سے | | | زر امانت لاکھ روپیہ کے حساب سے | | | نقد فاضلات لاکھ روپیہ کے حساب سے | | |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| | سنہ ۱۹۰۴ء | سنہ ۱۹۱۳ء | اضافہ فیصدی | سنہ ۱۹۰۴ء | سنہ ۱۹۱۳ء | اضافہ فیصدی | سنہ ۱۹۰۴ء | سنہ ۱۹۱۳ء | اضافہ فیصدی |
| پریسیڈنسی بنک | ۶۱۰ | ۷۴۸ | ۲۳ | ۲۵۱۵ | ۴۲۳۷ | ۶۸ | ۱۰۲۲ | ۱۵۳۸ | ۵۰ |
| مبادلات کے بنک | ۳۲۰۴ | ۵۶۷۴ | ۷۷ | ۱۶۳۲ | ۳۱۰۳ | ۹۰ | ۴۹۴ | ۵۸۸ | ۱۹ |
| مشترک سرمایہ دار ہندوستانی بنک جن کا اصل ۵ لاکھ سے زیادہ ہے | ۱۴۵۰ | ۲۶۴ | ۱۵۱ | ۱۱۵۱ | ۲۲۵۹ | ۹۶ | ۱۴۴ | ۴۰۰ | ۱۷۸ |
| میزان | ۳۹۵۹ | ۶۷۸۶ | ۷۱ | ۵۲۹۸ | ۹۵۵۹ | ۸۱ | ۱۶۶۰ | ۲۵۲۶ | ۵۲ |

بحساب فی صدی زر نقد کی نسبت زر امانت کے ساتھ حسب ذیل تھی۔

| | سنہ ۱۹۰۴ء | سنہ ۱۹۱۳ء |
|---|---|---|
| پریسیڈنسی بنک | ۴۰ | ۳۶ |
| مبادلات کے بنک | ۲۹ | ۱۹ |
| مشترک سرمایہ دار ہندوستانی بنک جن کا اصل ۵ لاکھ سے زیادہ ہے۔ | ۱۲ | ۱۸ |

# گیارہواں ضمیمہ

## زر و مالیہ

ہندوستان کے زر اور مالیہ کے متعلق جو شاہی کمیشن مقرر ہوا تھا اسکی رپورٹ کا خلاصہ:۔

سہولت حوالہ کی غرض سے ہم اپنے نتائج کا خلاصہ حسب ذیل درج کرتے ہیں۔

(۱) روپے کی قدر مبادلہ کو ایک مستحکم بنیاد پر قائم کرنا ہندوستان کے واسطے بہت اہم اور ضروری ہے۔ (دفعہ ۸)

(۲) روپے کی قدر مبادلہ قائم رکھنے کے واسطے جو انتظام کیا گیا ہے وہ پورے طور پر ۱۸۹۸ء والے کمیشن کی سفارش کے مطابق نہیں ہے۔ البتہ وہ ایک تتمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ایسا ہی ہونا ضروری اور مناسب حال بھی تھا۔ (دفعہ ۷، و ۴۴ تا ۴۶)

(۳) حال کا انتظام ۱۹۰۷ء کے نازک زمانے میں بہت کارآمد ثابت ہوا۔ اب تک وہی ایک ایسا وقت آیا جبکہ اس انتظام کے استحکام کا سخت امتحان ہوا۔ (دفعہ ۴۸ - ۴۹)

(۴) اب وقت آگیا ہے کہ ہندوستان کے طریق زر کے انتہائی مقصد پر از سر نو غور کریں۔ ۱۸۹۸ء والے کمیشن کا تو یہ عقیدہ تھا کہ ہندوستان میں طلائی معیار قدر قائم رکھنے کے واسطے طلائی زر کا اجرا ضروری ہے۔ لیکن گزشتہ ۱۵ سال کے تجربہ سے ثابت ہوا کہ طلائی زر کے بغیر بھی یہاں طلائی معیار برقرار رہ سکتا ہے (دفعہ ۴۷ و ۵۰)

(۵) اندرون ملک طلائی زر استعمال کرنا ہندوستان کے حق میں کچھ مفید نہ ہوگا

(۶) ہندوستان میں نہ طلائی زر کی کوئی خواہش اور نہ ضرورت یہاں کے واسطے روپیہ اور نوٹ ہی خوب موزوں ہیں (دفعہ ۵۵ و ۷۶)

(۷) یوں تو طلائی زر کی ٹکسال کھولنے کی ہندوستان میں کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر ہندوستانی لوگ دل سے اس کے خواہشمند ہوں اور ساتھ ہی سرکار ہند اس کے مصارف برداشت کرنے پر آمادہ ہو تو کیا ہندوستانی

اور کیا شاہی حیثیت سے اُس کے کھولنے میں کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا البتہ یہ ضرور ہے کہ جو سکہ ڈھلے وہ ساوُرن اور نصف ساوُرن ہی ہو درحقیقت یہ ایک ایسا معاملہ ہے کہ ہندوستانیوں کی خوشی کا اس میں سب سے زیادہ لحاظ کرنا چاہیئے۔ (دفعہ ۶۹ تا ۷۲)

(۸) اگر طلائی زر کی ٹکسال نہ کھولی جائے تو بمبئی کی ٹکسال میں زر کے مبادلے میں صاف کیا ہوا سونا لینے کا انتظام ہونا چاہیئے (دفعہ ۷۳)

(۹) لوگ جس قسم کا زر چاہیں خواہ روپیہ نوٹ یا طلائی سرکار اسی کا انتظام کرے البتہ نوٹ کا رواج بڑھانا مفید ہوگا۔ (دفعہ ۷۶)

(۱۰) خاص بات یہ ہے کہ داخلی زر کو مبادلات خارجہ میں سنبھالنے کے واسطے محفوظ ذخیرۂ طلائی کی ایک معقول مقدار موجود رہنی چاہیئے (دفعہ ۷۶)

(۱۱) سردست ذخیرہ معیار طلائی کی کوئی انتہائی مقدار مقرر نہیں ہونی چاہیئے (دفعہ ۸۶)

(۱۲) روپیہ ڈھالنے کا منافع سردست بہ تمام وکمال ذخیرہ معیار طلائی میں جمع ہوتا رہنا چاہیئے۔ (دفعہ ۸۹)

(۱۳) ذخیرہ معیار طلائی کا بیشتر حصہ بشکل طلا محفوظ رہنا چاہیئے۔ ذخیرہ معیار طلائی اور ذخیرہ زر کاغذی کی اشاعت کے مبادلے سے بآسانی ایک کرور پونڈ دستیاب ہوسکتے ہیں۔ جوں جوں موقع ملے اس مقدار کو بڑھا کر ڈیڑھ کرور کر دینا چاہیئے۔ اور اس کے بعد سے ذمہ دار حکام یہ کوشش کریں کہ کل ذخیرے کا نصف بشکل طلا موجود رہے۔ (دفعہ ۹۳ تا ۱۰۰)

(۱۴) ذخیرہ معیار طلائی کی جو ایک شاخ ہندوستان میں قائم ہے اور جس میں روپیہ جمع رہتا ہے توڑ دینی چاہیئے۔ طلا کے مبادلے میں کل روپیہ ذخیرہ زر کاغذی کے حوالے کر دینا چاہیئے (دفعہ ۹۸)

(۱۵) ذخیرہ معیار طلائی جمع رکھنے کے واسطے لندن ہی سب سے بہتر اور موزوں مقام ہے۔ (دفعہ ۹۰ و ۱۰۰)

(۱۶) سرکار اس بات کا ذمہ لے کہ جب ضرورت ہو ہندوستان میں لندن کے

واسطے ایک شلنگ ۴ $\frac{۲۹}{۳۲}$ پنس فی روپے کے حساب سے بل یا ہنڈیاں فروخت کرے۔

(۱۷) ہندوستان میں زر کاغذی کے طریق کو زیادہ سہل کر دینا چاہیئے نوٹوں کے محفوظ ذخیرے کا امانتی حصہ یعنی وہ حصہ جس سے ہندوستانی اور برطانوی سرکار کے تمسکات خریدے جاسکیں۔ ۱۴ کرور روپے سے بڑھا کر ۲۰ کرور کر دینا چاہیئے اور آیندہ کے واسطے اس کی انتہائی مقدار مقرر کر دی جائے۔ سرکاری خزانوں میں جس قدر نوٹ ہوں وہ اور جسقدر نوٹ جاری ہوں اُن کا ایک تہائی حصہ۔ اس حد تک امانتی حصہ رکھا جائے اس مقدار کے اندر سرکار کو مجاز ہونا چاہیئے کہ دوامی سرکاری تمسکات خریدنے کے بجائے چاہے تو عارضی کاموں اور میعادی قرضوں میں امانتی حصہ لگائے (دفعہ ۱۱۲ - ۱۱۳)

(۱۸) ہماری رائے میں پانسو روپے کے نوٹ کو بھی سو روپے والے نوٹ کی طرح عام بنا دینا چاہیئے یعنی یہ کہ بالحاظ حلقۂ اجرا کے ہر کہیں اس کا خردہ مل سکے۔ نوٹ بھنانے میں جہاں تک ہو سکے سہولت رہنی چاہیئے (دفعہ ۱۱۵)

(۱۹) چند سال سے ہندوستان اور لندن میں مجموعی فاضلات کی مقدار معمول سے بڑھی رہتی ہے۔ اس کی خاص وجہ کچھ تو اتفاقی اسباب ہیں اور کچھ ہندوستان کی غیر معمولی مرفہ الحالی (دفعہ ۱۲۵ - ۱۲۶)

(۲۰) ہندوستان کا بجٹ یا موازنہ تیار کرنے میں احتیاط بجا اور درست ہے۔ لیکن چند سال سے احتیاط حد سے بڑھی نظر آتی ہے۔ (دفعہ ۱۲۶ - ۲۸)

(۲۱) اگر مالی سال کی ابتدا یکم اپریل کی بجائے یکم نومبر یا یکم جنوری سے شمار ہو تو غالباً سرکار ہند زیادہ صحت کے ساتھ سالانہ بجٹ تیار کر سکے گی۔ اس تبدیلی سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ صاحب وزیر ہند کو جس قدر لندن میں قرض لینا ہوگا وہ اس کو اپنی ضروریات کے مطابق زیادہ تحقیق طور پر معین کر سکیں گے۔ چنانچہ ہم اس تجویز کی سفارش کرتے ہیں۔

(دفعہ ۱۲۸ - ۱۹۰)

(۲۲) فاضلات محاصل لندن کو منتقل کر دیتے ہیں تاکہ جدید قرضہ نہ لینا پڑے یا مصارف کے واسطے جو قرض لیا گیا ہو اس میں سے کچھ ادا کر دیا جائے یہ طریق تجربے سے ہندوستان کے حق میں مفید ثابت ہوا ہے۔ صاحب وزیر ہند کے پاس وقتاً فوقتاً جو فاضلات جمع ہوتے رہے اُن سے اُنھوں نے بہت اچھا کام لیا۔ یا تو اس سے خرچ چلایا یا قرضہ ادا کر کر دیا۔ (دفعہ ۱۳۰ اور ۱۳۳ و ۱۷۹)

(۲۳) لیکن سرکار ہند کے قرضے کے متعلق ہم جو کچھ تجویز پیش کرتے ہیں اس کے بموجب یہ ضرور ہے کہ جن مواقع پر فاضلات لندن کو منتقل کئے جاتے ہیں ان پر از سر نو غور کیا جائے۔ اگرچہ مقدار سے کوئی بحث نہ ہوگی۔ (دفعہ ۱۳۳)

(۲۴) سرکار ہند کا جداگانہ خزانوں کا طریق کچھ اچھا نہیں ہے وقتاً فوقتاً جو ہندوستان کے بازاروں میں روپیے کی کمی پڑتی رہتی ہے یہ بھی بڑی حد تک اسی طریق کا نتیجہ ہے۔

(۲۵) ہماری تجویز یہ ہے کہ سرکار ہند معمولاً اپنی فاضلات میں سے پریسیڈنسی بنکوں کو ضمانت پر قرض دیدیا کرے ضروری شرائط سرکار ان بنکوں سے طے کرے۔

(۲۶) یہ سوال کہ فاضلات کو کہاں رکھیں۔ وائسرائے اور وزیر ہند آپس کے مشورے سے کام چلائیں۔ اگرچہ اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیئے کہ موافق شرح مبادلہ پر ضروری رقم لندن پہنچتی رہے۔ تاہم دیگر امور کا لحاظ کرنا بھی ضرور ہے۔ خصوصاً یہ کہ فاضلات قرض وہیں لگا دینے سے ہندوستان میں کہاں تک کام آسکتی ہیں۔ (دفعہ ۱۵۹ - ۶۱)

(۲۷) ہماری ان تجاویز پر سرکار عمل کرے تو بتدریج اور احتیاط کے ساتھ کرے۔

(۲۸) ہماری رائے میں یہاں پر سالانہ روپے کے قرض کی مقدار جہاں تک

ہوسکے بڑھانی چاہیئے حال کے چند قرضوں کے اعداد سے مترشح ہوتا ہے کہ اس بارے میں ضرورت سے زیادہ احتیاط کی جاتی ہے۔ روپے کے قرض کے تمسکات پر جو تصدیق ہوتی ہے اس کے قواعد کو سہل بنانا چاہیئے۔ اور تمسکات کی نئی قسمیں بھی جاری ہونی چاہئیں۔ اس طرف ہم خاص توجہ دلاتے ہیں۔ (دفعہ ۱۶۷ - ۶۹)

(۲۹) صاحب وزیر ہند جو کونسل بل یا ہنڈی فروخت کرتے ہیں وہ سہولت تجارت کی خاطر نہیں کرتے بلکہ اس لئے کہ سرکار ہند کے حساب میں جس قدر روپیہ لندن میں خرچ ہو وہ اس طرح سے وصول ہو جاوے۔

(۳۰) یہ سچ ہے کہ کبھی کبھی وزیر ہند نے اپنی ہنڈیاں نہایت ادنی شرح پر فروخت کر ڈالیں۔ حالانکہ لندن میں اُس کو روپے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن ہم یہ مناسب نہیں سمجھتے کہ ہنڈیوں کی مقدار یا شرح کے باب میں وزیر ہند کے اختیارات کو کسی طرح محدود کیا جائے البتہ ایک شرط ضروری ہے وہ یہ کہ شرح مبادلہ مقامات طلا کے اندر اندر رہنی چاہیئے۔ ہنڈیوں کی مقدار اور ان کی فروخت کا وقت سرکار کی ضرورت کے لحاظ سے منظور کرنا چاہیئے۔ شرح مبادلہ کا لحاظ رکھنا بھی ضرور ہے۔ ہنڈیاں خواہ فاضلات خزانے پر جاری ہوں یا ذخیرہ معیار طلا پر، سب میں یہی اصول رکھنا چاہیئے۔ (دفعہ ۱۸۱ - ۸۵)

(۳۱) وزیر ہند نے جو حال میں قرضے کی تجدید کی ہے اس میں بھی ضرورت سے زیادہ احتیاط کی گئی ہے (دفعہ ۱۹۳)

(۳۲) دفتر وزیر ہند میں فاضلات کی بڑی بڑی رقمیں جو لندن کے معتبر لوگوں کو قلیل المدت قرضے پر دی جاتی ہیں۔ یہ طریق یوں تو بہت اچھا ہے۔ لیکن اس بارے میں چند امور توجہ طلب ہیں۔

(الف) قرض کی میعاد

(ب) معتبر قرض گیروں کا معیار اور طریق انتخاب شائع کرنا مناسب ہے۔

(ج) منظور شدہ تمسکات میں کچھ خرابیاں ہیں خصوصاً یہ کہ ان کی

قسمیں بہت محدود ہیں ۔

(۳۳) یہ روایت بے بنیاد معلوم ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ جب دفتر وزیر ہند میں فاضلات اس قدر بڑھ گئیں کہ معتبر قرض گیر اُن سب کو نہ لے سکے تو وزیر ہند کی کونسل کے لندن والے اراکین نے وہ زاید رقمیں رعایت کر کرکے ان چند بنکوں میں امانتہً جمع کر دیں جن سے ان کا خاص تعلق تھا لیکن ہماری رائے میں وزیر ہند لوگوں کو ایسی نکتہ چینی کا کوئی موقع ہی نہ دیں تو اچھا ہے ۔ گرچہ اس کی بنا حسد یا ناواقفیت ہی کیوں نہ ہو ۔ (دفعہ ۲۰۳)

(۳۴) ہمارے نزدیک وہ وقت آ گیا ہے جبکہ دفتر وزیر ہند اور انگلستان بنک کے باہمی تعلقات پر نظر ثانی ہونی مناسب اور ضروری ہے (دفعہ ۲۰۳)

(۳۵) وزیر ہند کے دلال کو معاوضہ دینے کا جو طریق ہے وہ قابل توجہ ہے ۔ ضرورت ہو تو اس کی نظر ثانی کی جائے (دفعہ ۲۰۴)

(۳۶) ہندوستان اور لندن کے مستقل عملوں نے جس خوبی کے ساتھ مال کے دشوار اور پیچیدہ فرائض انجام دیئے ہیں ۔ ہم اس کی تعریف کرتے ہیں ۔ (دفعہ ۷)

(۳۷) ہماری رائے میں کونسل کی مالی کمیٹی برقرار رہنی چاہیئے ۔ کیونکہ یہ اپنے کام کے واسطے بہت مفید اور موزوں ثابت ہو چکی ہے ۔ (دفعہ ۲۰۸)

(۳۸) جہاں تک ہو سکے مال کی کمیٹی میں تین ایسے رکن ہونے چاہیئیں ۔ جو مالی تجربہ رکھتے ہوں جو ہندوستان کے محکمۂ مال ۔ ہندوستان کے بنک اور تجارت اور لندن کے بازار کے نمایندے ہوں ۔ بہر حال کم سے کم ایک رکن ضرور ایسا ہونا چاہیئے ۔ جو ہندوستان کے مالیئے کا عملی تجربہ رکھتا ہو ۔ ۱۹۱۱ء سے جو کونسل میں کوئی ایسا رکن نہیں تو نتیجہ یہ ہے کہ لندن کے مالی ماہروں کا اثر بہت بڑھا ہوا نظر آتا ہے ۔ دفعہ (۲۱۰)

(۳۹) مجلس وزیر ہند میں جو تبدیلیاں کرنے کی تجویز ہے اور جس پر غور اور بحث

ہو رہی ہے۔ کونسل کی مالی کمیٹی برقرار رکھنے کی حالت میں اس تجویز میں کبھی کچھ ترمیم کرنی ضروری ہوگی۔ تاہم خود ہمارا بھی یہی مقصد ہے کہ کام میں آسانی پیدا ہو۔ اور اس کی رفتار بڑھے (دفعہ ۲۱۴)

(۴۰) حال کا یہ طریق کہ وزیر ہند کا مددگار نائب معتمد مالی تجربہ رکھنے کی بنا پر اس تمام مالی کام میں جو دفتر وزیر ہند سے متعلق ہے۔ معتمد مال کے ساتھ ذمہ داری میں شریک رہتا ہے۔ چند در چند لحاظ سے مفید ہے۔ چنانچہ آیندہ کے واسطے بھی ہماری رائے ہے کہ اسی طرح نائب معتمد یا مددگار نائب معتمد وہ شخص مقرر ہو جو مالی تجربہ رکھتا ہو یا دو مددگار نائب معتمد مقرر ہوں اور ان میں سے ایک مال میں تجربہ کار ہو (دفعہ ۲۱۶)

(۴۱) سرکاری یا مرکزی بنک قائم کرنے یا نہ کرنے کی بابت ہم کچھ رائے نہیں دے سکتے۔ لیکن ہمارے خیال میں اس معاملے پر جلد اچھی طرح غور ہونا چاہیے بہتر یہ ہوگا کہ ماہرین کی ایک مختصر سی کمیٹی بنا دی جائے جو ہندوستان میں اس معاملے کی تحقیقات کرے۔ اور یا تو اس تجویز کو مسترد کر دے یا اس کی تکمیل کے واسطے پوری اسکیم تیار کر کے پیش کرے تاکہ اسی کے مطابق بنک جاری کر دیا جائے۔ (دفعہ ۲۲۱ - ۲۲)

# بارہواں ضمیمہ

## بیبنگٹن اسمتھ کمیٹی سنہ ۱۹۲۰ء

ہندوستان کے زر اور مبادلات خارجہ کے متعلق تحقیقات اور نتائج کا خلاصہ۔

۸۷۔ ہم اراکین کمیٹی جن نتائج پر پہنچے ہیں ان کا خلاصہ ذیل میں درج کرتے ہیں۔

(۱) یہ بہت مناسب معلوم ہوتا ہے کہ روپیہ میں پھر ثبات قدر پیدا کی جائے اور ہندوستان کا نظام زر پھر خود بخود چلنے لگے (پارہ ۳۶)

(۲) روپیہ کے وزن یا اس کے کھرے پن میں تخفیف کرنا۔ (پارہ ۳۸) ۲ یا ۳ روپیہ کا نیا سکہ جاری کرنا جس میں موجودہ روپیہ کے مقابل چاندی کی نسبت ادنیٰ رکھی جائے (یعنے کھوٹ زیادہ شامل رہے) (پارہ ۳۹) نکل کا روپیہ جاری کرنا (پارہ ۴۰) یہ سب ایسی تجاویز ہیں کہ ان کی سفارش نہیں کی جاسکتی۔

اگر نکل کی اٹھنی کو صرف عہ تک محدود زر قانونی بنانے سے اس کے رواج میں رکاوٹ پیش آئے تو پھر اس کی حد ص یا عہ تک بڑھانے پر غور کرنا چاہیئے (پارہ ۴۰)

(۳) زر کاغذی یعنے نوٹوں کی نقد پذیری برقرار رکھنا لازم ہے اور ایسی تجاویز ناقابل لحاظ ہیں جو ہندوستانی زر کاغذی کو غیر نقد پذیری کے خطرے سے پورے طور پر محفوظ نہیں رکھ سکتی (پارہ ۴۱)

(۴) شرح مبادلہ بڑھنے سے جس حد تک قیمتوں کا اضافہ رکا رہا۔ اس حد تک بحیثیت مجموعی ملک کو ضرور فائدہ پہنچا۔ اور یہ مناسب ہوگا کہ اس فائدہ کو جاری رکھنے کی تدبیر کی جائے۔ (پارہ ۵۰)

(۵) شرح مبادلہ اعلیٰ مقرر کی جائے تو اس سے ہندوستان کی تجارت کو کوئی مستقل نقصان پہنچنے کا احتمال نہیں ہے۔

اگر خلاف توقع تمام دنیا میں قیمتیں بہت جلد گر جائیں اور اگر ہندوستان

میں مصارف پیدائش گھٹ کر قیمتوں کی تخفیف کا ساتھ نہ دے سکیں تب البتہ شرح قیمت کے مقابلہ پر از سر نو غور کرنا ضرور ہوگا (پارہ ۵۱)

(۶) شرح مبادلہ اعلےٰ ہونے سے ہندوستان کی صنعتوں کی ترقی میں کوئی بڑی رکاوٹ پیش نہ آئے گی۔ (پارہ ۵۲)

(۷) شرح مبادلہ اعلیٰ ہونے سے ضمنی طور پر مطالبات وطن کی ادائی میں ہندوستان کو جو فائدہ ہوگا اس کا بھی لحاظ کرنا چاہیئے (پارہ ۵۳)

(۸) شرح مبادلہ کے تعین میں تاخیر کرنے سے سخت اعتراض پیدا ہوگا اور سرکاری نگرانی میں توسیع کرنی پڑے گی (پارہ ۵۸)

(۹) زیادہ فائدہ قطعاً اسی میں ہے کہ روپیہ کی شرح مبادلہ طلا کے حوالے سے قرار دی جائے نہ کہ اسٹرلنگ پونڈ زر کاغذی کے حوالے سے (پارہ ۷۔۵۶)

(۱۰) معین شرح مبادلہ مر روپیہ اور طلا میں ۱۰ فی ساؤرن کے حساب سے مقرر ہونی چاہیئے۔ بالفاظ دیگر روپیہ ۱۱٫۳۰۰۱۶ گرین خالص طلا کا ہمقدر شمار ہونا چاہیئے مبادلات خارجہ میں بھی اور اجرائے داخلہ میں بھی۔

(۱۱) اگر قلیل عرصہ سے زیادہ کے واسطے چاندی کا نرخ ۲ شلنگ (طلا) فی روپیہ کی شرح سے بڑھ جائے تو نوٹوں کی نقد پذیری کو خطرہ میں ڈالنے کے بجائے کسی اور ترکیب اور تدبیر سے اس حالت کا مقابلہ کرنا چاہیئے مثلاً یہ کہ

(الف) کونسل بل کی فروخت میں تخفیف کردی جائے۔

(ب) چاندی کی خرید سے احتراز کیا جائے۔

(ج) زر فلزی کی طلب کو طلا سے پورا کیا جائے۔ اگر چاندی خریدنا ناگزیر ہی ہوجائے تو سرکار کو ایسے نرخ پر بھی چاندی خریدنے کے واسطے آمادہ رہنا چاہیئے کہ اس کا روپیہ بنانے میں الٹا نقصان ہو (۵۹)

(۱۲) کونسل بل فروخت کرنے کا اصلی مقصد تجارت کی سہولت نہیں ہے بلکہ مطالبات وطن کی ادائی مقصود ہے۔ تجارت کی ضروریات پورا کرنے

کے واسطے کونسل بل فروخت کرنے کا کوئی ذمہ تو لیا نہیں گیا ہے۔ لیکن اگر کسی وقت کے بغیر یا نفع کے ساتھ وزیر ہند اپنی فوری ضروریات سے زیادہ کونسل بل فروخت کر سکتا ہو اور تجارت کی طرف سے کونسل بل کی طلب بھی ہو تو ایسی صورت میں زاید کونسل بل فروخت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ البتہ شرط یہ ہے کہ مقامات ذخیروں کے جو اصول ہیں وہ ہمیشہ ملحوظ رہیں

جیسا کہ آج کل قاعدہ ہے۔ کونسل بل مقابلہ کی شرحوں پر علانیہ تخمینوں سے فروخت کرنے چاہئیں۔ البتہ وقتاً فوقتاً ایک قلیل ترین شرح مقرر کرتے رہنا چاہیئے جو کہ ہندوستان کو طلا بھیجنے کے مصارف نقل وحمل پر بحساب پونڈ اسٹرلنگ مبنی ہو۔ بالفعل اس شرح میں فرق ہوتا رہے گا۔ لیکن جب پونڈ اسٹرلنگ طلا کا ہمقدر بن جائے گا تو شرح بھی یکساں رہے گی۔ (پارہ ۶۱)

(۱۳) سرکار ہند اس امر کی مجاز ہونی چاہیئے کہ وزیر ہند کے سابق استمزاج بغیر ہر موقع پر جبکہ مبادلات خارجہ میں کمزوری آئے نو ربورس کونسل اور انتقالات برقی ہفتہ وار فروخت کرنے کی آمادگی کا اعلان کر دے اور جو شرح مقرر کرے وہ ہندوستان سے سلطنت متحدہ کو طلا بھیجنے کے مصارف نقل وحمل پر مبنی ہو (پارہ۔ ۶۲)

(۱۴) جنگ سے قبل ہندوستان نے اپنی تمام ضروریات کے واسطے جسقدر بھی طلا لیا وہ ہندوستان کی معاشرتی رسم ورواج اور معاشی حالت کے لحاظ سے کچھ ایسا بہت زیادہ تو نہ تھا لیکن دولت سے پیدا آور کام لینے کی زیادہ ترغیب دینی چاہیئے۔ (پارہ ۶۳-۶۴)

(۱۵) ہندوستان میں طلا کی درآمد و برآمد سرکاری نگرانی سے آزاد رہنی چاہیئے (پارہ۔ ۶۵)

(۱۶) سرکار کا یہی مسلک رہنا چاہیئے کہ لوگ جس قسم کا زر طلب کریں وہ مہیا کرے خواہ روپیہ۔ خواہ نوٹ۔ اور خواہ طلا۔ لیکن طلا کا بہترین مصرف سرکاری

ذخائر میں ممکن ہے کہ وہاں سے ترسیل خارجہ کے واسطے وقت ضرورت لے لیا جائے۔

اجرائے داخلی میں زر کا رواج بڑھانا ہندوستان کے حق میں کچھ زیادہ مفید نہ ہوگا۔ لیکن ممکن ہے کچھ عرصہ تک زر فلزی کی طلب کو روپیہ سے پورا کرنا دشوار ہو۔ ایسی صورت میں رواج طلا کی توسیع ضرور ہوگی۔ مبادا اس قسم کے غیر معمولی اجرا سے عوام کے اعتماد میں خلل پڑے۔ مناسب مقدار میں طلائی سکے معمولی طور پر طلب زر پورا کرنے کے واسطے جاری کرتے رہنا چاہیئے۔ (پارہ-۶۶)

(۱۷) شاہی دار الضرب کی بمبئی والی شاخ ساورن اور نصف ساورن کی تسکیک کے واسطے پھر کھول دینی چاہیئے اور عوام کو طلا صاف کرانے اور سکے ڈھلوانے میں وہاں سہولت ہونی چاہیئے (پارہ-۶۸)

(۱۸) ساورن کے بدلے روپیہ دینے کا سرکار نے جو ذمہ لے رکھا ہے اسکو ختم کردینا چاہیئے۔ (پارہ-۶۸)

(۱۹) عـہ فی ساورن کی جدید شرح جاری کرتے وقت لوگوں کو موقع ملنا چاہیئے کہ وہ چاہیں تو اپنے ساورن سرکاری خزانہ میں داخل کر کے عـہ کی شرح سے روپیہ لے لیں۔ طلائی مہر کے مبادلہ کا بھی اسی طرح موقع دینا چاہیئے۔ اس کے بعد مہر کو زر سے خارج کر دیا جائے (پارہ-۶۹)

(۲۰) جس قدر جلد بسہولت ممکن ہو درآمد نقرہ کی ممانعت اٹھا لینی چاہیئے۔ (پارہ-۷۰)

(۲۱) درآمد نقرہ کی ممانعت اٹھ جانے کے بعد محصول درآمد بھی اٹھا لینا چاہیئے۔ البتہ اگر مالی حالت اس کی متقاضی ہو تو اس کو قائم رکھنے میں مضائقہ نہیں۔ (پارہ-۷۱)

(۲۲) سردست زر نقرہ کو برآمد کی رو سے محفوظ رکھنے کے واسطے ضرور ہے۔ کہ برآمد نقرہ کی ممانعت برقرار رہے۔

اگر ہندوستانی کانوں کی چاندی خریدنا سرکار ترک کردے تو البتہ

لیسن کے ذریعے سے اس کی برآمد کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ (پارہ ۵-۲۷)

(۲۳) بنکوں سے کام لینے میں ترقی یافتہ سہولتیں مہیا کرنی چاہئیں اور اندرونی کے شغل کے زیادہ مواقع پیدا کرنے چاہئیں (پارہ ۵-۲۷)

(۲۴) ٹسکیک کے واسطے چاندی خریدنیکا جو طریق ہے اسمیں کسی ترمیم کی سفارش نہیں کی جاتی۔ (پارہ ۵-۴۷)

(۲۵) ذخیرہ زر کاغذی کا قلیل ترین فلزی حصہ ازروئے قانون اجرا کلی کا چالیس فیصدی مقرر ہونا چاہیئے۔

رہا ذخیرہ کا اعتباری حصہ اسمیں سرکار ہند کے تمسکات کی مقدار ۲۰ کرور روپے تک محدود ہونی چاہیئے۔ ذخیرے کا بقیہ حصہ سلطنت برطانیہ کی دوسری حکومتوں کے تمسکات پر مشتمل ہونا چاہیئے۔ اس مقدار میں دس کرور روپے سے زیادہ کے ایسے تمسکات نہ ہونے چاہئیں۔ جن کی مدت ادائی ایک سال سے زاید ہو۔ اور تمام تمسکات کی تاریخ ادائی معین ہونی ضرور ہے۔ ذخیرے کا مندرجۂ بالا تیس کرور روپے سے زاید مشغول حصہ قلیل المدت تمسکات میں رکھنا چاہیئے۔ جن کی مدت ادائی سال بھر سے زیادہ نہ ہو اور جو سلطنت برطانیہ میں کہیں جاری کیے گئے ہوں۔

ایک مدت معینہ تک ذخیرۂ اعتباری کا موجودہ بیشترین حصہ جس کی قانوناً اجازت حاصل ہوچکی ہے۔ یعنی ایک ارب بیس کرور روپے کی مقدار برقرار رکھنی مناسب ہے۔

پونڈ اسٹرلنگ کے اشتغال یعنی جو رقم برطانیہ میں پونڈ کے حساب سے تمسکات میں مشغول کی گئی ہے وہ اور ذخیرہ زر کاغذی میں جسقدر طلا ہے وہ کل رقم ۲ شلنگ فی روپے کی شرح سے حساب میں لانی چاہیئے اس جدید شرح سے حساب میں جس قدر کمی پڑے گی اس کی تلافی فوراً تو ہو نہیں سکتی۔ لیکن شرح مبادلہ بڑھنے سے جو کچھ بچت ہوگی اس سے چند سال میں یہ کمی ضرور پوری ہوسکتی ہے۔ (پارہ ۵-۷۸-۷۹)

(۲۶) مزید زر کی موسمی طلب پورا کرنے کی غرض سے یہ اہتمام کرنا چاہیئے کہ معمولی

اختیاری اجرا کے علاوہ پانچ کرور روپے تک مزید نوٹ برآمد کی ہنڈیوں کی ضمانت پر پریزیڈنسی بنکوں کو مستعار دیے جا سکیں۔ (پارہ ۸۰)

(۲۷) ذخیرہ زر کاغذی کا نقرہ وطلا ہندوستان ہی میں رہنا چاہیئے۔ البتہ نقل وحمل کی حالت میں وہ باہر ہو تو مضائقہ نہیں۔ (پارہ ۸۱)

(۲۸) جہاں تک حالات جلد اجازت دیں نوٹ نقد کرانے کی سہولت عام ہونی چاہیئے اور دوران جنگ میں جو بندشیں عائد کی گئیں ان کو اٹھا دیا جائے۔ سرکار کو یہ اختیار رہنا چاہیئے کہ نوٹ نقد کرنے میں خواہ طلائی زر قانونی دے خواہ نقرئی (پارہ ۸۲)

(۲۹) ذخیرہ معیار طلا کی سردست کوئی حد مقرر نہیں کی جاسکتی۔ کہ اسقدر جمع کرنا چاہیئے اور آئندہ بھی روپے کا تمام منافع تسکیک اسی ذخیرے میں داخل ہونا مناسب ہے۔

(۳۰) بحالت موجودہ سرکار کو چاہیئے کہ جس قدر سونا میسر ہو اس کو ذخیرۂ معیار طلا کے بجائے ذخیرہ زر کاغذی میں جمع رکھے۔ جب موقع ملے تو ذخیرہ معیار طلا میں بھی سونے کی کافی مقدار فراہم کرلی جائے۔ لیکن اس وقت سب سے زیادہ قابل اطمینان طریق یہ ہوگا کہ ذخیرہ معیار طلا میں قریب المدت تمسکات جمع کرکے اسکو حتی الوسع سیال بنا کر رکھا جائے۔ اس ذخیرے میں ایسے تمسکات کی مقدار نہ بڑھانی چاہیئے جن کی مدت ادائی تین سال سے زیادہ ہو اور مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ذخیرے کا تمام مشغول حصہ ایسے تمسکات پر مشتمل رہے جو کہ سرکار ہند کے سوا سلطنت برطانیہ میں کسی اور حکومت کی طرف سے جاری ہوئے ہوں اور جن کی تاریخ ادائی ۱۲ ماہ کے اندر اندر مقرر ہو (پارہ ۸۳)

(۳۱) ذخیرہ معیار طلا کے سونے کا ایک حصہ جو نصف سے زیادہ نہ ہو ہندوستان میں رکھنا چاہیئے اور پونڈ اسٹرلنگ کے اشغال لندن ہی میں رکھے جائیں جیسا کہ اب تک طریق رہا ہے۔

# معاشیات ہند

## ضمیمۂ اصطلاحات

### A

| | |
|---|---|
| Ad valorem duties | محصول بحساب قیمت |
| Afforestation | فن جنگلات |
| Allowance | بھتہ۔الاونس |
| Alluvial (soil) | دریائی زمین |
| Alpine Forests | پہاڑی جنگلات |
| Aniline (dyes) | اینیلین (رنگ) |
| Annuity | سالینہ |
| Arboriculture | فن درخت |
| Arno Schmidt, Mr. | مسٹر آرنو شمت |
| Assessed Taxes | محصول آمدنی |
| Assessment | تشخیص محصول یا لگان |

### B

| | |
|---|---|
| Baden-Powell, Mr | بیڈن پاول صاحب |
| Balances | فاضلات |
| Balance of trade | توازن تجارت |
| Bank Charter Act | قانون منشور بنک |
| Bank | بنک |
| Bastable, Mr. | بیسٹبل صاحب |
| Bill (of Exchange) | ہنڈی۔بل |
| Bimetallism | دو فلزی یا فلزینی طریق |
| Bounty | امداد |
| Buckingham canal | بکنگھم نہر |
| Budget | موازنہ۔بجٹ |
| Budget Estimates | تخمینی موازنہ۔تقدمہ |

### C

| | |
|---|---|
| Capital | اصل |
| Cash Balances | نقد فاضلات |
| Cash Reserve | نقد ذخیرۂ محفوظ |
| Charles Booth | چارلس بوتھ |
| Chartered Bank | منشوری بنک |
| Cheque | چک |
| Chiozza Money | شیوزا منی |
| Col. Baird Smith | کرنل بیرڈ اسمتھ |
| Commercial Intelligence Department | محکمۂ تجارتی معلومات |
| Cobalt (mineral) | کوبالٹ (دھات) |
| Comparative philology | علم مقابلۂ السنہ |
| Compulsory Insurance | لازمی بیمہ |
| Constitution | دستور |
| Co-operative credit | قرض امداد باہمی |

| | |
|---|---|
| Co-operative Society | انجمن امداد باہمی |
| Corporation | کارپوریشن شخصیہ |
| Council bill | کونسل بل |
| Countervailing duty | محصول متوازن |
| Credit Instrument | اعتباری دستاویزات |
| Currency | زر |
| Current account | حساب رواں |
| Customs | کروڑگیری |
| **D** | |
| Daniel Webster | ڈینیل وبسٹر |
| Dayabhaga | دیابھاگ |
| Deciduous Forest | برگ ریز جنگلات |
| Delhi & London Bank | دہلی لنڈن بنک |
| Deposit | زرامانت ۔ ڈپازٹ |
| Deutsche-Asiatische Bank | ڈیوش ایشیاٹش بنک |
| Direct Tax | محصول بلاواسطہ |
| Discount | بٹہ ۔ ڈسکاؤنٹ |
| District Board | مجلس ضلع |
| Disutility | اعدام افادہ |
| Dividend | مقسوم |
| Draft | رقع ۔ ڈرافٹ |
| Drainage | آبیاری |
| Dundee | ڈنڈی |
| Due | طلبانہ ۔ واجب الوصول |

| | |
|---|---|
| Dynamics | متحرکات |
| **E** | |
| Eastern Bank | ایسٹرن بنک |
| Effective chargee | کارپرداز مصارف |
| Equator | خط استوا |
| Evergreen Forests | سدابہار جنگلات |
| Exchange | مبادلہ |
| Exchange Bank | مبادلہ بنک |
| Exchequer | خزانہ |
| Excise | چنگی |
| Excise duties | محصول چنگی |
| Excise opium | افیون چنگی |
| Expenditure | مصارف ۔ مخارج |
| Exploring license (mining) | اجازت نامہ جستجو (معدنیات) |
| Export | برآمد |
| Export Duty | محصول برآمد |
| Ex-proprietary Tenants | ساقط الملکیت کاشتکار |
| **F** | |
| Famine Relief | امداد قحط |
| Famine Relief & Insurance | امداد قحط وبیمہ |
| Fiduciary | امانتی |
| Finance | مالیات ۔ مالیہ ۔ مال |

| | |
|---|---|
| Finance Minister | وزیر مال |
| Financial Statement | مالی کیفیت |
| Foreign Exchanges | مبادلات خارجہ |
| Foreign Trade | تجارت خارجہ |
| Free Trade | آزاد تجارت |
| Funded Debt | فنڈ کا قرضہ |
| Furlough | فرلو۔ رخصت |
| **G** | |
| Gait, Mr. | گیٹ صاحب |
| Geology | ارضیات |
| Gold-Exchange Standard | معیار مبادلہ طلائی |
| Gold Standard | معیار طلائی |
| Gold Reserve | محفوظ ذخیرہ طلائی |
| Gold Standard Reserve | ذخیرہ معیار طلائی |
| Gratuities | انعامات |
| Gross Revenue | محاصل یا مداخل خام تحصیل محض |
| Guarantee | گارنٹی۔ ضمانت |
| Guilds | جتھے |
| Gutta-percha | گٹا پرچا |
| **H** | |
| Havell, Mr, | مسٹر ہاول |
| Herschell committee | ہرشل کمیٹی |
| Home charges | مطالبات وطن (انگلستان) |
| Hong-kong & Shanghai Corporation | ہانگ کانگ شنگھائی کارپوریشن |
| **I** | |
| Imperial Gazetteer | امپریل گزیٹیر |
| Imperial Legislative Council | شاہی مجلس وضع قوانین |
| Imperial Preference | شاہی ترجیح |
| Import | درآمد |
| Import Duty | محصول درآمد |
| Incidence of Taxation | تادیہ محصول۔ ورود محصول |
| Income-Tax | محصول آمدنی |
| Index Number | نمایندہ عدد |
| Indian National Congress | انڈین نیشنل کانگریس |
| Indian Specie Bank | انڈین اسپیشی بنک |
| Indirect Tax | محصول بالواسطہ |
| Insurance | بیمہ |
| Insurance-grant | عطیہ بیمہ |
| Interest | سود |
| International Bimetallism | بین الاقوام فلزینی طریق |
| International Banking Corporation | انٹرنیشنل بنکنگ کارپوریشن |
| Intrinsic value | قدر ذاتی |

| | |
|---|---|
| Inundation Canal | سیلابی نہر |
| Investment of Capital | شغل اصل |
| Irrigation | آبپاشی |

**J**

| | |
|---|---|
| Jadestone | جیڈسٹون |
| Joint Family | خاندان مشترک |
| Joint Stock | سرمایہ مشترک |

**K**

| | |
|---|---|
| Keynes J. M. Mr | مسٹر جے۔ ایم کینس |

**L**

| | |
|---|---|
| Laissez faire | اصول غیر مداخلت |
| Lake Fife | لیک فائف |
| Lake Whiting | لیک وھائٹنگ |
| Land Alienation Act | قانون انتقال اراضی |
| Land Revenue | مالگزاری |
| Land Tenure | حقیت اراضی |
| Lees-Smith, Professor | پروفیسر لی۔ اسمتھ |
| Legal Tender | زر قانونی |
| Legal Value | قدر قانونی |
| License | اجازت نامہ لیسنس |
| Limited Liability | محدود ذمہ داری |
| Lindsay, Mr | مسٹر لنڈسے |
| List, Mr | مسٹر لسٹ |
| Local Board | مقامی مجلس |
| Local Self-Government | مقامی حکومت خود اختیاری |
| Lloyd George | لائڈ جارج |
| Lord Herschell | لارڈ ہرشل |
| Lord Mayo | لارڈ میو |
| Lord Ripon | لارڈ رپن |
| Lord Cornwallis | لارڈ کارنوالس |
| Lord Inchcape | لارڈ انچ کیپ |
| Lord Dalhousie | لارڈ ڈلہاوزی |
| Lord Crew | لارڈ کریو |

**M**

| | |
|---|---|
| Magnesia | مگنیشیا |
| Major Works | ذرائع آبپاشی کلاں۔ تعمیرات کلاں |
| Major Briggs | میجر برگس |
| Maintenance | داشت |
| Manganese(mineral) | منگنیز (معدن) |
| Marginal Disutility | اختتامی اعدام افادہ |
| Meleod, Mr | مسٹر میکلوڈ |
| Megasthenes | میگستھنیز |
| Mercantile Bank | مرکنٹائل بنک |
| Metallic value | قدر فلزی |
| Meteorology | جوّیات |
| Militia | میلشیا یا ردیف |
| Minor Works | ذرائع آبپاشی خرد۔ تعمیرات خرد |
| Mitakshara | متکشرا |

| | |
|---|---|
| Monazite (mineral) | مونیزائٹ (معدن) |
| Money Market | بازار زر |
| Monsoon | باد برشگال |
| Mulhall Mr. | مل ہل صاحب |
| Multiple tax-system | طریق محصول مرکب |
| Multiple tax | محصول مرکب |
| Municipality | بلدیہ |
| **N** | |
| National Bank | نیشنل بنک |
| Navigation Canals | سفری نہریں |
| Negotiable Securities | تمسکات قابل بیع وشریٰ |
| Negotiable Instruments Act | قانون دستاویزات قابل بیع وشریٰ |
| Net Revenue | محاصل یا مداخل خاص |
| Nominal Wages | اجرت متعارفہ |
| Non-occupancy Tenant | اسامی غیر دخیل کار |
| Non-tax-Revenue | غیر محصولی مداخل |
| **O** | |
| Octroi duties | محصول چنگی |
| Occupancy right | حق دخیل کاری |
| Occupancy Tenant. | دخیل کار اسامی موروثی کاشتکار |
| Old Age Pension | وظیفہ پیری |
| Ordinary Debt | معمولی قرضہ |
| **P** | |
| Paper curr.ney | کاغذ زر۔ زر کاغذ |
| Paper currency Reserve | محفوظ ذخیرہ زر کاغذ |
| Peasant Proprietor | ملکی کاشتکار۔ خود کاشت زمیندار |
| Permanent Debt | مستقل قرضہ |
| Permanent Settlement | دوامی بندوبست |
| Peoples Bank | پیپلس بنک |
| Perennial canal | دوامی نہر |
| Philip Francis, Mr. | مسٹر فلپ فرانسس |
| Phoenicia | فونیشیا |
| Phosphoric Acid | تیزاب گندک |
| Pisciculture | فن ماہی پروری |
| Pliny | پلنی |
| Plural Taxation | محصول مجموعی |
| Plural tax system | طریق محصول مجموعی |
| Port Trusts | محکمۂ بندر |
| Preference system | طریق ترجیح |
| Presidency Bank | پریزیڈنسی بنک |
| Productive works | پیداآور ذرائع آبپاشی |
| Profits | منافع |
| Progressive Taxation | محصول متزائد |
| Promissory Note | پرامیسری نوٹ |

| | |
|---|---|
| Proportional Taxation | محصول متناسب |
| Protection (of trade) | تامین (تجارت) |
| Protected Forest | محفوظ جنگلات |
| Protective Tariff | محصول تامین |
| Protective Works | تامینی ذرائع آبپاشی |
| Provincial Rates | ابواب ملکی |
| Provision Opium | افیون ذخیرہ |
| Ptolemy | بطلیموس |
| Public Debt | سرکاری قرضہ |
| Public Deposit | سرکاری امانت |
| Public Finance | مالیات |
| Public Works | تعمیرات |

## Q

| | |
|---|---|
| Quasi-Permanent Settlements | شل دوامی بندوبست |

## R

| | |
|---|---|
| Raiffeisen. Mr. | رئفزن صاحب |
| Real Wages | اجرت صحیحہ |
| Recurring Expenditure | مصارف رجعی |
| Relief work | امدادی کام |
| Remunerative Debt | منافع دار قرضہ |
| Rent | لگان |
| Reserve (Army) | کمک |
| Reserve Forest | محفوظ جنگلات |
| Reserve (Fund) | محفوظ ذخیرہ |
| Reserve Treasury | خزانہ محفوظ |
| Revenue | محاصل۔ مداخل |
| Revenue (Land) | مالگزاری |
| Revised Estimates | پختہ موازنہ |
| Riparian Forests | دریائی جنگلات |
| Royalty | رائیلٹی |
| Rowntree, Mr. | مسٹر راون ٹری |
| Russian Chinese Bank. | رشن چائنیز بنک |

## S

| | |
|---|---|
| Sanitation | صفائی |
| Sanitary Commissioner | ناظر صفائی |
| Saving Bank | سیونگ بنک |
| Schulze, Mr. | شولز صاحب |
| Secretary of State | وزیر ہند |
| Securities | تمسکات |
| Seligman. Prof | پروفیسر سلگمین |
| Sericulture | ریشم کے کیڑے پالنے کا فن۔ فن کرم پروری |
| Service Fund | سروس فنڈ |
| Settlement | بندوبست |
| Short Loan | قلیل المدت قرضہ |
| Single Tax | محصول مفرد |
| Sir Charles Metcalfe | سر چارلس مٹکاف |
| Sir Henry Fowler | سر ہنری فاولر |
| Sir Robert Giffen | سر رابرٹ گفن |
| Sir Patrick Playfair | سر پیٹرک پلے فیر |

| | |
|---|---|
| Sir George Wingate | سرجارج ونگیٹ |
| Sir Thomas Munro | سر ٹامس منرو |
| Sir Richard Strachey | سرچارڈ اسٹریچی |
| Sir John Shore | سرجان شور |
| Sir Cunningham | سر کنگھم |
| Sir William Wedderburn | سر ولیم ویڈربرن |
| Sir. Frederick Nicholson | سر فریڈرک نکلسن |
| Sir Daniel Hamilton | سر ڈینیل ہملٹن |
| Sir George Fleetwood Wilson | سر جارج فلیٹ ووڈ ولسن |
| Sir Felix Schuster | سر فیلکس شستر |
| Sir James Meston | سر جیمس مسٹن |
| Sir Frederick Lely | سر فریڈرک لیلی |
| Sir Arthur Cotton | سر آرتھر کاٹن |
| Sir Roper Lethbridge | سر روپر لیتھ برج |
| Specie points | مقامات زر۔ مراتب زر |
| Specific duties | محصول بحساب پیمانہ |
| Speculation | تخمین |
| State Bank | سرکاری بنک |
| Statics | سکونیات |
| Statistics | فن اعداد و شمار |
| Status | حیثیت |
| Sterling Bills | طلائی ہنڈیاں |

| | |
|---|---|
| Stock brokers | دلال |
| Storage Works | ذخائر آب |
| Strabo | اسٹریبو |
| Sub Proprietor | ذیلی زمیندار |
| Suez canal | نہر سویز |
| Superannuation Allowance | پیرانہ سالی کا بھتہ |
| **T** | |
| Tax | محصول |
| Tax-Revenue | محصول مداخل |
| Telegraphic Transfers | انتقالات برقی |
| Temporary Debt | میعادی قرضہ |
| Temporary Settlement | میعادی بندوبست |
| Tenant | اسامی۔ کاشتکار |
| Tenants-at-will | اسامی غیر دخیل کار |
| Tenancy Legislation | قانون لگان |
| Tenure | حقیت۔ (اراضی) |
| Tidal Forest | سیلابی جنگلات |
| Token Money | زر علامتی |
| Trade-winds | تجارتی ہوائیں |
| Trap soil | سنگریزہ زمین |
| Treasury balances | فاضلات خزانہ |
| **U** | |
| Under-ryots | شکمی رعیت |

| | |
|---|---|
| Unfunded Debt | بے فنڈ قرضہ |
| Unitary tax system | طریق محصول مفرد |
| Unlimited Liability | غیر محدود ذمہ داری |
| Unremunerative Debt | بے منافع قرضہ |

**V**

| | |
|---|---|
| Vasco da Gama | واسکوڈے گاما |
| Voelcker, Dr. | ڈاکٹر والکر |

**W**

| | |
|---|---|
| Wages | اجرت |
| Welby Commission | ویلبی کمیشن |
| William Digby | ولیم ڈگبی |

**Y**

| | |
|---|---|
| Yokohama Specie Bank | یاکوہاما اسپیشی بنک |

---

# غلط نامۂ معاشیات ہند

| صفحہ | سطر | غلط | صحیح | صفحہ | سطر | غلط | صحیح |
|---|---|---|---|---|---|---|---|
| تمہید صفحہ ۱ | ۹ و ۱۰ | حالات واقعات | حالات و واقعات | ۳۶ | ۲۳ | مضر | مفر |
| ؍؍ | ۱۰ | توجہہ | توجیہ | ۴۳ | ۵ | تھوٹا | تھوڑا |
| اصل کتاب ۲ | ۲۳ | معالات | معاملات | ۴۵ | ۱۶ | بیان | یہاں |
| ۶ | ۳ | ہین | ہیں | ۵۲ | ۱۳ | دوقفصلی | دوفصلی |
| ۱۰ | ۲۵ | نہین | تھیں | ۵۴ | ۱ | کناتے | کھاتے |
| ۱۲ | ؍؍ | ناتبا | تانبا | ۵۷ | ۲۲ | دلیسی | دیسی |
| ۱۳ | حاشیہ محاذی سطر ۱۸ | اختلاوات | اختلافات | ۵۸ | ۲۵ | دوز | روز |
| ۱۴ | ۲ | مسٹر | میسٹر | ۶۳ | ۲۰ | لو | کو |
| ۱۵ | ۲ | پٹیریا | میٹریا | ۶۴ | ۲۱ | ہے | ہیں |
| ۱۷ | ۴ | لدی پھنڈی | لدی پھندی | ۶۶ | ۶ | کسی | کس |
| ۲۱ | ۳ | آب وہوااور | آب وہوا اور | ۶۷ | ۱۵ | ہین | ہیں |
| ؍؍ | ۵ | بہاں | جہاں | ۶۹ | ۱۲ | سادھے | سادے |
| ۲۶ | ۸ | ہوگر | ہوکر | ؍؍ | ۲۰ | رستی | رہتی |
| ؍؍ | ۱۳ و ۱۴ | نقل وحمل | نقل وحمل | ۷۲ | ۳ | Iadestone | Jadestone |
| ۲۷ | ۹ | بیان | یہاں | ۷۴ | ۱۲ | جانتا۔تھا | جانتا تھا۔ |
| ۲۸ | ۱۵ | فقل وحرکت | نقل وحرکت | ۷۸ | ۴ | فلزاتی | فلزاتی |
| ؍؍ | ۲۰ | بیخبری | بے خبری | ۸۱ | ۲۲ | اینلیس | اینلین |
| ۳۱ | ۹ | بھگوت | بھگوت | ۸۲ | ۱۵ | چرڑجی | چٹرجی |
| | | | | ۸۴ | ؍؍ | دکھارہے | دکھا رہے ہیں |

| صفحہ | سطر | غلط | صحیح | صفحہ | سطر | غلط | صحیح |
|---|---|---|---|---|---|---|---|
| ٩٣ | ٢٣ | معاشرتی | معاشرتِی | ١١٦ | ٢١ | نہر سوئز | نہر سویز |
| ٩٥ | ٣ | سادعی | سادی | ١١٧ | حاشیہ محاذی سطر ٤ | حال | حال |
| ״ | ١١ | مَفادعَ | مفادعُ | ״ | ١٤ | آرٹھتیوں | آرٹھیتیوں |
| ٩٧ | حاشیہ محاذی سطر ١٧ | تعلیم صناع | تعلیم صنائع | ״ | ٢١ | وسطا | وسائط |
| ٩٨ | ١٣ | ترقی کے | ترقی کر کے | ١٢٤ | ١٥ | ناردے | ناروے |
| ١٠٣ | ١٦ | ہوبہی | ہوہی | ١٢٥ | ٢٠ | چھٹھے | چھٹے |
| ١٠٦ | ٢٤ | صنفوں | صنعتوں | ١٢٦ | ٢٣ | رمین | رہین |
| ١٠٨ | ٢٣ | پیشتر | بیشتر | ״ | ٧ | خام مصنوعاتی | خام و مصنوعاتی |
| ١٠٩ | ١٦ | ستمیر | ستمبر | ١٢٨ | ٦ | اعداد شمار | اعداد و شمار |
| ١١٠ | ١٢ | قرض یتا ہے | قرض دیتا ہے | ١٢٩ | ١٩ | آزسودہ کاری | ناآزمودہ کاری |
| ״ | ١٥ | زیادہ شاید | زیادہ ہے شاید | ١٣٢ | ٢٥ | خرار | قرار |
| ״ | ״ | کاشتگار | کاشتکار | ١٣٣ | ١٤ | روپیوں | روپیوں |
| ״ | ١٩ | ڈھونڈھتا | ڈھونڈھنا | ١٣٥ | ١٠ | ١٠١ پنس | ١٦ پنس |
| ١١٢ | ٨ | رہاخواری | رباخواری | ״ | ١٩ | زخیرہ | ذخیرہ |
| ״ | ١٢ | کھلاتے ہین | کہلاتے ہیں | ١٤٠ | ١ | روپیوں | روپیوں |
| ١١٣ | ١ | مناضوں | منافعوں | ״ | ٢٠ | لے | کے |
| ١١٤ | ٥ | مسٹر شیوز اسفی | مسٹر شیوز امنی | ١٤١ | ٢٣ | ہوئی | ہونی |

تمت